ہر گھر کی زینت

ماہنامہ

دوشیزہ

کراچی

سال نو مبارک

January
2018

ایوارڈ ونر

خولہ عرفان

باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

منی ناول

مکمل ناول

ناولٹ

ناولٹ

افسانے

دوشیزہ میگزین

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ)......890 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

ماہنامہ دوشیزہ کراچی
پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ، کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122
Email : pearlpublications@hotmail.com

چلو اس سال ......

صبح آنکھ دیر سے کھلی جلدی جلدی ناشتہ کیا اور تیار ہو کر آفس کے لیے نکل کھڑی ہوئی گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے کہا کہ باجی پیٹرول ڈلوانا ہوگا ظاہر ہے اس میں وقت لگتا میں نے اس سے کہا تم مجھے میٹرو کے اسٹیشن تک چھوڑ دو۔ پلیٹ فارم پر چند منٹ انتظار کرنے کے بعد میٹرو آ گئی میں اس میں سوار ہو کر آفس کی طرف روانہ ہوگئی۔ آفس پہنچنے میں 15 منٹ تھے اس دوران میں اطمینان سے آنکھیں موند کر دعائیں پڑھتی رہی کبھی کبھی آنکھ کھول کر کھڑکی سے باہر کا منظر بھی دیکھ لیتی جہاں سرسبز درخت' سیاہ تارکول کی سڑک اور دونوں اطراف بنے خوبصورت ہٹ نما گھر تا حد نگاہ سامنے تھے۔ 15 منٹ بعد میرا مطلوبہ اسٹیشن آ گیا اور میں اپنا بیگ سنبھالتی میٹرو سے اتر گئی۔ 5 منٹ واک کرنے کے بعد میں آفس میں تھی۔ کمرے میں جیسے ہی داخل ہوئی تو فون بج رہا تھا پتہ نہیں کون تھا جو صبح نو بجے مجھے یاد کر رہا تھا۔ فون بہت زیادہ اور بہت اونچی آواز سے بج رہا تھا اور پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی ڈور بیل بج رہی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ڈرائیور موجود تھا۔ 'باجی پیٹرول کی ہڑتال ہے اب آفس کیسے جائیں گے؟' اور میں یہ کہہ کر پلٹ گئی روز کے ڈرامے ہیں اس ملک کا کچھ نہیں ہو سکتا' واقعی میں خوابوں کی دنیا بہت حسین ہوتی ہے اور ہم تیسری دنیا کے لوگ تو ترستے ہیں صاف پانی کو' صاف ہوا کو' للچاتے ہیں پیٹ بھر غذا کے لیے' تڑپتے ہیں سستے اور اچھے علاج کے لیے ہم تیسری دنیا کے لوگ مچلتے ہیں اچھی تعلیم کے لیے' بچیوں کی صحیح وقت پر شادی کے لیے' ایک اچھی نوکری کے لیے' آرام دہ سواری کے لیے' اپنے آشیانے کے لیے' سستے انصاف کے لیے' ہم تیسری دنیا کے لوگ ترستے ہیں امن و امان کے لیے' ہم ترستے ہیں اچھے حکمرانوں کے لیے' ہم ترستے ہیں اپنے عقائد پر عمل کرنے کے لیے' پُر سکون نیند کے لیے' مطمئن دن کے لیے' سمندر کی جانب سے چلنے والی ہواؤں کے لیے' دریا کے بہتے پانیوں سے کھیلنے کے لیے...... ہم خالی آنکھیں اور خالی کاسہ لیے کب تک ترستے رہیں گے ہم تیسری دنیا کے لوگ ہیں جنہیں تیسری جنس کی طرح سب نے بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے کہیں وجہ اس سے تو دوری نہیں جو اس کائنات کا خالق اور مالک ہے۔

اس نئے سال' ہمیں خود احتسابی کے عمل سے گزرنا ہوگا' یہ وعدہ اپنے آپ سے کرتے ہیں چلو اس سال کچھ نیا کرتے ہیں۔

منزہ سہام

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔
وِہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو ہوتا ہے۔
قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش۔

بہت جلد......

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

"بس تھوڑا سا انتظار......"

ام ایمان (غزالہ عزیز)

غلام جو سردار بنے

حضرت یسار نوبیؓ، حضرت ابوفکیہہؓ

اس ماہ میں نے دو بلند مرتبت ہستیوں پر لکھنے کی کوشش کی امید ہے۔
آپ لوگوں کو میری یہ کاوش پسند آئے گی!

حضرت یسار نوبیؓ کی زندگی اور ان کے آباو اجداد یا خاندان کی تفصیلات کے بارے میں تاریخ خاموش ہے بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ رسول اللہ کے غلام (مولیٰ) تھے اور سوڈان کے رہنے والے تھے۔

رسول اللہؐ کے پاس آپ نے اسلام قبول کیا اور پکے اور سچے مسلمان اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے محبت کرنے والے تھے۔ عبادات الٰہی میں خاص شغف تھا۔

ایک دن نماز میں مشغول تھے رسول اللہؐ نے دیکھا کہ انتہائی سکون و اطمینان اور خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں۔ رسول اللہ کو ان کا نماز پڑھنے کا طریقہ بے حد پسند آیا اور آپؐ نے ان کو اسی وقت آزاد کر دیا۔

لیکن حضرت یسار نوبیؓ کو آپؐ سے بے حد محبت تھی آپ کو آزادی کے مقابلے میں حضورؐ کی غلامی حد درجہ محبوب تھی۔ لہذا عرض کی
''یارسول اللہؐ مجھے اپنی غلامی کے شرف سے محروم نہ رکھیں۔ میں اپنی ساری زندگی آپؐ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں۔''

ان کا جذبہ اخلاص دیکھ کر حضورؐ نے ان کو قبا سے منسلک ایک چراگاہ میں اپنے اونٹ چرانے کی خدمت تفویض کی کہ وہ آپ (صدقہ کے) کے اونٹ چرایا کریں۔ چنانچہ حضرت یسار نوبیؓ قبا سے متصل ایک چراگاہ (ناحیہ ذالحدر) چلے گئے اور اپنے آقاؐ کے فرمان کی تعمیل میں لگ گئے۔

۶ ہجری میں قبیلہ عُکل اور عُرینہ کے آٹھ افراد بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔ یہ لوگ بیمار تھے۔ رسول اللہؐ نے ان لوگوں سے کہا کہ تم لوگ ناحیہ ذالحدر چلے جاؤ وہاں ہمارے اونٹ اور اونٹنیاں ہیں۔ تم ان کا دودھ پیو انشاء اللہ صحت ٹھیک ہو جائے گی کیونکہ وہاں کی آب و ہوا بھی خوب صحت بخش ہے۔

وہ لوگ وہاں چلے گئے۔ حضرت یسار نوبیؓ نے اپنے آقاؐ کے مہمانوں کی دل و جان سے میزبانی کی چند ہی دنوں میں وہ لوگ صحت یاب ہو گئے۔

لیکن یہ لوگ ایسے احسان فراموش ثابت ہوئے کہ بجائے اللہ کا شکر ادا کرتے اور اپنے میزبانوں کے ممنون ہوتے انہوں نے دغا بازی کا ارادہ کیا اور ایک دن صبح ہی صبح پندرہ اونٹ ہانک کر ساتھ لے جانے لگے۔ حضرت یسار نوبیؓ نے ان کو ایسا کرتے دیکھا تو پیچھے دوڑے اور ایسی حرکت کرنے سے منع کیا۔ ان دغا بازوں اور مرتدوں نے حضرت یسار نوبیؓ کو بھی گرفتار کر لیا اور پھر بڑی بے رحمی سے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے اور آنکھوں اور زبان میں کانٹے چبھوئے۔ اس طرح حضرت یسار نوبیؓ کو شہید کر ڈالا۔

سرور عالم حضرت محمدؐ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپؐ سخت رنجیدہ ہوئے اور پھر اپنے صحابی حضرت کرزؓ بن جابر فہری کو بیس سوار دے کر ان دغا بازوں کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجا۔

حضرت کرز بن جابر فہریؓ روانہ ہوئے تو راہ میں ایک عورت ملی جو اونٹ کا شانہ اٹھائے جا رہی تھی حضرت کرزؓ نے دریافت کیا یہ تم کو کہاں سے ملا۔ اس نے کہا میں ادھر آ رہی تھی ایک جگہ چند آدمی ہیں جو اونٹ ذبح کرنے کے بعد اس کا گوشت بنا رہے ہیں ان لوگوں نے یہ شانہ مجھے دے دیا ہے۔ حضرت کرزؓ نے تیزی سے اس طرف کا رخ کیا اور ان لوگوں کو گرفتار کرنے کے بعد بقیہ چودہ اونٹوں کے ساتھ مدینہ کا رخ کیا۔ اس وقت رسول اللہؐ غانہ یعنی (جنگل و چراہ گاہ) میں موجود تھے۔ جب ان ایمان دشمنوں اور دغا بازوں کو رسول اللہؐ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؐ نے حکم دیا کہ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جیسا انہوں نے یسارؓ کے ساتھ کیا ہے۔

چنانچہ ان سب کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گئے اور آنکھوں میں سلائیاں پھیری گئیں اور پھر ان کو حرہ میں ڈال دیا گیا اور وہ سب جہنم رسید ہوئے۔

بعض مفسرین کے نزدیک قرآن کریم کی یہ آیت انہی کے بارے میں نازل ہوئی:۔

''یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں (مراد رہزنی اور ڈاکہ زنی) ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیے جائیں یا زمین پر سے نکال دیے جائیں۔'' (المائدہ ۳۳)

☆☆☆

حضرت ابو فکیہہ یسار رازدیؓ ابتدا میں قریش کے خاندان بنی دار کے غلام تھے۔ بعد میں جب رسول اللہؐ نے قبیلہ قریش کے ساتھ ساتھ سارے عرب کو دین حق کی دعوت دی تو اس زمانے میں حضرت ابو فکیہہ یسار رازدیؓ بنو جمح کے غلام بن چکے تھے۔ امیہ بن خلف جمحی اپنے غلاموں پر ظلم و ستم کرنے میں بہت بڑھا ہوا تھا۔

حضرت ابو فکیہہ یسار رازدیؓ غلام ہونے کے باوجود دل کے فقیہہ تھے چنانچہ آپ کے کانوں میں جب دین حق کی پکار پہنچی تو آپ فوراً آگے بڑھے اور حق کی مختصر جماعت میں شامل ہو گئے۔

امیہ بن خلف ان کی اس جرات پر آگ بگولہ ہو گیا اور ان کو اپنے مظالم کا نشانہ بنانے لگا۔ اس نے اپنے خاندان کو بھی کھلی چھوٹ دی ہوئی تھی کہ جس طرح چاہیں حضرت ابو فکیہہ یسار رازدیؓ پر مظالم ڈھائیں۔

یہ ظالم ان مظلوموں پر نت نئی سزاؤں کو آزماتے۔ دوپہر کے وقت سخت دھوپ میں حضرت ابو فکیہہ یسار رازدیؓ و منہ کے بل لٹا کر اوپر بھاری پتھر رکھ دیے یہاں تک کہ سخت گرمی اور اذیت سے وہ بے ہوش ہو جاتے لیکن اس قدر سختی اور مظالم ان کے منہ سے شرک کا کوئی کلمہ نہ نکلوا سکے۔

ایک دن شقی القلب امیہ بن خلف نے حضرت ابو فکیہہ یسار رازدیؓ کو رسی سے باندھا اور پھر گھسیٹتا ہوا باہر لا کر تپتی ریت پر ڈال دیا۔ امیہ کا بیٹا صفوان بھی باپ کے پیچھے پیچھے پہنچا اور حضرت فکیہہؓ سے پوچھا۔ کیا میرا باپ تیرا رب نہیں ہے؟

حق کے شیدائی ابو فکیہہؓ نے فوراً جواب دیا'' ہرگز نہیں میرا رب اللہ تعالیٰ ہے جو سب کا خالق و مالک ہے اور جو سب کو روزی دیتا ہے۔''

صفوان یہ جواب سن کر طیش میں آ گیا اور حضرت ابو فکیہہؓ کا گلا زور سے دبایا کہ ان کی زبان باہر نکل گئی اور وہ بے حس و حرکت ہو گئے۔ صفوان اور امیہ دونوں باپ بیٹا سمجھے کہ یہ ختم ہو گئے ہیں اسی وقت حضرت ابو بکرؓ وہاں سے گزرے، انہوں نے یہ دردناک منظر دیکھا تو دل بھر آیا۔ اسی وقت ابو فکیہہ کو امیہ بن خلف سے خرید کر آزاد کر دیا۔

لیکن آزاد ہونے کے باوجود بے کس و بے بس حضرت ابو فکیہہؓ مشرکین عرب کے مظالم سے محفوظ نہ تھے چنانچہ جب ہجرت حبشہ کی اجازت ملی تو ۶ ہجری میں حبش چلے گئے۔

حد درجہ مظالم سہنے کے باعث قویٰ کمزور اور ضعیف ہو گئے تھے صحت جواب دے گئی تھی چنانچہ جنگ بدر سے کچھ پہلے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

حضرت ابو فکیہہ یسار رازدیؓ ان اولوالعزم اور ثابت قدم مسلمانوں میں شامل تھے جنہوں نے حالات کی سختی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور توحید کے مقابلے میں کفر کا انکار سخت ترین نا مساعد حالات میں بھی کرتے رہے اور یوں ان کا شمار سابقون الاولونؓ کی جماعت میں ہوتا ہے۔

نعت

مصطفیٰ جمال

بس جائے جو آنکھوں میں تصویر محمدؐ کی
ہر سمت نظر آئے تنویر محمدؐ کی

ہو جاتی آنکھوں میں اگر خواب مدینے کا
سُن گوشِ سماعت سے تعبیر محمدؐ کی

ظلمت کو نہ مل پائے چھپنے کے لیے گوشہ
ہو نیام سے باہر جو شمشیر محمدؐ کی

تھا زیرِ قدم اُنؐ کے اورنگِ شہنشاہی
پر بوریا ہوتا تھا جاگیر محمدؐ کی

گو دینِ محمدؐ پر ہر سمت سے یورش ہے
پر کم نہ ہوئی اس سے توقیر محمدؐ کی

مِل جائے گی آزادی دنیا کی غلامی سے
پاؤں میں جو پڑ جائے زنجیر محمدؐ کی

تقصیر کا سایہ تک اٹھ جائے گا دنیا سے
نافذ اگر ہو جائے تعزیر محمدؐ کی

جو آخری خطبہ تھا رحمت کی پہاڑی پر
بے شبہ مثالی تھی تقریر محمدؐ کی

☆☆☆

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت

رابطوں کی دلفریب محفل

مدیرہ علی

ان تمام لوگوں کو میرا محبت اور خلوص بھرا سلام جو اپنی بے انتہا مصروف زندگی میں سے چند لمحے کشید کر کے اس خوبصورت محفل کا حصہ بنتے ہیں جو میں بہت محبت اور مان سے سجاتی ہوں۔ اس بار سردی نے کراچی کا بھی رخ کیا اور ذرا جلدی کیا مزہ بہت آیا مگر گلے نے خوب احتجاج کیا اور اب تک یہ احتجاج جاری ہے بالکل ان دھرنوں کی طرح جو ایک بار لگ جائیں تو جان لے کر ہی ہٹتے ہیں۔ خیر یہ وقت بھی گزر جائے گا۔

میں ان تمام پڑھنے والوں کی تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے دوشیزہ پر اپنی قیمتی رائے کا اظہار کیا ظاہر ہے اس میں مصنفین بھی شامل ہیں...... بہت محنت سے دوشیزہ کا سالنامہ تیار کیا ہے حقیقتاً رات اور دن ایک کیے تب کہیں جا کر یہ نازک اندام دوشیزہ جلوہ افروز ہوئیں' سالنامہ نمبر 2 بھی آپ کی رائے کا منتظر ہے' اس بار لاہور کے مصنفین سے ملاقات طے ہے۔ انشاء اللہ 2018ء کا سورج لاہور والوں کے ساتھ طلوع ہوتا دیکھوں گی اللہ ہمارے وطن کو اپنی اماں میں رکھے اسی دعا کے ساتھ بڑھتے ہیں اپنے پہلے خط کی جانب سنبل کراچی سے لکھتی ہیں' بہت پیاری منزہ' السلام علیکم! الحمد للہ ہماری طرف سب خیریت ہے اور آپ سب کی خیریت بمع اہل خانہ واسٹاف رب کریم سے نیک مطلوب ہے۔ سردیوں کا احساس دلاتا سرورق اچھا رہا اور سالنامہ واقعی سالنامہ رہا فہرست میں تمام رائٹرز باکمال تھے۔ سب سے پہلے خوشخبری اور ہماری بے خبری کہ ہم ایسی خوشخبریوں سے اکثر ناواقف ہی رہتے ہیں بہت اچھا لگتا ہے جب پاکستان کے جھنڈے تلے پاکستانی اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑتے ہیں۔ صلوۃ وسلام معلوماتی اور ایمان افروز تھا۔ خیال صاحب کی نعت بہت خوبصورت تھی فرح کو ایوارڈ کی بہت مبارکباد' تم نے بہت محنت کی دوشیزہ کو سنوارنے میں اور وہ نظر آتی ہے۔ رضوانہ کوثر کی بہو کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور رضوانہ کوثر اور دیگر لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ خولہ کا خط حسب معمول دلچسپ تھا۔ فریدہ کی محبتوں کا بہت شکریہ باقی کچھ نئے لوگ بھی محفل میں موجود تھے۔ سب کو خوش آمدید' فرزانہ آغا لکھیں اور وہ عام سا ہو ہو ہی نہیں سکتا لاجواب' جیسی لاجواب وہ شخصیت

بس ویسا ہی کمال انٹرویو' باکس میں اچھی شاعری لگ رہی ہے اور اس بار خاصے کی چیز دوشیزہ کا سفر رہا کیونکہ دوشیزہ تو منزہ کا ہے' سخن زاروں کی شاعری روز بروز نکھر رہی ہے۔ دوشیزہ گلستان نے اس بار لبوں پر مسکراہٹ بکھیر بکھیر دی۔ مشردم سوپ اور مالپوڑہ ضرور ٹرائی کروں گی۔ میرے ایڈ جس غلطی کی نشاندہی میں نے کی تھی وہ فریدہ مسرور نے مجھے بتائی تھی انہوں نے کہا ایڈیٹنگ کی بری عادت پڑی ہوئی ہے۔ میں نے کہا بری عادت نہیں ہے میرے لیے تو اچھی رہی کہ جو غلطی میں نہ پکڑ سکی آپ نے پکڑ لی' کن فیکون اس بار کا ہوا سا محسوس ہوا۔ علی ارسلان کا افسانہ زبردست تھا مرد کی فطرت اور اُس کی نفسیات پر ایک بھرپور افسانہ تھا۔ ملکہ کے لیے آپ سب کی آراء کی منتظر ہوں۔ سیما نے فارگرانٹیڈ میں ایک اچھا سبق دیا کہ بندوں کے فارگرانٹڈ لینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا' ہمارا اللہ ہے ناں ہمارا خیال رکھنے کے لیے آسیہ نے اپنے ناول میں اچھا سبق دیا کہ رسم ورواج انسانوں سے زیادہ اہم نہیں ہیں۔ خولہ کیا زبردست افسانہ لکھا ہے۔ یہ مسائل کا انبار اٹھا کر وسائل کی تنگ ودو میں ملک سے باہر جا کر بیوی بچوں کو دوسروں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر بھول جانے والے ناعاقبت اندیشوں پر خوب لکھا آپ نے...... فرحی کا ناولٹ پڑھ کر جہاں ہنسی آ رہی تھی وہیں غزل پر غصہ بھی بہت آیا۔ نسرین اب ناول کا اختتام کر دیں ہر بار ایک آدھ بندے کے مرنے کے علاوہ کہانی وہیں کھڑی ہوتی ہے۔ نزہت جبیں کا افسانہ اچھا تھا کہتے ہیں' پیسہ عورت کے نصیب اور اولاد مرد کے نصیب سے ہوتی ہے مگر ہمارے ہاں تو ہر بل عورت کے نام ہی پھاڑا جاتا ہے۔ امکان اچھا چل رہا ہے۔ طیبہ عنصر نے 16 دسمبر کے حوالے سے ایک اچھا افسانہ لکھا' عذاب تنہائی گوارہ تھی گھائل پنچھی میں مصنفہ کا انداز اچھا تھا' لکھنے کا باقی ناولٹ بھی ٹھیک ہی تھا۔ ریما نے محبت من محرم سمجھانے کی کوشش کی جو ایک اچھی کوشش ہے۔ اس بار ویسے ایوارڈ کے لیے کانٹے کا مقابلہ ہے۔ علی ارسلان' سیما مناف' خولہ عرفان اور میں...... ویسے مذاق سے ہٹ کر اس بار سب نے اچھا لکھا اور کیوں نہ لکھتے' آخر سالنامہ تھا اور سناؤ اب طبیعت کیسی ہے ہماری تو جان کو آ گئی ہے کھانسی جا ہی نہیں رہی۔ موسم سرد ہے مجھے اس موسم میں سستی سی رہتی ہے کام مکمل کرتے ہی بستر سنبھالتی ہوں اب اجازت دو اپنا بہت خیال رکھنا اور دعاؤں میں یاد رکھنا' فی امان اللہ۔
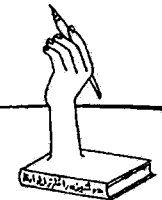
ج: سنبل تبصرہ ہمیشہ کی طرح بھرپور اور جاندار...... یقیناً مصنفین کے لیے بھی تمہاری رائے بہت کارآمد ہوتی ہے۔ طبیعت کچھ بہتر ہے گلہ بہت ٹھیک نہیں ہوا اکثر کافی گڑبڑ کر جاتا ہے' دیکھو کب تک یہ سلسلہ چلے۔

✉: رضوانہ پرنس کراچی سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ دوشیزہ ہمارے ہاتھوں میں ہے جو آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سرورق سے لے کر کچن کارنر تک سب لاجواب' افسانے جاندار اور شاندار علی ارسلان کافی طویل مدت بعد آئے مگر بہت اچھی تحریر لائے۔ دوشیزہ اپنے پرانے معیار کی طرف لوٹتا ہوا محسوس ہو رہا ہے جب اس میں چھپنے پر لکھاری معتبر ہو جایا کرتے تھے اور یقیناً یہ آپ کی محنت کی وجہ سے ہے۔ اس بار خاصے کی چیز دوشیزہ کا سفر تھا پڑھ کر بہت مزہ آیا منزہ پلیز اس کو جاری رکھیے گا ایک ایک تفصیل تحریر کیجیے گا' لوگوں کی یادداشت کافی کمزور ہوتی ہے وہ بہت جلدی بھول جاتے ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم بھی اس ٹیم کا حصہ

رہے ہیں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا جلد ملنے کی کوشش کریں گے۔

✍: رضوانہ آپ تو اس ٹیم کا حصہ رہی ہیں لہذا آپ کے کاندھوں پر بار بھی زیادہ تھا سالنامے کا حصہ بننا چاہیے تھا بلکہ تمام سابق مدیران کو اپنا حصہ ضرور ڈالنا چاہیے تھا مجھے بھی اچھا لگتا اور آپ سب کی محبت کا بھی یہ ایک اچھا انداز ہوتا بہرحال دوشیزہ پسند کرنے کا شکریہ امید کرتی ہوں کہ جلد ملاقات بھی ہوگی۔

✉: زمر نعیم لاہور سے لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ سہام! اللہ تعالیٰ سے آپ کی اور ادارے کے تمام اراکین و وابستگین کی خیر و عافیت کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سبھی پر زندگی کی ہر ساعت میں اپنی پناہ اور رحمتیں نصیب فرمائے۔ ثم آمین۔ منزہ ڈیئر! آج دوپہر آپ کا ایس ایم ایس پڑھا' کچھ شرمندگی بھی ہوئی کہ آپ کو قسط کے لیے تقاضہ کرنا پڑا۔ گزشتہ ماہ بائیس تیس دن طبیعت خراب رہی۔ جیسے ہی بہتر ہوئی تو قسط لکھنے بیٹھ گئی۔ اب قسط مکمل ہے۔ انشاء اللہ صبح ہی ارسال کردوں گی۔ آپ کا ایک اور بھی پیغام موصول ہوا۔ کیا؟ واقعی آپ یکم جنوری کو شرف ملاقات بخشنے والی ہیں؟ بے یقینی بھی ہے اور یقین بھی' دوہری کیفیت ہے کیا کروں' خوشی تو بہرحال ہے۔ آپ نے اور کس کس کو مدعو کیا ہے؟ بھئی اُسی حساب سے تیاری تو کرنی پڑے گی۔ ورنہ کئی ماہ سے یہ عالم ہے کہ جیسے بیٹھی ہوتی ہوں۔ اُسی طرح جانے کو دل چاہتا ہے۔ اب ایسا تو نہیں ہوسکتا۔ آخر دوشیزاؤں کی محفل ہوگی تو خود کو دوشیزہ کی طرح جانے پر تیار تو کیا جاسکتا ہے۔ کیا؟ تفصیلات کے لیے (پروگرام ٹائمنگ) میں آپ کو کال کرلوں' آپ کس ٹائم پر آفس میں ہوں گی' پلیز ایک عدد ایس ایم ایس کردیجیے گا۔ یہاں سردی بہت پڑ رہی ہے۔ اس حوالے سے آپ اپ ڈیٹ تو ہوں گی۔ انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔

✍: اچھی زمر! بالکل پہلی جنوری کو میری لاہور کے لکھاریوں سے ملاقات طے ہے ایک اچھی سی چائے پر مل بیٹھیں گے ہم سب' میں نے صرف ان رائٹرز کو دعوت دی ہے جو دوشیزہ سے مستقل جڑے رہتے ہیں۔ اُن کا حق تو بنتا ہے ناں اس بار کوشش ہے کہ دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب لاہور میں کروں ماہ اپریل میں بس اس سلسلے میں بھی آمد ہو رہی ہے۔ میں آپ کی منتظر رہوں گی۔ اپنا بہت خیال رکھیے۔

✉: عائشہ نور عاشا' گجرات سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! امید کرتی ہوں آپ ٹھیک ہوں گی اچھی سی کیوٹ سی اور سب سے خلوص سے بات کرنے والی مگر شاید آپ کو میں اچھی نہیں لگتی ہوں کیونکہ آپ نہ تو میرا تبصرہ شائع کرتی ہیں اور نہ ہی میرے خط کا جواب دیتی ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے آپ تک میرا خط پہنچا ہی نہ ہو مگر کیا کروں؟ جب دوشیزہ میں اپنا خط نہیں پاتی تو دل دکھی ہوجاتا ہے اور پھر آپ سے گلہ کیے بنا رہ نہیں پاتی۔ اب تو بات بات پر آنکھیں بھر آتی ہیں کیونکہ فروری میں میری شادی ہے جس کی وجہ سے مصروف بھی ہوں اور دوشیزہ آہستہ آہستہ پڑھتی ہوں مگر ہر ہر کہانی میں کچھ سیکھنے کو ضرور ہوتا ہے بہت ہی اعلیٰ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ سوری اگر میری کوئی بات بری لگی ہو تو...... منزہ جی ایک نیا سلسلہ شروع کرنے کا کہا تھا آپ نے مگر ابھی تک کچھ بھی نہیں ملا' آپ نے کہا تھا کہ اس سلسلے میں لکھاری بہنیں بھی شرکت کرسکتی ہیں یہ بات خوش آئند ہے کیونکہ اس سے ہمیں مختلف لوگوں کے بارے میں جاننے کو ملے گا اور پھر عام لوگوں کی خاص

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

دسمبر 2017 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

''شہرِ بلا'' خولہ عرفان

آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ جنوری 2018

عنوان: ____________

قلم کار: ____________

نام: ____________

پتا: ____________

دوشیزہ

زندگی اور مقاصد کو جانا جائے تو زندگی میں کچھ کرنے کی زیادہ تقویت ملتی ہے ورنہ شوبز کے لوگوں اور ان کی زندگیوں کو تو ہم ہمیشہ سے پڑھتے اور دیکھتے آرہے ہیں۔ سچ پوچھیے تو شوبز کی دنیا سے میں دور بھاگتی ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ لکھنے اور پڑھنے والی بہنیں بھی ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ جاننے میں دلچسپی رکھتی ہوں گی اس لیے میں یہ مشورہ دینا چاہوں گی کہ ایک سلسلہ شروع کیا جائے جس میں قاری اور لکھاری ایک دوسرے سے اپنی خوشیاں اور غم شیئر کریں۔ لکھاری اور قاری سب کے تعارف شائع کیے جائیں' میرا تو دل کررہا ہے بس لکھتی ہی جاؤں مگر مجھے یقین ہے آپ کو میری بات' مشورہ اچھا لگا ہوگا اور منزہ جی میں نے ایک کہانی بھیجی تھی وہ آپ کو ملی کہ...... نہیں نہ ملنے کی خبر مت دیجیے گا میں برداشت نہیں کرپاؤں گی بہت محنت سے لیٹ کی تھی کہانی کا نام 'تم تک کے فاصلے' ہے پلیز مجھے اس کے بارے میں کسی بھی طریقے سے بتادیں اور اگر ہوسکے تو پرچے میں تھوڑی سی جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں میں اجازت چاہتی ہوں لیجیے نگین افضل وڑائچ سے نصف ملاقات کرلیجیے۔ السلام علیک منزہ سہام جی آفنزا ے لانگ ٹائم' دسمبر آچکا ہے اور اسٹوڈنٹس کی مصروفیت بڑھ چکی ہے۔ لیکن پھر بھی عائشہ کو خط لکھتے دیکھ کر میں نہ رہ سکی اور جلدی سے کاغذ اور پین جھپٹ لیا۔ ویسے تو ہر ماہ آپ کے اور ہمارے دوشیزہ کے ذریعے دلی رابطہ ہوہی جاتا ہے مگر یہ سوچ کر کہ زمینی فاصلوں کے باوجود آپ ہمارا خط براہ راست پڑھ کر جواب بھی دیں گی تو یقین کریں دل معطر ہوجاتا ہے۔ دوشیزہ ہمیشہ کی طرح اپنے جوبن پر ہے۔ تمام سلسلے بلکہ اس کا ہر ہر وقت ایک نئی تازگی اور خوشبو لیے ہوئے ہے۔ چونکہ میں اس کے تفصیلی مطالعہ سے قاصر ہوں اس لیے سرسری سی نگاہ ہی ڈال کر دل کو بہلالیا۔ ہاں شاعری ساری کی ساری پڑھ ڈالی۔ تمام لکھاریوں نے اچھے طریقے سے اپنے قلم اور فن کا حق ادا کیا۔ اوہاں یاد آیا منزہ جی میں نے دو عدد افسانے 'چاچو' اور 'مرداز' کے عنوان سے ارسال کیے تھے مگر اب تک شائع نہیں ہوئے پلیز ان کے بارے میں بھی بتایئے گا۔ ہر ماہ میری سہیلیاں (گلشن' عائشہ) ان کے بارے میں مجھ سے دریافت کرتی ہیں اور میں تسلی دے دیتی ہوں اس یقین کے ساتھ کہ اگلے ماہ ضرور شائع ہوگا۔ یہ خط جو میں ابھی لکھ رہی ہوں انگلش کی کتاب کے عین اندر چھپا کر لکھ رہی ہوں خدا کرے اس خط کی برکت سے میں پاس ہوجاؤں آمین ہاہاہا' اب اجازت چاہوں گی اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب پر اپنی رحمت کا سایہ فگن رکھے آمین۔

✉: پیاری سی لڑکی! تم نے یہ کیوں سوچا کہ تم مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ مجھے تو وہ لوگ بھی اچھے لگتے ہیں جو کسی کو اچھے نہیں لگتے تم تو پھر پیاری سی گڑیا ہو۔ شادی کی بہت بہت مبارک باد' اب رونا دھونا چھوڑ دو اور خوش رہو تاکہ دلہن بن کر بہت حسین لگو۔ تمہارے اور نگین کے افسانے قابل اشاعت ہیں جلد لگاؤں گی اور نگین رسالے میں خط لکھنے سے تم انگریزی کے پرچے میں کیسے پاس ہوگی' ذرا یہ Trick مجھے بھی بتاؤ۔

✉: فرحت صدیقی' فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ سہام مرزا' السلام علیکم! سدا خوش رہو' مسکراتی رہو' دو دن پہلے دسمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ بے حد شکریہ' یقین کریں کہ پورا نومبر اخبار والے کی جان کھالی کہ شمارہ کیوں نہیں آیا؟ نومبر کا شمارہ نہ ملنا تھا نہ ملا' فیصل آباد پہنچ نہیں سکا' ہاں تو بات ہورہی تھی دسمبر کے شمارے کی بے حد خوبصورت سرورق' مسکراتی آنکھوں والی دوشیزہ' سردی کو انجوائے کرتے ہوئے آسمانی آسمانی کلر

میں آسمان سے اتری ہوئی دوشیزہ' واہ کیا کہنے' اشتہاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ خوشخبری' نے دل خوش کردیا' اقبال کا شعر یاد آگیا

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے

شاباش منزہ' ایسی خوشخبری ضرور دیا کرو' اُم ایمان کی تحریر نے ایمان تازہ کردیا' بہت لاجواب تحریر ہے۔ ایسی خوبصورت تحریر لکھتی رہا کرو' دوشیزہ کی محفل' میں کیا عرض کریں نومبر کا شمارہ پڑھا نہیں' تبصرہ پڑھ پڑھ کر کچھ اندازہ ہوگیا ہے۔ دوشیزہ بے شک سو سال کی ہوجائے اس کا رنگ و روپ اس طرح کا ہی رہے گا۔ دسمبر 1984ء میں میری پہلی کہانی دوشیزہ کا حصہ بنی تھی۔ میری بہت ساری یادوں میں دسمبر ہے۔ دسمبر کے دکھ لکھا تھا۔ کچھ دل کو اچھا نہیں لگا' لگتا تھا ادھورا ادھورا ہے۔ اُس لیے نہیں بھیج رہی' مجھے یاد ہے منزہ بچوں کے رسالے میں عائشہ نور کا انٹرویو اور سرورق پر اس کی تصویر چھپی تھی آپ بھی عائشہ نور کی تقریباً ہم عمر ہو اس کی تاریخ پیدائش 24 اکتوبر 1974ء ہے۔ جتنی عزت آپ کے ابو نے ہم لکھنے والوں کو دی اور کسی رسالے نے نہیں دی۔ سب ستاروں کو جمع کرنا اور خود چاند کی طرح چمکنا میں کیسے بھول سکتی ہوں؟ رضوانہ کوثر کے دکھ میں شریک ہوں۔ اصل بیٹی تو بہو ہی ہوتی ہے جو ساتھ نبھاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند کریں اور رضوانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین ثم آمین۔ قسط وار کہانیاں ابھی نہیں پڑھی۔ 'کیکر کی چھاؤں' زبردست' دل کو چھولیا' ملکہ سنبل کی کہانی کا انجام پسند آیا۔ محبتیں اعزاز ہوتی ہیں۔ انہیں اعزاز کی مانند ہی وصول کرنا چاہیے۔ کمال کا لکھتی ہیں۔ سنبل بھی فار گرانٹڈ مختصر مگر پُراثر کہانی' چھوٹی سی بات چھوٹی سی نہیں تھی۔ بہنوں کے درمیان فاصلہ پیدا کرگئی تھی۔ باقی سب افسانے اچھے تھے۔ شکستہ دل بھی اچھا تھا۔ ان کہانیوں کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے۔ فرزانہ آغا سے ملاقات بہت اچھی رہی بہت مزہ آیا۔ وہ واقعی ہی شہزادی ہے اور اُس کے شہزادے اللہ نظر بد سے بچائے آمین ثم آمین۔ دوشیزہ کا سفر' کئی یادیں جگمگا اٹھیں۔ شمیم نوید صاحب رعنا فاروقی' سیماں' سیما غزل' ناصر رضا صاحب اور سہام مرزا صاحب کی محبت لٹاتی آنکھیں' رخسانہ سہام مرزا کی محبت' سب کچھ یاد ہے' اور یاد رہے گا۔ مجھے یاد ہے ناظم آباد سے دو دو بسیں بدل کر میں جب دوشیزہ کے دفتر اپنی کہانی دینے جاتی تھی تو بہت سارے چہرے اپنے اپنے لگتے۔ باتیں کرکے بہت اچھا لگتا اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے اپنا خیال رکھنا بہت ساری دعائیں دوشیزہ گلستان بہت پسند ہے کچن کار زاب بہو کا پسندیدہ ہے اب اجازت۔

✉: اچھی سی فرحت آنٹی! محفل میں خط لکھنے کا بہت شکریہ' اب لوگ جب اپنا وقت دوشیزہ کو دیتے ہیں تب ثابت ہوتا ہے کہ دوشیزہ اور میں آپ کے دل کے قریب ہیں کیونکہ سب سے قیمتی شے وقت ہی ہے۔ دوشیزہ آپ سب کو پابندی سے بھیجا جاتا ہے اب درمیان سے کون اچک لیتا ہے ناقابل فہم ہے میں آئندہ بھی آپ کے خط کی منتظر رہوں گی۔

✉: عقیلہ حق کراچی سے لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ اور تمام دوشیزاؤں السلام علیکم! کافی دنوں تک انتظار کیا شاید مجھ دوشیزہ کو دوشیزہ مل جائے لیکن افسوس...... بک اسٹال پر بھی دستیاب نہیں آئینہ دیکھا تو خیال آیا بی بی تم دوشیزہ ہو جو دوشیزہ کا انتظار کررہی ہو' تمام حقائق کو پسِ پشت ڈال کر بہت ڈھٹائی سے کہا میں دوشیزہ

✉: طیبہ عنصر مغل' پنڈی سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! دوشیزاؤ! ہاں بھئی صرف منزہ جی ہی نہیں دوشیزہ پیارے کی ساری دوشیزاؤں کی خدمت میں سلام عرض ہے پیاری منزہ میں تو ہر ماہ ہی اس پیاری سی محفل میں شرکت کو بے حد بے قرار ہوتی ہوں لیکن کیا ہے کہ ڈائجسٹ بہت دیر سے ملتا ہے لیکن الحمدللہ مل جاتا ہے دوشیزہ کی سالگرہ مبارک اور ساتھ میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ میں بھی 1973ء کی پیداوار ہوں یعنی اسی سال سولہ اکتوبر کو دنیا میں وارد ہوئی تھی چوری تو پکڑی گئی بھئی ہم نے اپنی عمر کا راز خود ہی فاش کر ڈالا، اُف ف ف..... اب سنبل کی بات کروں گی میری بہت ہی پیاری دوست ہے یہ اور دوشیزہ میں لانے کا سہرا بھی ان کے سر اب یہی کام میں بھی انجام دے رہی ہوں دوشیزہ میں مزید دوشیزاؤں کو لانے کا جیسے ریما نور رضوان، میمونہ ہاشمی اور بہت ساری نئی مصنفین کا قافلہ چل پڑا ہے دوشیزہ کی طرف، تو بات میں کر رہی تھی سنبل کی تو سنبل کا خط اس کی تماریر کی طرح ہی اپنی مثال آپ ہوتا ہے اس بار تو خولہ اور ریما نور رضوان نے بھی بہت پر لطف خطوط لکھے ماشاءاللہ، پچھلی بار کا سارا شمارہ ہی لاجواب تھا لیکن میں سنبل والے اعتراض سے مکمل متفق ہوں تفصیل میں نہیں جاؤں گی سنبل کی بات کو ہی سیکنڈ کر دوں گی، اب چلتی ہوں اداریے پہ دعا دا بولنے کہ ان پاکستانی ہیروز کو خراج تحسین پہنچانا تو ہم پہ فرض ٹھہرا، کہ جن طلبہ نے پاکستان کا نام دنیا بھر میں سربلند کر دیا بلاشبہ منزہ پیاری آپ نے ایک اہم بات کی طرف متوجہ کیا لیکن ایک بات نے مایوس کیا مجھے تو آپ کی پچھلی تحریر پڑھ کر لگا تھا کہ اب ہر ماہ ایسی شاندار تحریر منزہ لکھیں گی لیکن ایسا نہیں ہے تو پیاری حسینہ اپنی کرسی کو کسی وقت چھوڑ کر اسٹڈی ٹیبل پہ چلی جایا کرو اور ایک پیاری سی تحریر لکھ ہی دیا کرو، پہلے تو کیکر کی چھاؤں میں جا بیٹھی انداز تحریر لاجواب لیکن بی بی الماس کو کس کس کر جوتے لگانے کا دل چاہا یعنی کہ حد ہے میاں کو اتنی کھلی چھوٹ، ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا ویسے اور ہٹ دھرم شوہر تو پاگل خانے کے قابل تھا یوں کیکر کی چھاؤں میں ٹھنڈ لگ رہی ہے دوستو! اب سنبل کے گھر کی ملکہ سے ملنے جا رہی ہوں با ادب باملاحظہ، یا اللہ اس ملکہ عالیہ ماہم سے تو ہمیں ابتداء میں ہی نفرت ہو گئی ویل ڈن سنبل پیاری اور شکریہ کہ اچھے والی لڑکی کا نام ماہ نور رکھنے پہ کہ میری شہزادی کا نام بھی ماہ نور ہے اور وہ ایسی ہی پیاری عادتوں والی ہے اب ہم کیا کہیں ان کے لیے جن کا قلم وہ لکھتا ہے جس کے ایک حرف کے لکھنے کو ہم عمر بتا دیں تو بھی نہ لکھ پائیں سیما مناف جی! دوشیزہ کو بہت مبارکباد کہ ایسی شخصیت نے ان کے لیے لکھا ان کی تعریف کے لیے میرے الفاظ بہت کمتر ہیں وہ تو سراپا تعریف ہیں، بہت شاندار تحریر ایک بہترین سبق دے گئی شکریہ پیاری سیما جی اب سیما جی کا دیا گیا سبق پلو سے باندھ کر ڈرتے ڈرتے شہر بلا میں داخل ہو کر خولہ کو تلاشا، لیکن خولہ تمہاری تحریر تو پتھر ہٹا گئی کیا خوبی سے بھایا تم نے ایک ایسی تحریر کو جس میں بہت سے معاشرتی ماحول کی نشاندہی کر دی اب میرے آنسو ہیں کہ رکتے نہیں ویل ڈن پیاری' ماشاءاللہ فرحی نعیم تو اپنی چھوٹی سی بات میں اتنی بڑی بات کہہ گئی ہیں کہ یہ تحریر مدتوں یاد رہے گی میں نے تو ایوارڈ ان کے لیے دے دیا بہت ہی منفرد موضوع لیکن بہت ہی ربط اور برجستگی کے ساتھ ایک گھریلو مسئلہ کی منظر کشی معصنفہ کو مبارکباد' پیاری نزہت جبیں نے تو بنجر زمین پہ گویا لفظوں کی موسلا دھار بارشوں سے پھول کھلا دیے نزہت جی سلامت رہیں، میری تحریر کو شامل اشاعت کرنے پہ سپاس گزار ہوں حسین دوشیزہ، اب اس کا کیا کیا جائے مجسم زہرا رضوی اگر اپنی تحریر سے ہم جیسے معصوم پنچھیوں کو گھائل کر جائیں تو محترمہ معصنفہ لکھتی رہیں بہت ہی شاندار تحریر، جہاں افسانہ آفتاب کی کاوش اچھی لگی وہاں ریما نور رضوان کے دھنک رنگ ناول نے دل ہی لوٹ لیا پیاری ریما سلامت رہو بہت بہترین معاشرت کو مذہب سے جوڑنے والی نوآموز معصنفہ کی معلومات کو سلام گڑیا، جیتی رہو، سلسلہ وار ناول سارے ہی جاندار ہیں کردار سے اقتباسات اور جملے کیا کہنے ماشاءاللہ سب مصنفین کو سلام کیسے کڑی سے کڑی ملا رہی ہیں سلام ہے سب کو، دوشیزہ کے سفر کی روداد اور تصاویر دیکھ کر بہت اچھا لگا منزہ بہت ساری دعائیں ہیں ام ایمان کے لیے بھی، صلوۃ وسلام، لکھنے پہ، شاعری بھی بہت اچھی لگی بہت جلد میں بھی اپنی شاعری دیکھنا چاہوں گی دوشیزہ کے اندر، اور ہاں پیاری حسینہ منزہ جی! یہ ایوارڈ کی تقریب تو کراچی میں ہو گی ہم تو منہ دیکھتے ہی رہ جائیں گے اف ف ف...... ظالما، سانوں وی بلا لے، بیچ میں سالنامہ اس قابل لگا کہ سالنامہ لگے، منزہ ستر ہ سالہ محنت پہ آپ کو بہت مبارکباد کہ آپ کی کاوش کامیاب رہیں ہیں ڈھیروں دعائیں ساری ٹیم کے لیے اور دوشیزہ کی کامیابی کے لیے، آمین مجھے فخر ہے میں ایک معیاری پرچے کا ایک معمولی ہی سہی حصہ ہوں، اب اجازت چاہوں گی سب قارئین کے لیے بھی بہت ساری دعائیں۔

ھ: ڈیئر طیبہ! اللہ آپ کو خوش رکھے۔ مفصل تبصرہ اچھا لگا۔ دل تو میرا بھی بہت چاہتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں مگر یقین مانو سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی مدیر ہونا بہت بھاری ذمہ داری ہے اس پر سونے پر سہاگہ کہ دفتر کے دیگر معاملات مجھے تو لگتا ہے کہ میں سوتے میں بھی دفتر میں ہی گھومتی رہتی ہوں۔ بہرحال آپ کا افسانہ میرے پاس موجود ہے جلد شائع کروں گی۔

✉: فریدہ فری' لاہور سے لکھتی ہیں۔ سوئٹ اینڈ کیوٹ منزہ جانی! السلام علیکم! دوشیزہ بڑے ناز ونخرے کے ساتھ اٹھارہ تاریخ کو ملا ہاں جی کیوں نہ دیر سے آئے خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ ٹائٹل بس سو سو لگا۔ رضوانہ کوثر کی بہو عظمیٰ کی وفات کا پڑھ کر بے حد افسوس ہوا اللہ تعالیٰ اُن کو جنت الفردوس عطا کرے اور رضوانہ کوثر کو صبر دے آمین۔ اچھا جی سخن زار میں ہماری شاعری غائب تھی بڑا محسوس ہوا ہماری شاعری ضرور لگایئے' شکریہ' فرزانہ آغا کے انٹرویو نے مزہ دے دیا۔ خولہ عرفان' طیبہ عنصر اور نزہت جبیں تو میری فیورٹ رائٹر ہیں ان کے افسانے پڑھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ کس کمال کا لکھتی ہیں اس مرتبہ تو افسانہ آفتاب نے بھی کمال کا افسانہ لکھا۔ شکستہ دل ریما رضوان جی واہ زبردست تحریر' طیبہ عنصر جی آرمی پبلک اسکول کے بارے میں کیا خوب لکھا ہے مزا آ گیا پڑھ کر آپ کا تو نام ہی کافی ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ' ایسا افسانہ لکھنا یعنی ایسی تحریر آپ ہی کا کام ہے مبارکباد قبول ہو۔ افسانہ جی یہ مرد زیادہ تر غصہ ہی میں کیوں ہوتے ہیں جیسے یہ سکندر صاحب تھے فاریہ پر ترس آ رہا ہے۔ ملکہ سنبل جی کیا زبردست ناولٹ لے کر آئی ہیں۔ مبارکباد قبول کریں۔ بنجر زمین نزہت جی اب کیا تعریف کروں آپ کی آپ تو ملکہ عالیہ ہیں افسانوں کی نزہت جی کیسے لکھ لیتی ہو اتنے اچھے افسانے ہم پر بھی پھونک مار دو۔ شہر بلا خولہ جی آپ کا افسانہ بے حد منفرد تھا بہترین تحریر تمام افسانے پڑھ کر سرور آ گیا خوش رہو خولہ جی' سنبل جی سلام کا جواب تو دے دیا کرو بھئی ہم تو بے حد محسوس کرتے ہیں۔ منزہ جی خط میں تو آپ کے متعلق لکھتی ہوں تعریف میں شعر کہتی ہوں مگر آپ کے حسن کی تعریف میں آپ کاٹ دیتی ہیں۔ ایک غزل میں نے نشیلی انکھیں لکھ کر فریم کروا کر اپنے سرہانے رکھ لی ہے اب تو آپ کچھ نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ میں ہوں حسن پرست تعریف کیے بنا تو میں رہ نہیں سکتی۔ پلیز اب کاٹ نہ دینا۔ چلو جی اب سب کو سلام دعا رخسانہ جی کو بے حد سلام ودعا۔

ھ: یہ کیا فریدہ جی اتنی محنت سے ٹائٹل تیار کروایا اور آپ کو سو سو لگا دل توڑ دیا آپ نے......اور

دیکھیے میں نے کوئی لائن نہیں کاٹی اس بار......

✉: خولہ عرفان' کراچی سے لکھتی ہیں۔ محترم وعزیز منزہ سہام مرزا' السلام علیکم! امید دعاؤں کے ساتھ پھر حاضرِ خدمت ہوں۔ اس ماہ کا دوشیزہ بھی اپنی بہار دکھا چکا ہے۔ تقریباً افسانے اور ناولٹ آنکھوں کی زینت بن کر ذہن کو آسودگی بخش چکے ہیں قسط وار ناول میں کن فیکون' تنہائی کا زہر اور آسیہ چوہدری کا چلو عشق......رہ گیا ہے۔ وہ تو ابھی جاری ہیں تو اطمینان سے پڑھ لوں گی زمر کا ابھی امکان...... میں کہانی بڑھ بھی رہی ہے اور دلچسپ بھی ہوتی جارہی ہے فائق اور عامر کے کردار بی بی جان کے گھر کو متاثر کرکے کیا اثرات مرتب کرتے ہیں وہ تھوڑا تھوڑا اندازہ ہورہا ہے۔ طیبہ عنصر کا دسمبر جب...... مختلف موضوع کے لحاظ سے بہت اچھی تحریر تھی کہ واقعی سب دن اللہ کے بنائے ہوئے ہیں اور خوشی اور غم بھی اللہ کی طرف سے مقرر ہیں پھر ہم اللہ کی رضا میں صبر کرنے کی بجائے دن اور زمانوں کو برا بھلا کہنا شروع کردیتے ہیں جو کہ حقیقتاً گناہ ہے۔ کیونکہ اللہ نے قرآن میں کئی مقامات پر زمانے کی قسم کھائی۔ سورۃ العصر اس میں صف اول پر دیکھ سکتے ہیں۔ تبسم زہرا کا گھائل پنچھی بھی بہت اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ اندازِ تحریر ذرا ہٹ کے تھا مگر پڑھنے میں مزہ آیا۔ ریما نور کا شکستہ دل بھی نوعمر لڑکیوں کے لیے پُراثر تحریر ہے۔ مگر اندازِ تحریر تھوڑا اُلجھا ہوا لگا۔ فرحی نعیم کا چھوٹی سی...... واقعی بہت جاندار تحریر تھی حقیقتاً وہ کہیں سے بھی چھوٹی سی بات نہیں تھی دنیا ایسے خودغرض لوگوں اور رشتے داروں سے بھری پڑی ہے لیکن ایسے لوگوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ سیما مناف کا فار گرانٹڈ بہت شاندار تحریر تھی۔ بندہ بڑا ناشکرا ہے وہ اپنی تکلیفیں تو محسوس کرتا ہے لیکن ان راحتوں کا شمار کرنا بھولے رہتا ہے جو اللہ کی طرف سے اسے عطا کی جاتیں ہیں۔ سیما کا مزاج جتنا صاف اور سچا ہے ان کی تحریر اس کی عکاس ہے بہت اچھا سیما' سید علی ارسلان کا کیکر کی چھاؤں ایک اچھی اصلاحی تحریر تھی یہ حقیقت ہے کہ عورت کی چپ بڑے بڑے بتوں کو گرا سکتی ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں ایسا کم ہی دیکھنے میں آتا ہے کیونکہ یہاں عورت ہی عورت کی سب سے بڑی دشمن نظر آتی ہے کیونکہ فطرتاً شاید جلنے کڑھنے کا مادہ اس میں زیادہ ہوتا ہے اور سنبل کی ملکہ اگرچہ موضوع خود پرستی پر کافی تحریر پڑھنے کو ملتی ہیں لیکن سنبل کا طرزِ تحریر الفاظ و تراکیب کی آمیزش بہت عمدہ ہوتی ہے۔ ہر جملہ اگلے جملے کو پڑھنے پر آمادہ کرتا ہے۔ پروفیشنلزم نظر آتا ہے۔ اور جہاں تک خطوط غالب سے موازنہ تو سنبل میں کہاں خطوطِ غالب کہاں' لیکن آپ کی محبتوں کا شکریہ یہ آپ کا حسن نظر اور حسن ذوق ہے۔ منزہ اس شمارے کی خوبصورتی دوشیزہ کا وہ سفرنامہ ہے جس کا آغاز آپ کے قلم سے ہوا۔ یقین جانیں جس خوبصورتی سے آپ نے اس میں ماضی کی یادوں کو زنجیر کیا ہے۔ اس کی ہر ہر کڑی میں آپ کے والد (محترم سہام مرزا صاحب) کی ادبی جہد' محنت ومحبت نہ صرف مضبوطی سے جڑی ہوئی نظر آرہی ہے۔ بلکہ ان کی صاحبزادی اور بیگم (رخسانہ اور منزہ) سہام صاحب کی کاوشوں اور شبانہ روز محنت نے اسے گزرتے وقت کے ساتھ مزید چار چاند لگادیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اب آپ کو جس ذمہ داری کے لیے منتخب کیا ہے دعا ہے کہ آپ کو ہر قدم پر اپنی منزلیں ملیں آمین۔ آپ کے اداریے نے بھی ہماری آنکھیں کھول دیں کہ واقعی اپنے ملک کے نادر ونایاب ہیروں کا تو ہمیں پتا ہی نہیں چلتا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے لوگوں اور حکمرانوں میں قدر دانی کی صلاحیت پیدا فرمائے آمین۔ ویسے منزہ یہ تبصرہ میں نے کچھ زیادہ ہی ثابت قدمی کے ساتھ بغیر کسی اضافہ جملے کے نہیں لکھ دیا؟ پچھلے خط کو لکھتے وقت کام کی زیادتی کا شکار تھی لیکن الحمدللہ...... اب اس کی عادت ہوگئی ہے ہاہاہاہا...... بدمزاج لوگوں کے لیے خوش مزاجی چھوڑی نہیں جاسکتی ہے۔ اس لیے فارمولہ تبدیل کرلیا ہے اور فکرناٹ آپ جیسے اچھے لوگوں کا ساتھ خوشیوں کا سفر ہے اور پلیز منزہ یہ فکرناٹ انگریزی زبان کے ساتھ ایک انتقامی کارروائی ہے۔ جو اکثر مجھ سے سرزرد ہوجاتی ہے۔ مطلب فکر کی کوئی بات نہیں۔ سخن زار اور دوشیزہ گلستاں سب کا بخوشی ورغبت مطالعہ ہوچکا ہے۔ اور (ہدیہ عقیدت) غزالہ عزیز جو کام کررہی ہیں اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ کالم میں جو غزلیں ہیں وہ بھی زبردست ہیں۔ دعا کریں کہ ایک دو دن میں یہ خط راہی رسالہ دوشیزہ ہوجائے کہ دو تین دفعہ تبصرہ لفافے کے اندر سے ہی مجھے صلواتیں سناتا رہا کہ جب دیر سے پوسٹ کرنا تھا تو لفافے کی قید وبند کی صعوبتیں کیوں برداشت کرائیں تھوڑے دن اور کھلی ہوا میں سانس لینے دیتی ناحق ہاتھ پاؤں باندھ کر لفافے میں ٹھونسے رکھتی ہیں لیکن بس کوشش یہی ہوتی ہے کہ پہلی فرصت میں تبصرہ لکھ کر روانہ کردیا جائے۔ آپ انتظار کریں یہ برداشت نہیں ہوتا کیونکہ مجھے دنیا کا سب سے تکلیف دہ کام انتظار کرنا لگتا ہے۔ آپ کی محبتوں اور دعاؤں کی طالب اور دوشیزہ ادارے وارکین دوشیزہ کے لیے لمحہ بہ لمحہ قدم بہ قدم ترقی وصحت کے لیے دعاگو۔

ٹ: پیاری خولہ! فکرناٹ تمہارا ناول بھی تمہاری ہر تحریر کی طرح جاندار ہوگا۔ شمارہ پسند کرنے کا شکریہ ویسے اب تو ٹریٹ بنتی ہے وزصاحبہ......

✉: آسیہ مظہر' آزاد کشمیر سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! پیاری منزہ آپی اور دوشیزہ کی تمام بہنوں کو میری طرف سے خلوص بھرا اسلام قبول ہو۔ امید ہے آپ سب خیر خیریت سے ہوں گے۔ خط لکھنے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ مجھے آپ سب بہنوں کا شکریہ ادا کرنا تھا کہ جس طرح آپ نے میرے ناول کو سراہا پسند کیا۔ آپ سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ ایک لکھاری کے لیے قارئین کی تعریف یا تنقید بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے کیونکہ اس بنیاد کو دیکھ کر وہ ادب کی نگری میں مقام بنانے کا اہل ہوتا ہے۔ بیرون ملک میں رہنے والے قارئین کا بھی بے حد شکریہ جن کی آراء مجھے ای میل کے ذریعے ملتی رہی۔ منزہ آپی آپ کی طبیعت کا سن کر پریشان ہوں پچھلے دنوں آپ کا گلا خراب تھا اپنا بہت سارا خیال رکھا کریں کیونکہ دوشیزہ کا الھڑپن آپ کے دم سے ہی قائم ودائم ہے۔ اللہ پاک آپ کو صحت وتندرسی دے آمین۔ اللہ پاک ہم سب پر اپنا فضل قائم رکھے اور میرے پیارے آزاد کشمیر اور پاکستان کو دشمنوں کے شر سے بچا کر ہمیشہ ہنستا بستا رکھے آمین۔ مجھے دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھیے گا۔

ٹ: سوئٹ آسیہ! امید کرتی ہوں کہ اب تک تمہیں دوشیزہ مل گیا ہوگا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب طبیعت بہت بہتر ہے تمہاری محبت کا شکریہ یہ ایک اچھے لکھاری کی پہچان ہے کہ وہ تعریف کے ساتھ تنقید بھی برداشت کرتا ہے تمہاری تحریر میرے پاس موجود ہے ابھی پڑھی نہیں جلد بتاؤں گی۔

اور اس آخری خط کے ساتھ اب اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے دوشیزہ کے حصول میں اگر کوئی بھی دشواری ہے تو مجھے ضرور آگاہ کیجیے' خوش رہیے خوش رکھیے۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

انٹرویو

اقبال بانو سے ملاقات

''شیشہ گر'' کی خالق ہماری اور آپ کی پیاری اقبال بانو
جن کا شمار دوشیزہ کے اوّلین ساتھیوں میں ہوتا ہے...

''پیاری منزہ......آپ نے تو کئی ماہ پہلے مجھے سوالنامہ بھیج دیا تھا مگر میری نا اہلی کہ شفٹنگ کے دوران سوالنامہ کہیں آگے پیچھے ہو گیا (حالانکہ میں نے بہت سنبھال کر رکھا تھا) خیر پھر یہ میرے بیگ سے ہی برآمد ہوا (جہاں کئی بار دیکھ چکی تھی)۔

سچ بتاؤں کہ دوشیزہ کو انٹرویو دینا میرا بہت پرانا خواب سمجھ لیں۔ جن دنوں رائٹرز، ایوارڈز کی تقریب میں شرکت کے لیے دوسرے شہروں سے آتی تھیں اور عظمت عزمی ان کے انٹرویو کرتیں (عظمت کو مرحومہ لکھنے کو دل نہیں چاہتا) تو دل ہمک ہمک کے کہتا ''عظمت سے کہو میرا انٹرویو بھی کرے۔'' مگر دوستی اپنی جگہ تھی اور پھر ان دنوں میں نے اتنا لکھا بھی نہ تھا کہ اتنے بڑے پرچے کے لیے انٹرویو دیتی؟ بس طفلانہ خواہش کہہ لیں۔ فرسٹ ایئر میں تھی تو پہلا ناول ''شیشہ گر'' سہام مرزا صاحب اور رعنا فاروقی کے کہنے پر لکھا۔

ہاں بات ہو رہی تھی انٹرویو کی۔ عظمت عزمی نے آسیہ سلیم قریشی کا انٹرویو کیا۔ بشریٰ رحمن کے تیکھے جوابوں کو سہا۔ شوکت رانا الطاف سے معصومانہ انٹرویو کیا مگر عظمت نے میرا انٹرویو نہ کیا۔ البتہ اس نے مجھے کہا ضرور (خود ہی) شاید میری آنکھوں میں میری خواہش جان گئی تھی۔ تم ''شیشہ گر'' مکمل کر لو تو میں نے تمہیں کٹہرے میں کھڑا کرنا ہے مگر آہ......عظمت جامعہ کراچی میں لیکچرار ہو گئی۔ عظمت کی شادی ہوئی تو میں بھی انوائٹ تھی اور شادی میں کیوں نہ جاتی؟

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی سے دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ لیتے ہوئے

سہام مرزا صاحب' رخسانہ سہام اور رضا بھی اس کی شادی میں شریک تھے اور واپسی پر سہام مرزا صاحب اور رخسانہ سہام نے مجھے میرے گھر ڈراپ کیا تھا۔ عظمت شادی کے بعد مصروف ہو گئی اور پھر دنیا سے چلی گئی۔

آج میں آپ کا سوالنامہ سامنے رکھے بیٹھی ہوں تو نجانے کون کون سے کونوں کھدروں سے یادیں امڈی آ رہی ہیں...... کس کس یاد کا سرا

پکڑوں اور لکھوں!
اور جب منزہ نے مجھے کہا کہ آپ کا انٹرویو کرنا ہے۔ میں نے کھٹ whatsapp پر جواب دیا تھا...... نٹافٹ سوالنامہ بھیج دیں۔ یہ تو میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ مجھے ویسی ہی خوشی ہوئی جیسے کسی بچے کو اپنے رزلٹ پر انعام ملتا ہے...... تو یہ میرا انعام ہے۔ میرا یہ اعزاز ہے کہ جو میں نے لکھا وہ معتبر ٹھہرا۔ بہت شکریہ دوشیزہ' بہت مہربانی پیاری منزہ سہام مرزا۔
اب آپ کے سوالوں کے جواب حاضر ہیں:

سوال: آج کل زندگی کیا کہہ رہی ہے؟
جواب: زندگی کہہ رہی ہے کہ مقابلہ سخت ہے اور وقت کم۔ جلد از جلد کام نمٹاؤ کہ زندگی کی شام ہو چکی ہے۔
سوال: آپ اپنے ''کل'' جو گزر گیا کے بارے میں کچھ بتائیں۔
جواب: کل...... میرا کل بہت خوبصورت گزرا جو میرا سرمایہ ہے یا جسے اثاثہ کہیں۔ انتہائی بے فکری کا دور گزارا میں نے اپنے اسکول اور یونیورسٹی کے دور کو بہت انجوائے کیا جامعہ کراچی کی دیواریں گواہ ہیں۔ ہمارے اردو ڈپارٹمنٹ کے کوریڈور بھی گواہی دیں گے۔ بہت مزے اور مستیوں کے دن گزارے۔ لائبریری میں پڑھتے ہوئے گرما گرم کاغذی سموسے کھائے جاتے اور سردیوں میں لان میں بیٹھ کر گرما گرم کافی' سینڈوچز کے ساتھ پی جاتی۔ ہم پانچ دوستوں کا گروپ تھا۔ میں روبینہ

ساجدہ حبیب' فردوس حیدر صاحبہ اور خالدہ اسد مرحومہ کے ساتھ دوشیزہ رائٹر ایوارڈ کے موقع پر

زریں (جو آج کل گورنمنٹ ڈگری کالج کورنگی کی پرنسپل ہیں) سائرہ جبیں (آواز دے کہاں ہے) فرزانہ فرح (اللہ میری دوست کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین) اور عائزہ غلام نبی (ہم چینل کی کانٹینٹ ہیڈ) یہ ہم سے جونیئر تھی مگر ہمارے گروپ میں شامل تھی) ہم نے سلام دعا سب سے رکھی مگر کسی کو اپنے گروپ میں شامل نہ کیا۔

ان دنوں میں نے لکھا بھی بہت یونیورسٹی دور میں ہر ماہ میرے تین چار افسانے ضرور شائع ہوتے اور ناول کی قسط بھی لکھتی۔ میری دوست کہتی تھیں بس تم لکھو یار۔ ہم تمہیں نوٹس دیں گے اور واقعی سائرہ جبیں اور روبینہ زریں مجھے ضروری نوٹس دیتیں یہ اور بات کہ میں نے نوٹس سے بھی امتحان کی تیاری نہ کی۔ کتنی بری تھی میں ان دنوں

نصف بہتر کے ساتھ

جس دن افسانے میں اعزاز یہ ملتا تھا ہم پانچوں کینٹے ٹیریا میں بیٹھی نظر آتیں۔
منزہ پیاری کیا خوبصورت کل تھا میرا
بہت یاد آتے ہیں وہ دن
سوال: حرف کی دنیا سے آپ کا رابطہ کب اور کیسے جڑا، اس سفر کا احوال کیا ہے؟
جواب: یار بہت اچھا سوال ہے۔ مجھے بہت پیچھے جانا پڑے گا۔
پانچویں کلاس میں تھی تو حرف سے رابطہ ہوا۔ پہلے روزنامہ ''امن'' کراچی کے بچوں کے صفحہ پر لکھا اور بہت لکھا۔ پھر طالبات کے صفحہ پر لکھنا شروع کیا۔ افضل صدیقی صاحب (مرحوم) اور انور شعور بہت خلوص سے میری تحریریں شائع کرتے تھے طالبات کے صفحہ کی انچارج فہمیدہ رشید بہار ہوتی تھیں۔ بہت محبت سے میری تحریریں شائع کرتیں۔ ہاں امن والوں نے تین بار مجھے ایوارڈ دیے۔ میں نے تینوں بار ایوارڈ لیے میرے ساتھ بہت پیاری دوست عظمت عزمی مرحومہ بھی ہوتی تھیں۔ حمیرا راحت بھی امن میں لکھتی تھیں۔ وہ دور بہت معصوم اور لاابالی دور تھا۔ ہم بھولے بھالے سے ہوتے تھے اور جب میں نویں کلاس میں تھی تو پہلا افسانہ دوشیزہ میں بھیجا جو دس ماہ بعد سہارے کی تلاش کے عنوان سے سالنامہ میں شائع ہوا دسمبر 1979 میں (یقیناً) کتنا عرصہ گزر گیا؟ یہ افسانہ شائع ہوا اور ایوارڈ کا حق دار ٹھہرا۔ بہت حیرت آمیز خوشی ہوئی تھی اپریل 1980ء میں ایک شاندار تقریب میں میں نے یہ ایوارڈ حاصل کیا تھا شیلڈ کی صورت۔ یہ پہلا موقع تھا

جب کسی ڈائجسٹ نے رائٹرز کو یہ مقام دیا تھا۔
پورے پاکستان سے رائٹرز اس تقریب میں شامل
ہوئے۔ یہ عزت واحترام پہلی بار کسی رسالے نے
رائٹرز کو دی۔ اور پھر پرل کانٹی نینٹل میں تقریب۔ پی
سی کا بینکوئٹ ہال ہم نے زندگی میں پہلی بار دیکھا۔
دوسرے روز دوشیزہ کی طرف سے ایک چائنیز
ریسٹورنٹ جس کا نام یاد نہیں آرہا میں سہام مرزا
صاحب نے ڈنر دیا یہ ریسٹورنٹ دوشیزہ کے آفس
کے نیچے تھا۔ سچ پوچھیں تو پہلی بار چائنیز کھانا کھایا۔
عظمت نے مجھے بولنے نہ دیا لیکن ہم بھوکے نہ آئے
چکن کارن سوپ بھی مزے کا تھا اور کھانا بھی پھر تو
ہم اکثر چائنیز کھاتے ہوئے پائے جاتے۔ ناظمہ
اور اصل کے ساتھ اس وقت منزہ سہام مرزا (جواب
بہت سوبر سی خاتون ہیں) پیاری سی بچی تھیں۔ آٹھ
دس سال کی ہوں گی باب کٹ بال نفاست سے
سنوارے ہوئے مہمان خصوصی کے ساتھ قدم بہ قدم
چلتی ہوئی انہیں اسٹیج پر پہنچاتی تھیں۔ مجھے تو آج بھی
وہ دو بچیاں نہیں بھولتیں ایک منزہ دوسری تابندہ۔

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی سے ایوارڈ لیتے ہوئے

عظمت عزمی میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ یار بار کہے
(کھانا سرو ہونے سے پہلے) بانو تم نے بھی چائنیز
کھانے کھائے ہیں؟
"نہیں تو" میں نے نفی میں گردن ہلائی
(تم نے کھائے ہیں؟) "یار کھائے تو میں نے بھی
نہیں پتہ نہیں کیسے ہوں گے۔ بھوکا نہ جانا پڑے۔"
گھر والے مذاق اڑائیں گے کہ بھوکی
آ گئیں۔ میں نے کہنا چاہا چپ کرو خالدہ نہ سن لیں

سوال: دوشیزہ سے آپ کا تعلق کتنا پرانا
ہے۔
جواب: دوشیزہ سے تعلق کا اوپر بتا تو دیا
ہے ماشاءاللہ ۳۸ رسال ہو گئے ہیں پہلا ناول میں
نے سہام مرزا صاحب اور رعنا فاروقی کے کہنے پر لکھا
اور بڑی بات یہ کہ میں ابھی ناول نہیں لکھنا چاہ رہی
تھی۔ مگر مرزا صاحب نے کہا تھا مجھے آج بھی یاد ہے
ان کی آواز اپنے کانوں میں گونجتی محسوس ہو رہی ہے

"بانو۔ چانس مس نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ایک بار کوئی
چانس مس کر دو تو پھر قدرت مشکل سے موقع فراہم
کرتی ہے اور پھر کئی سال لگ جاتے ہیں، تمہیں مجبور
نہیں کرتا میرے پاس اور رائٹرز کے ناولز بھی رکھے
ہیں مگر میں تم سے ایک رول ایریا کا ناول لکھوانا چاہتا
ہوں مجھے یقین ہے کہ تم سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا۔
مجھے معلوم ہے کہ تمہارا خمیر دیہات کی مٹی سے اٹھا
ہے تم وہاں کے بارے میں بہتر جانتی ہو۔ وہاں کی
ثقافت رہن سہن سب لکھو۔" اور ان کی حوصلہ افزائی
ہی تھی کہ میں نے ناول کا آغاز کیا۔ یقین کریں
میرے ذہن میں کوئی کہانی نہ تھی۔ بس اپنے گاؤں
کی ایک سڑک کو فوکس کیا اور پھر کہانی بنتی چلی گئی
پورے بیس ماہ یہ ناول کامیابی سے دوشیزہ میں
"شیشہ گر" کے نام سے شائع ہوا اور بہت داد پائی
ایوارڈ کا حقدار ٹھہرا۔ اس کی پہلی قسط دی (صرف دو
روز میں لکھ کر) اور جب ۱۲ روز بعد پرچہ آیا تو
میرے ناول کی قسط موجود تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ
دوشیزہ نے مجھ ایک نئی رائٹر کو یہ اعزاز بخشا۔ میرا
ناول شائع ہوا جبکہ میرے اس وقت تک سات آٹھ
افسانے شائع ہوئے تھے اور دوشیزہ میں صرف تین
افسانے چھپے تھے۔ مرزا صاحب کی نظر نے میرے
اندر کے ناول نگار کو تاک لیا تھا۔
اس ناول کو مشہور مصنفہ عصمت چغتائی نے
بھی پسند کیا۔
میں نے دوشیزہ سے ہر سال ایوارڈز لیے
یعنی 1979 سے 1983ء تک ایوارڈز لیے پھر
مصروفیات بڑھ گئیں تو لکھنا کم ہوا دوشیزہ میں بھی کم
کم لکھا۔ لیکن ناتا نہیں توڑا۔ (دوشیزہ میں رنجکیت
ہونے کے ڈر سے کم لکھا)۔
سوال: شاعری اور ڈرامے سے آپ کی
محبت اور آشنائی کب ہوئی؟
جواب: منزہ ڈیئر آپ کا یہ سوال پڑھ کر
میں بہت ہنسی۔ آخر سہام مرزا صاحب کی بیٹی ہو اور
ذو معنی سوال نہ کرے۔ ضروری تو نہیں شاعری محبت
کر دو تو کی جاتی ہے؟ اردو شاعری کی مگر نظمیں کہیں۔
میں غزلوں کی شاعرہ نہیں ہوں۔ ایک بار فہمیدہ
ریاض نے مجھ سے کہا تھا دوشیزہ کے آفس میں
ملاقات ہوئی تھی۔ بانو! میں نے غزل لکھی تھی مگر جو
مزا نظم لکھنے کا ہے وہ غزل میں کہاں۔ یوں بھی نظم کم
کم لکھی جا رہی ہے، تم نظم لکھو۔
انہی دنوں پتہ چلا کہ سرائیکی میں کسی
خاتون کی شاعری کی کتاب نہیں ہے تو سرائیکی زبان
میں نظمیں لکھ کر کتاب چھپوا دی۔ "دل تانگھ تانگھے" تو
اس طرح میں سرائیکی زبان کی نظموں کی پہلی
صاحب کتاب شاعرہ ہوں اور پہلی ناول نگار بھی
"سانول لوک مہاراں" میرا ناول ہے جو بہاالدین
ذکریا یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ مجھ پر دو
طالب علم ایم فل کر رہے ہیں۔ بتاتے ہوئے شرم
آ رہی ہے مگر فخر بھی ہے خود پر۔ رہی بات "ڈرامہ

سے آشنائی کی تو مجھے اس فیلڈ میں عامرہ شاہد لے کر آئیں انہوں نے میرا ناول ''گونگے دکھ'' پڑھ کر مجھ سے رابطہ کیا۔

میں ایک دیہات کی رہنے والی ہوں وہاڑی میں ایک گاؤں ہے۔ عامرہ شاہد نے بہت محبت اور خلوص سے مجھے ہم چینل کے لیے سوپ لکھنے کو کہا میری حوصلہ افزائی کی۔ مجھے اسکرپٹ لکھنا سکھایا یوں میں نے پہلا سوپ ڈرامہ لکھا ''مر جائیں بھی تو کیا'' جو ہم چینل سے آن ایئر ہوا اور داد پائی۔ اسکرپٹ رائٹنگ میں عامرہ میری استاد ہیں اور اب بھی وہ مجھے سکھا رہی ہیں۔ اسکرپٹ میں اگر کہیں اٹک جاؤں تو فوراً کال کرتی ہوں۔ ''یار یہاں سے آگے کیا کروں؟'' عامرہ کھٹ مجھے مشکل سے نکال دیتی ہیں ''بالو یوں کرلو' ایسا کرو یعنی ذہن سے گرہ کھل جاتی ہے پھر قلم چل پڑتا ہے۔ عامرہ شاہد کے ساتھ میرا سفر چل رہا ہے وہ ''ہم'' سے ایک پروڈکشن ہاؤس پر آئیں تو وہاں میں نے ان کے ساتھ کام کیا میرا لکھا ہوا سیریل ''جینا دشوار سہی'' پی ٹی وی (ہوم) پر آن ایئر ہوا۔ منزہ یہ میری برسوں پرانی خواہش پوری ہوئی کہ پی ٹی وی پر میرا ڈرامہ آئے حالانکہ لوگوں نے مجھے کہا بھی کی پی ٹی وی کون دیکھتا ہے۔ میں نے کہا میں اکیلی دیکھوں گی۔ اللہ کا شکر ادا نہ کروں کہ جس نے میری برسوں پرانی خواہش کو پورا کیا اور پیاری منزہ میرا سیریل پی ٹی وی سے چلا پرائم ٹائم میں۔ آٹھویں یا نویں قسط سے Top-10 میں پہلے نمبر پر آیا تو 26 قسطوں تک نمبر ون رہا (ماشاً اللہ) تین بار پی ٹی وی ہوم اور دوبارہ پی ٹی وی گلوبل سے آن ایئر ہوا یہ کم اعزاز تو نہیں۔ سیریل جینا دشوار نہیں کی کانسٹ بھی عامرہ شاہد ہیں۔

جیو چینل سے میرے دو سوپ ڈرامے آن ایئر ہوئے۔ سسرال میری بہن کا جیو انٹرٹینمنٹ سے تین بار اور جیو کہانی سے دو بار دکھایا گیا جیو ہی سے بے چاری مہرالنسا جون 2017ء میں ختم ہوا میرے تینوں سوپ سپرہٹ ہوئے ہیں ان دنوں چینل بول سے منسلک ہوں اور اس کے لیے ڈرامہ ''رباوے'' لکھ رہی ہوں عامرہ شاہد کانٹینٹ ہیڈ ہیں اور منصور احمد خان عامرہ شاہد کے ساتھ ہیں۔ منصور بھی میرا بہت ساتھ دیتے ہیں۔ اکثر میری Episodes لیٹ ہو جاتی ہیں منصور احمد سے میں کہتی ہوں کہ اگر مجھے کوئی سین پسند نہ آئے تو میں اسے نکال دیتی ہوں یہی حال افسانے میں بھی ہوتا ہے مجھے کوئی لائن اچھی نہ لگے تو میں دوبارہ لکھتی ہوں جب میں خود ہی مطمئن نہ ہوں تو میں تحریر آگے نہیں جانے دیتی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ جس طرح 1980ء میں دوشیزہ نے رائٹرز کو عزت و احترام بخشا بول چینل نے بھی رائٹرز کو بتایا کہ ہمارا مقام کیا ہے؟ ہمارے چینل بول کے پریذیڈنٹ نبیل ظفر سے بات ہوئی کہنے لگے۔ اقبال۔ اپریل 2017ء میں ہمارا ایک بہت بڑا فنکشن ہے آپ نے ضرور آنا ہے۔

میں نے کہا کہ میں اپنے شوہر کے بغیر نہیں آ جا سکتی تب انہوں نے ہم دونوں کا ٹکٹ بھیجا تین روز ہم پی سی میں ٹھہرے۔ تین روز کے کار فراہم کی گئی بمع ڈرائیور بلکہ Out of city جو رائٹرز آئیں انہیں بھی بمعہ شوہر کے بلایا گیا ہمیں معلوم ہوا کہ ہم بھی قابل احترام ہیں جس طرح برسوں پہلے دوشیزہ نے رائٹر کو عزت و احترام بخشا اب وہ روایت چینل بول نے قائم کی اللہ دوسرے چینلو کو بھی توفیق دے مگر کہاں؟ کیا دوشیزہ کے بعد کسی پرچے نے ایسا کیا؟

سوال: کچھ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بتائیں!

جواب: بس گزر رہی ہے اور اللہ پاک کا شکر ہے کہ بہت اچھی گزر رہی ہے میرے شوہر ملک فیض رسول لنگڑیال زمیندار ہیں پہلے بینک میں جاب کرتے تھے اب اپنا زمیندارہ کرتے ہیں بیٹا ایک ہی ہے محمد اسماعیل ٹیپو فرسٹ ایئر پری انجینئرنگ کا اسٹوڈنٹ ہے ضلع وہاڑی کے ایک گاؤں میں رہتی ہوں مزے کی زندگی ہے لکھتی ہوں یا پھر میاں کے ساتھ سیر سپاٹا کرنے بھی چلی جاتی ہوں۔

سوال: پسندیدہ کتابیں اور ادیب؟

جواب: پسندیدہ کتاب تو قرآن پاک ہے۔ جسے روز پڑھتی ہوں نہ پڑھوں تو بے چینی رہتی ہے، اور ادیب؟ منزہ اب عرصہ ہوا پڑھنا چھوٹ گیا ہے ڈائجسٹ آتے ہیں تو وہی پڑھتی ہوں آج کل لڑکیاں بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ یوں بھی کتابیں بہت مہنگی ہوگئی ہیں۔ قوت خرید سے باہر۔

سوال: موسیقی اور محبت ان دونوں کے حوالے سے آپ کا دل کیا کہتا ہے؟

جواب: یونیورسٹی کے ہی زمانے کی بات ہے عطا اللہ نیازی کو سنتے ہوئے میں نے سائرہ جبیں سے کہا تھا۔

یار عطا اللہ کو سنتے ہوئے ایک دم محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اور برسوں گزرنے کے بعد بھی آج میرا یہی جواب ہے خوبصورت غزل سن لو یا سرائیکی دوہڑے۔ یقین کریں میرا تو اب بھی محبت بلکہ عشق کرنے کو جی چاہتا ہے (بے شک بوڑھے ہوگئے دل تو اٹھارہ سالہ لڑکی کا ہے نا) اور مجھے اپنے شوہر سے عشق ہے۔

سوال: حالات حاضرہ سے دلچسپی ہے؟

جواب: صرف خبریں سننے کی حد تک۔ یا اخبار پڑھ لیتی ہوں۔ اب تو روز ہی پہلی خبر کسی قتل و غارت کی ہوتی ہے تو دل ڈر سا جاتا ہے میں ڈپریشن میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔

سوال: کون سے عوامی اور سماجی مسائل اور رویے آپ کے لیے دکھ کا باعث ہیں؟

جواب: کرپشن سب سے بڑا مسئلہ ہے اور جب ہمارے حکمران ہی کرپٹ ہوں تو عوام کیا کریں؟ بہت دل دکھتا ہے آئے روز کی دہشت گردی عوام مرتے ہیں میرے پاک فوج کے جوان شہید ہوتے ہیں تو میں رات بھر سو نہیں سکتی۔ کہ کیا ہے زندگی؟

اور آپ کے دوشیزہ میں اداریے پڑھ کر ہمیشہ لگا جیسے یہ بھی میرے دل میں تھا۔ بہت اچھا اداریہ لکھتی ہیں آپ منزہ۔ لمحہ فکریہ ہوتا ہے آپ کی تحریر میں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

سوال: موجودہ وقت میں میڈیا کا کردار کیا ہے؟

جواب: سچ پوچھو تو میڈیا اس کا ساتھ دیتا ہے جو جس قدر پیسے دے پچھلے دنوں ایک چینل پر دھرنے والوں کے فیور میں بہت بڑھ چڑھ کر بولا جا رہا تھا، جب دھرنا ختم ہوا تو اس چینل کے اینکر کہنے لگے دھرنا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ریاست کا نقصان ہے۔...... ان سے کوئی پوچھے کہ تم 22 روز ان کے طرفدار بنے رہے اور اب ریاست کے وفادار ہو گئے ہو کس قدر منافق ہیں۔

آج اور کل کے ٹی وی ڈرامے میں کیا فرق ہے؟

جواب: کل کا ڈرامہ بھی بہت اچھا تھا اور آج بھی ڈرامہ اچھا لکھا جا رہا ہے۔ وقت کے مطابق ہر چیز بدلتی ہے تو ڈرامہ کیوں نہ بدلے۔ یہ اور بات ہے کہ پہلے ایک چینل پی ٹی وی ہوتا تھا اب بہتات

ہوگئی ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ سب مقابلہ کر رہے ہیں۔ پی ٹی وی پر چند مخصوص رائٹرز تھے اور اب ڈائجسٹوں نے ڈرامہ نگاروں کی ایک کھیپ تیار کردی ہے اور میں سمجھتی ہوں یہ ڈائجسٹ رائٹرز کا دور ہے۔ پہلے بے شک ڈائجسٹ میں لکھنے والوں کو رائٹرز نہیں مانا جاتا تھا لیکن اب وہی ڈرامہ لکھ رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہم جو ڈائجسٹ رائٹرز کو نہیں مانتے تھے وہ نظر ہی نہیں آتے تھے (اللہ پاک کبھی کبھی اس طرح لالی سے بازمرواتا ہے)

سوال: فلموں سے دلچسپی ہے؟

جواب: کسی زمانے میں فلمیں دیکھنا پسند تھا مجھے VCR پر فلم دیکھنا کبھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ تو میں امت الصبور (مدیرہ خواتین ڈائجسٹ) اور ناظمہ طالب مرحومہ (مدیرہ کرن ڈائجسٹ) کے ساتھ سینما ہال جا کر فلم دیکھتی تھی۔ امتل مذہبی ٹائپ کی ہے۔ اسے ہم دونوں زبردستی لے جاتے تھے۔ اور وہ دوستی میں چلی جاتی تھی۔ زبردستی تو اسے ہم کلفٹن بھی لے جاتے۔ میں اور ناظمہ سمندر کے پانی میں دور تک چلے جاتے اور امتل کنارے پر کھڑی پریشان ہوتی رہتی۔

(خدا غرق کرے ان دہشت گردوں کو میری دوست ناعمہ طالب جو بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ میں اسسٹنٹ پروفیسر تھی دہشت گردی کا شکار ہوگئی)۔

مجھے آرٹ موویز پسند ہیں۔ پاکستانی فلمیں پسند تھیں۔ اب تو عرصہ ہوا کوئی فلم نہیں دیکھی تقریباً اٹھارہ سال ہوگئے ہیں یعنی جب سے کراچی سے ملتان آئی تو فلمیں ہی چھوٹ گئیں۔

سوال: پاکستان کے علاوہ دنیا دیکھی، کیا تجربہ ہوا؟

جواب: اپنا پاکستان اپنا ملک اپنے لوگ شادی سے پہلے میں اپنے ماموں کے پاس ڈنمارک گئی تھی مگر تیرہ روز بعد ہی بھاگ آئی کہ اتنی ٹھنڈ اور برف میں نہیں رہ سکتی تھی۔ شادی کے بعد ہم سنگاپور گئے۔ اچھا تھا۔ مگر جہاں جاؤ صرف چند روز کے لیے مجھے اپنا ملک پسند ہے اور شہر کراچی جہاں میں عرصہ رہی اور ملتان جہاں میں نے جنم لیا۔

سوال: لوگ کہتے ہیں وہاں صفائی بہت ہے۔ لندن امریکا میں اور یورپ ممالک میں میں کہتی ہوں وہاں کسی کو اتنی فرصت نہیں کہ ہماری طرح گند پھیلائیں۔ وہ تو ایک روز نہ کمائیں تو بھوکے مریں۔ اور اپنا ملک کتنا اچھا ہے کہ حکمران لوٹ رہے ہیں لوگ لوٹ رہے ہیں ایسے پھر بھی اللہ ہمیں دو وقت کی روٹی دیتا ہے۔ بھوکا نہیں رہنے دیتا۔ میرے رب کا شکر ہے پھر اپنے ملک کو برا کیوں کہیں؟

سوال: پسندیدہ موسم خوشبو رنگ اور لوگ؟

جواب: سارے موسم پسند ہیں۔ البتہ سردی اچھی لگتی ہے بندہ خوبصورت رضائی میں گھس کر سوئے تو کیا سکون کی نیند آتی ہے۔ خوشبو۔ گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہمیشہ سے پسند ہے۔ ویسے مجھے موتیا کی اور مروہ کی خوشبو بھی پسند ہے سارے رنگ اچھے لگتے ہیں جوانی میں ریڈ کلر بہت اچھا لگتا تھا یعنی میں گرمی اور سردی میں ریڈ کلر کے پرنٹ سوٹ ضرور بناتی تھی اب لائٹ کلر اچھے لگتے ہیں لیکن دل اب بھی ریڈ کی طرف لپکتا ہے۔ لوگ اپنے لوگ اچھے لگتے ہیں سیدھے سادے مروت کرنے والے محبت اور عزت دینے والے بہت پسند ہیں۔

سوال: اور کوئی خاص بات جو آپ کہنا چاہتی ہیں؟

جواب: ہاں خوش رہو اور خوش رہنے دو۔ کبھی کسی کا برا نہ چاہو اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کرتے رہو۔

سوال: اپنے پڑھنے والوں کے لیے کوئی بات؟

جواب: میرے پڑھنے والے میرے لیے بہت خاص ہیں۔ انہوں نے مجھے عزت دی۔ اپنا قیمتی وقت نکال کر میرے لکھے لفظوں کو پڑھا اور پسندیدگی کی سند بخشی۔ اللہ ان سب کو سلامت رکھے جنہوں نے میری تحریروں کو اپنے رسائل میں جگہ دی اور میرے پڑھنے والوں کو بھی اللہ خوش رکھے۔ آمین

اللہ پاک میرے محترم سہام مرزا صاحب کو بہت بلند مقام عطا فرمائے ان کے درجات بلند کرے آمین۔ مرزا صاحب سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ مجھے ان کی آنکھوں میں چمکتی ذہانت اور زیرلب مسکرانا نہیں بھولتا۔ اس وقت بھی وہ بارعب چہرہ میری نظروں کے سامنے ہے۔ منزہ ڈیئر آپ نے ان کی جگہ سنبھالی ہے اور کامیاب ہیں۔

سوال: دوشیزہ سے تعلق کتنا پرانا ہے؟

جواب: دسمبر 1979ء سے یہاں چھپنا شروع کیا اور پڑھنا شاید 1978 سے۔ میری ممانی غزالہ ناصر کو بہت شوق تھا ڈائجسٹ پڑھنے کا تو یہ لت انہوں نے ڈالی تھی۔

دوشیزہ کے ساتھ اب دوسرا دور چل رہا ہے۔ اب بھی میں نے افسانے لکھے اور مجھے تین سال مسلسل ایوارڈ ملا ہے شکریہ۔

انشاءاللہ 2018 میں بھی لکھوں گی۔ ابھی میں اپنا ڈرامہ سوپ مکمل کرلوں کہ دوشیزہ میں لکھنا میرا شوق ہے منزہ پیاری مجھے یقین ہے کہ میرا یہ سیدھا سادا انٹرویو آپ کو پسند آئے گا کیونکہ میں جس طرح کہانی لکھتی ہوں جس طرح بات کرتی ہوں اسی طرح میں نے لکھا ہے آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے یاد رکھا اور مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔ اللہ حافظ

☆☆......☆☆

سلسلے وار ناول

بینا عالیہ

کُن فیکُون

چوتھا حصہ

سب نے اس ایک دن کی بچی سے منہ موڑ لیا تھا۔ اللہ کا حکم یہی تھا اس میں اس معصوم کا کیا قصور؟ لیکن رشتے داروں نے اس ننھی پری کے ماتھے پر منحوس کا ٹیگ ضرور چسپاں کرتا تھا...... زندگی اور بندگی سے گندھی ایک خوبصورت تحریر

یہ الفاظ آیت کے دل کی گہرائیوں سے بیخودی کے عالم میں ادا ہوئے تھے، سزا و جزا کا مالک تو ہے گھور اندھیر ہیبت ناک پر تپش سزا سے بچالینا۔ مومنین کی محفلوں میں کھڑے ہونے کی جگہ عطا فرما دینا۔ مالک میں اپنی حدوں سے تجاوز کرتے ہوئے تجھ سے مانگ رہی ہوں بس رب اس حد تک مجھے سرخرو کردے کہ روز محشر تیرے سامنے کھڑے ہونے پر مجھ پر اپنے گناہوں کی گھبراہٹ طاری نہ ہو

نمل کی جانب سے آیت کو میٹنگ کال موصول ہوئی تھی۔ اس وقت چند طلبا اور پروفیسرز کے ساتھ وہ بھی اس میٹنگ میں موجود تھی جہاں پرنسپل بھی تھے۔ ململ کے سفید کلف شدہ دوپٹے کو اچھی طرح لپیٹے طویل ٹیبل کی ایک چیئر پر وہ بھی براجمان تھی۔ اس کی نیلی آنکھیں دمک رہی تھیں۔ روشن پیشانی پر ننھی سی پتلی ناک مڑی گھنیری پلکیں بار بار جھپکاتی آیت خان کی تمام توجہ اپنے سامنے رکھے سفید پیپر پر تھی۔ سبھی اسٹوڈنٹ اپنے اساتذہ کی طرف متوجہ تھے۔ پہلے پرنسپل ڈاکٹر ایم جی خان نے بریفنگ دی تھی

پھر انہوں نے ایک ایک اسٹوڈنٹ کا نام لیا آپ چار لوگوں کا ایڈمیشن بریڈفورڈ شائر یونیورسٹی میں ہوگا یہ یونیورسٹی انگلینڈ کے شہر بریڈفورڈ میں ہے نمل یونیورسٹی بریڈفورڈ شائر سے الحاق شدہ ہے ہر سال میرٹ پر یہ یونیورسٹی یہاں کے ایک اسٹوڈنٹ کو اسکالرشپ پر بلاتی ہے۔ آپ چاروں کا تعلیمی ریکارڈ دیکھتے ہوئے وہاں کے ڈین اور کولیگز کے متفقہ فیصلے سے وائس پرنسپل کے حتمی فیصلے نے آپ چاروں کو اوکے کر دیا ہے انہوں نے ای میل بھیج دی ہے آپ چاروں کے ناموں کی۔ احمر شاہ، اقرب جیلانی، نسا ملک اور آیت خان۔ آپ کی کوششوں نے اس ملک اور نمل کا یہاں کے چیئرمین، ڈین اور اساتذہ کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ آپ یہ بات ذہن میں رکھ کر جائیں گے کہ آپ کی اولین ترجیحات صرف تعلیم ہے جو انگلینڈ جا کر آپ نے حاصل کرلی ہے، اپنے ملک کے رتبے' عزت و تکریم کا ہمیشہ خیال رکھنا ہے۔ نائن الیون کے بعد ہم یورپی اقلیتوں کے سامنے سنبھل نہیں سکے، تعصب

بیحد پایا جاتا ہے وہاں کے ٹین ایجرز اب بھی مسلم کمیونٹی کو دہشت گرد سمجھتے نہیں مانتے ہیں۔ بریڈفورڈ یونیورسٹی صرف آپ کے تعلیمی اخراجات برداشت کرے گی، رہائش و طعام کا انتظام آپ کو خود کرنا ہوگا، اگر وہاں کے ہوسٹل میں رہائش رکھیں گے تو بھاری چارجز ادا کرنے ہوں گے کیونکہ ان کے ہوسٹلز لگژری ہیں، کھانا بھی وی آئی پی اسٹینڈرڈ کا ارینج کیا جاتا ہے جو آپ کے لیے افورڈ کرنا پوسیبل نہیں ہوگا۔ ذاتی اخراجات کے لیے اماؤنٹ چاہیے آپ گھر سے منگوائیں، وہاں پارٹ ٹائم جاب کریں یہ آپ کا اشو ہے یونیورسٹی کا نہیں جیسے ہی انگلینڈ کی ایمبیسی آپ کے ویزے اوکے کرے گی۔ اس کے بعد ٹکٹ وغیرہ کنفرم ہوں گے، آپ اپنے پاسپورٹ بنوا لیجیے۔" یہاں موجود تمام اساتذہ نے باری باری ان چاروں سے بات کی۔ مسٹر ڈین نے انہیں بتایا آیت خان آپ کا ایم فل کے لیے ایڈمیشن ہوگا نسا ملک آپ کا اکنامکس احمر شاہ اور اقرب جیلانی آپ کا بارایٹ لا کے لیے ایڈمیشن ہوگا۔ اپنی کوسچین؟

تب وہ چاروں مختلف سوالات کرتے رہے۔

اماں کو ابھی آیت نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ فکر مند تھی جانے اماں کس طرح بی ہیو کریں۔ آیت چاہ رہی تھی کہ پہلے سر تیمور یزدانی اماں سے بات کرکے انہیں مطمئن کریں تب وہ اماں سے بات کرے گی تو عظمیٰ خان کی سمجھ میں اس کی بات آسانی سے آجائے گی کیونکہ اماں ہمیشہ اپنا ملک اپنا پاکستان کا راگ الاپتی تھیں۔ وہ کہتیں ہمارے ملک کا تعلیمی معیار بیسٹ ہے ہم اسی کو مزید بہترین بنانے کی کوشش کریں، جہاں کا کھاتے ہیں اس ملک کو فائدہ کیوں نہ پہنچائیں۔ آیت کے اکاؤنٹ میں اتنا پیسہ تھا کہ وہ آرام سے وہاں سال دو سال رہ سکتی تھی۔ ساتھ میں کوئی جاب کرلوں گی، مجھے اپنے لیے خود اسٹرگل کرنا ہوگی، میرے مالک میری غیب سے مدد فرما۔ اسے بھرپور محنت کرنی تھی اس کے اندر حرص نہیں تھا، لالچ سے وہ پاک تھی، نہ ہی اسے مادیت کی حب تھی ہمیشہ اس کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ پیسے ہوتے تھے تب وہ کسی مستحق کی مدد کردیتی اسے خبط تھا بس اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا۔ اللہ پاک مجھے اپنے راستے سے نہ بھٹکنے دینا، مالک تیری ہی پاک قدرت نے مجھے تیرے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا، ہمیشہ غیر ارادی طور پر بھی اس نے ہر بار اللہ کو سوچا، وہ کون سی غیر مرئی قوت تھی جو آیت خان کو بے بس کر جاتی وہ اپنے لیے دعا کرتی اے کاش میں اماں جیسی بن جاؤں۔ عفو و درگزر کرنے والی لیکن وہ اماں جیسی کیسے بن سکتی تھی، اماں تو بس اماں ہی تھیں، انہیں رب کریم نے ایسا ہی بنایا تھا اور آیت خان نے اللہ سے شکوہ کرنے کے علاوہ اس بائیس سالہ زندگی میں کیا ہی کیا تھا، پھر اب کیوں ہر بات اپنے معبود سے شیئر کرتی تھی وہ اس وحدہٗ لاشریک ذات کے سامنے اپنے مسائل کی گٹھری کھول کر رکھتی تھی تب اپنے آپ میں مسکراتے ہوئے وہ سر کو تذبذب سے گزرتے ہوئے خفیف سی جنبش دیتی، اس کے پاس تو صدیوں سے ایسی ان کہی باتیں تھیں جو وہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے کرنا چاہتی تھی۔ اماں کے علاوہ کسی سے فضول بات نہیں کرتی تھی۔ ایروگینس ضرورت سے زیادہ تھی۔ اسے اطراف کے لوگوں کی پروا بھی نہیں تھی۔ مالک مجھے تیری مخلوق سے اس لیے خوف آتا ہے کہ یہ کم ظرف ہیں اگر میں کسی سے مسکرا کر بھی بات کرلوں گی تو دوسرے پل مجھ پر بہتان لگا دیا جائے گا۔ یہاں اچھوں کے ساتھ ساتھ برے لوگ بھی بستے ہیں جو ظالم و بے حس ہیں لیکن میرے پیدا کرنے والے رب مجھے تجھ سے کبھی خوف نہیں آیا کیونکہ میں جانتی ہوں میری ساکن شہ رگ سے صدائیں اٹھتی ہیں۔ تیری تسبیح پڑھتی ہیں کہ تو رحمان ہے، رحیم ہے، کریم ہے، رؤف ہے، سمیع و علیم ہے۔ پھر بھلا میں تجھ سے کیسے ڈر سکتی ہوں، میرا پختہ یقین و بھروسہ تجھ پر قائم ہے، تیری رحمتیں مجھ کو ڈگمگانے سے بچا لیتی ہیں۔ تیرے قرب کی شہنشاہیت مجھے اپنے پیروں پر کھڑا رکھتی ہے۔ دین کی ہدایت اگرچہ تیری جانب سے عطا ہوتی ہے کوشش بندے کو بھی کرنی چاہیے، نامہ اعمال میں جو حشر میں ہمارے ہاتھوں میں تھمایا جاتا ہے اس میں نیکیوں کو بھرنے کی مشق ہمیں ہر وقت کرتے رہنا چاہیے۔ آیت سوچتی میرا رب دین کی سمجھ ان لوگوں کو عطا فرماتا ہے جو اس کے عہد پر پورے اتریں۔ مجھے میرے رب نے کس قدر نوازا ہر مشکل سے یوں نکالا کہ حیرت ہوتی ہے تیرا شکر یوں ادا نہ کیا جیسے مجھے کرنا چاہیے تھا، ہر وقت مجھے تجھ سے گلا شکوہ ہی رہا، احساس زیاں کا ملال اس کی آنکھوں کی جلن مزید بڑھا جاتا۔ برملا خود کو کوستی رہتی تھی میں نے ہمیشہ اپنی خواہشوں کا شہر اپنے اردگرد بسائے رکھا۔ تو نے پھر بھی مجھے بار بار نوازا۔ فرط جذبات اکثر اس کی یونہی سدھ بدھ گم کردیتے تھے زندگی کی ازلی نیچرل خوبصورتی کو محسوس کرتی تو یہ ہمیشہ اسے پرکیش ہی ملتی۔ کم مائیگی بے وقعتی کو کتنے سالوں تک خود پر مسلط کیے رکھا میرا پختہ اعتبار اور اندر سے اٹھتی ہوک مجھے تیری جانب کھینچتی ہے تو میں پھر کیسے تجھ سے خوف کھا سکتی ہوں۔ میرا ایمان تجھ پر قائم ہے، میرے مالک میں چاہتی ہوں اپنے ایمان کا اظہار اسی یقین کے ساتھ برملا کرتی رہوں، میری روح کا ایک ایک لمحہ گواہی دے میری زبان روح کی اس صدا کی تائید کرے کہ میں تجھ پر ایمان رکھتی ہوں۔ میں اب اپنے اللہ کی تابعدار صالح اس کی ایمان والی بندی بن چکی ہوں۔ میرے اللہ مجھے اس ایمان کی دولت عطا فرما جو تیرے مومنین بندوں کے حصے میں تو نے لکھا ہوا ہے۔ مجھے ہمیشہ بھٹکنے سے بچا لینا۔ ڈرتی ہوں اپنی کم ظرفی سے اپنے اعمال کے سیاہ پلندے سے رحم فرما، اگر تو رحم فرمائے گا تو میں تیری حقیقی ایمان والی بندی بن جاؤں گی۔ اللہ تو رحم فرمانے والا معبود ہے پھر مجھ پر بھی رحم فرمائے گا۔

اب آیت مطمئن تھی اس نے سر تیمور یزدانی سے بات کرلی تھی کہ آپ میم خان کو میری بابت بریفنگ دیں پھر میں ان سے خود بات کروں گی۔

اس ویک اینڈ پر زنبیل نے آیت کو فون کیا تھا کہ میں اور امی آج تمہارے گھر آرہے ہیں تمہیں ٹاپ کرنے پر مبارکباد دینے۔ آیت کچن میں چلی آئی جہاں اماں کئی گھنٹوں سے کھپ رہی تھیں۔ ہفتہ بھر کا چکن بیف فش کو پہلے انہوں نے صاف کیا پھر بسکٹ بنائے۔ آیت گوشت کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی کیونکہ اس کی smeel سے وہ گھبراتی تھی۔ اس لیے اماں ہی یہ کام کرتی تھیں۔ اماں زنبیل کا فون آیا تھا، شام کو وہ آئے گی۔

"اچھا" اماں مصروف انداز میں بولیں۔

"کہہ رہی تھی ساتھ میں امی بھی آئیں گی۔"

"ٹھیک ہے فریج میں کیک رکھا ہے کباب بھی فریز ہوئے ہیں۔ عامر سے کہہ کر کچھ اور بھی منگوا لینا۔"

"جی اچھا" آیت منتظر تھی کہ کب پروفیسر تیمور یزدانی اماں سے بات کریں گے۔ وہ تھوڑی اس لیے بھی فکرمند تھی کہ وہ اماں کے بغیر انگلینڈ جانے والی نہیں تھی۔ وہ انہیں بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ آیت جو سوچ رہی تھی وہ اتنا آسان نہیں تھا وہ اماں کا خرچہ افورڈ کرسکتی تھی اس کی اپنی بھی خاصی سیونگ تھی اسے معلوم تھا کہ اماں اپنا سیٹ اپ چھوڑ کر جانے پر کبھی بھی آمادہ نہیں ہوں گی انہی سوچوں کے تانے بانے بنتے ہوئے وہ آج کل خاصی چپ چپ نظر

آرہی تھی۔ اللہ سے فریاد کرتی مالک اماں کو راضی کر دے، ان کے دل میں نرمی کے ساتھ یہ احساس ڈال دے کہ انہیں میرے ساتھ چلنا چاہیے۔ اس شام مغرب کی نماز کے بعد وہ اللہ پاک سے عرض کر رہی تھی۔ نماز کے بعد دس منٹ تو اس نے ضرور باتیں کرنی ہوتی تھیں اپنے اللہ کے ساتھ۔ اماں کے دل میں ڈال دیں کہ وہ میرے ساتھ چلیں۔ وہ آپ کی بات ضرور مان لیں گی۔ اماں کو وہاں اچھی جاب مل سکتی ہے۔ وہاں بہت سے اسلامی ادارے کھل چکے ہیں کالج اور یونیورسٹیز ہیں وہ اللہ پاک سے یونہی باتیں کیا کرتی تھی جیسے وہ اس کے پاس ہیں اور اسے بغور سن رہے ہیں۔ وہاں بسنے والے مسلمانوں کو ایسے ٹیچرز کی ازحد ضرورت ہے۔ میں نے کئی جگہ ان کی سی وی نیکسٹ کی ہیں ریکوئسٹ بھجوائی ہیں۔ بس میرے رب میری اماں کو منا لے، میں اماں کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی میری مدد فرما۔ رب دو جہاں آج پورے دس منٹ تک ایک ہی بات کرتی رہی تھی اپنے اللہ سے۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے ایک بار پھر پورے گھر کی جھاڑ پونچھ کی تھی۔ ٹرالی سیٹ کی۔ ٹمل کی تین مرلے زمین پر نرگس کے پھولوں کی کاشت ہوتی تھی یہ مختلف جگہوں پر مہنگے داموں فروخت کیے جاتے تھے، عامر پٹھان روزانہ چار ٹہنیاں دے جایا کرتا تھا بیکری کا سامان جب وہ مارکیٹ سے لایا تو آیت نے اس سے کہا نرگس کے پھولوں کا بکہ بنا لاؤ۔ آیت نے سامنے رکھے فلور واز میں اسے سیٹ کر دیا تھا جو انٹرنس سے کارنر میں رکھا ہوا تھا۔ شاور لینے کے بعد خود کو فریش محسوس کر رہی تھی اب وہ بالوں میں برش کر رہی تھی اس وقت وہ سلک کی ڈھیلی ڈھالی شرٹ پر بلیک چوڑی دار پاجامہ پہنے تھی۔ شرٹ میچنگ میں دوپٹہ تھا۔ دودھیا پیروں میں سیاہ چپل اچھی لگ رہی تھی۔ گاڑی کی آواز سن کر آیت اپنے کمرے سے باہر نکلی اس سے اماں دروازے تک پہنچ چکی تھیں۔ زنبیل اور اس کی اماں دروازے پر موجود تھیں وہ آیت کے لیے چند گفٹ اور مٹھائی لائی تھیں۔ ''بیٹا مبارک ہو صوبہ بھر میں ٹاپ کرنے پر۔'' ''تھینک یو آنٹی وہ لوگ بیٹھ چکی تھیں'' ''یار آیت تم نے تو ہم سب کا نام روشن کر دیا ہے۔'' زنبیل اسے دوبارہ گلے لگا کر بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔

''محبت ہے آپ سب کی۔''

''ابو بھی کہہ رہے تھے اس بچی نے پورے میانوالی کا نام روشن کر دیا ہے۔''

''یہ سب اللہ نے کروایا ہے ورنہ میں کس قابل۔'' زنبیل کی والدہ رخسانہ اماں سے بار بار اس کی تعریف کر رہی تھیں اللہ ایسے لائق بچے سب کو دے چائے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں آیت تمہارے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں ان خواتین کو باتیں کرنے دو۔'' زنبیل نے معنی خیزی سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

''ہاں جی! آگے کیا پروگرام ہے۔''

''انگلینڈ جا رہی ہوں۔''

''واٹ ریئلی۔'' زنبیل کی آواز پرشوق تھی۔

''یس اسکالرشپ پر۔''

''واؤ ڈبل مبارک کب جا رہی ہو؟''

''ویزہ آنے کی دیر ہے۔''

''آیت یار تمہارے تو مزے ہیں۔ وہاں تم کتنا مزہ کرو گی۔'' زنبیل کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

زنبیل بی بی میں وہاں انجوائے کرنے نہیں پڑھنے جا رہی ہوں۔''

''وہی ناں!''

''ہاں ہاں زنبیل سنو اماں سے ذکر نہیں کرنا انہیں میں نے ابھی نہیں بتایا میں انہیں اچانک سرپرائز دوں گی۔''

''آیت ہمیں ایک سرپرائز تمہیں بھی دینا ہے۔''

''بھئی وہ کیا؟''

''بتا دوں؟'' زنبیل شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں تو بتا دو۔'' آیت نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے زنبیل کو گھورا۔

''واقعی تم نہیں جانتیں؟ آیت یار جان بوجھ کر کیوں انجان بن رہی ہو۔''

''زنبیل میں کیسے جان پاؤں گی جب تک تم مجھے بتاؤ گی نہیں۔''

''چلو تمہارا سسپنس ختم کرتی ہوں۔ ہم روحیل بھائی کے لیے تمہیں پروپوز کرنے آئے ہیں۔''

''کیا؟'' وہ شاکڈ رہ گئی جیسے بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔

''ہاں بھئی میں اور امی بڑی امیدیں لے کر آئے ہیں۔ روحیل بھائی نے جب سے تمہیں دیکھا ہے دیوانے ہو گئے ہیں تمہارے کب سے امی کی خوشامد کر رہے تھے کہ آپ میرا پروپوزل لے کر جائیں۔''

آیت ساکت تھی۔ زنبیل نے اس کا کندھا چھوا۔ آیت کو یوں حیران و پریشان دیکھ کر زنبیل گھبرا گئی تھی۔

''آیت پلیز کچھ بولو اینی پرابلم؟''

''میں ٹھیک ہوں اس نے زنبیل کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔

''آیت تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟''

''زنبیل ایسی کوئی بات نہیں۔''

''پھر تم خاموش کیوں ہو؟''

''بھئی جو فیصلہ کرنا ہے اماں نے کرنا ہے۔''

''تمہاری بھی کوئی رائے ہو گی کیا تم کہیں اور انٹرسٹڈ ہو؟''

''نہیں زنبیل ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''پھر تم نے کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا؟'' اب کی بار آیت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''آیت تم اس بات کو لے کر ڈسٹرب ہو کہ تمہیں باہر پڑھنے کے لیے جانا ہے۔ تم ضرور جاؤ روحیل بھائی بھی پڑھ رہے ہیں تم اپنی اسٹڈی کمپلیٹ کر لو بس بات پکی ہو جائے جب تک تم واپس آؤ گی تب تک روحیل بھائی کی جاب وغیرہ بھی ہو جائے گی وہ اپنا فیوچر بنا لیں تب ہی شادی ہو گی ناں۔''

''زنبیل میں تمہیں بتا رہی ہوں نا آخری فیصلہ اماں نے ہی کرنا ہے۔'' آیت اس ٹاپک سے کترا رہی تھی۔ رخسانہ کے بلانے پر جب وہ دونوں لاؤنج میں آئیں تو ان کا چہرہ آیت نے مطمئن پایا شاید اماں نے انہیں خوب تسلی دی تھی۔ ''یہ چاند ہمارے گھر میں اترے تو ہمیں اور کیا چاہیے۔'' آیت کا ماتھا چومتے ہوئے رخسانہ خان گویا ہوئیں۔ اماں زیر لب مسکرائیں اماں کی مسکراہٹ نے آیت کے چہرے کی سنجیدگی میں تناؤ بھر دیا تھا۔ عظمٰی امید کرتی ہوں آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گی، خدا کرے یہ ہیرا ہمارے مقدر میں ہو۔'' ان لوگوں کے جانے کے بعد آیت اپنے کمرے میں آ گئی تھی، اس کا وضو تھا وہ عشا کی نماز پڑھنے لگی۔ جب وہ نماز سے فارغ ہو کر لاؤنج میں آئی تو اماں لیپ ٹاپ پر آنے والی چند ای میل چیک کر رہی تھیں ''آیت نماز پڑھ لی۔'' اماں کے لہجے میں تازگی تھی۔ ''جی پڑھ لی''۔ وہ ڈسٹرب تھی اس کی آواز بوجھل تھی۔ آنکھیں بھی تھکان آمیز کیے ہوئے تھیں۔ وہ بیٹھتے ہوئے ٹی وی دیکھنے لگی۔ بلاوجہ چینل سرچ کر رہی تھی کہیں بھی اسے دلچسپی محسوس نہ ہوئی۔ اماں پندرہ منٹ بعد لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔ آیت تم نے کھول کر دیکھے نہیں زنبیل کے لائے گفٹ؟ مٹھائی تو میں نے فریج میں رکھ دی ہے

ذرا ادھر تو لاؤ دیکھیں تو سہی۔'' اماں خاصی خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

اس نے تمام گفٹ اماں کی جانب سرکا دیے۔ بہترین کوالٹی کے تین جوڑے تھے۔

''اماں آپ نے انہیں منع نہیں کیا؟ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔'' بیٹا میں نے کہا تھا اب واپس تو نہیں کر سکتے تھے ناں اتنی محبت سے وہ لائی ہیں۔

''آیت۔''

''جی!'' خداوند مومنوں کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ ارشاد باری قرآن میں ہے۔

آیت نے پوچھا آپ یہ تمہید کیوں باندھ رہی ہیں

''آیت زنبیل خوشحال لوگ ہیں اچھی فیملی سے بلونگ کرتے ہیں۔ روحیل خان سے میں مل چکی ہوں ڈیشنگ پرسنالٹی کا مالک ہے اچھا لڑکا ہے۔''

''اماں آپ کو کیسے پتہ اچھا لڑکا ہے وہ؟''

''میں اس سے ملی ہوں۔''

''اماں ایک بار کسی سے مل لینے سے اس کے بارے میں پتہ تھوڑی لگ جاتا ہے۔''

''بیٹا ہم اچھی طرح چھان بین کے بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔''

''اماں یقیناً وہ اچھا ہوگا لیکن میرے لیے پڑھائی سب سے زیادہ اہم ہے مجھے ابھی بہت پڑھنا ہے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا میرا خواب ہے۔''

''بیٹا میں ابھی تمہاری شادی تھوڑی کر رہی ہوں دو سال میں تمہارا ایم فل ہو جائے گا ابھی تو وہ بھی پڑھ رہا ہے۔''

''اماں مجھے ابھی شادی نہیں کرنی آپ ان لوگوں کو منع کر دیں۔''

''آیت کیا کہہ رہی ہو بیٹا اچھے رشتے بار بار نہیں آتے۔''

''اماں آپ خود تو کہتی ہیں اللہ کے فیصلے بہترین ہوتے ہیں۔ ہر کام وقت مقررہ پر ہوتا ہے اللہ کے حکم سے'' ہاں میں کہتی ہوں یہی مناسب وقت ہے اور ممکن ہے اسی میں ہماری بہتری ہو اس لیے تو اتنی جلدی تمہارا رشتہ آ گیا۔''

''اماں مجھے ابھی پڑھنا ہے اور اللہ پاک کو بھی میں نے عرضی ڈالی ہوئی ہے کہ مجھے علم کی بہت ساری دولت عطا فرما دیں کہ میں وہ دولت آگے اللہ کی مخلوق میں لوٹا سکوں۔ اماں پلیز آپ مجھے کسی قسم کی ٹینشن نہ دیں۔ میں تمام فوکس صرف اپنی اسٹڈی پر رکھنا چاہتی ہوں پلیز اماں۔'' عظمیٰ خان گہری سنجیدگی میں جا چکی تھیں۔

''میری اچھی اماں!'' اس نے ہمیشہ کی طرح ان کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگائے اور ان کے گلے میں بانہیں پرو دیں۔ انہوں نے آیت کی پیشانی کا بوسہ لیا لیکن مسکرائیں پھر بھی نہیں۔

''اچھا ناں اماں میں پھلکے بناتی ہوں پھر مل کر کھانا کھاتے ہیں۔'' اس وقت عظمیٰ خان گہری سوچوں میں غلطاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ کچن میں گئی تو کچن صاف ستھرا ملا۔ شام کو استعمال ہونے والے تمام برتن اماں نے دھو کر سمیٹ دیے تھے۔

''اماں آپ کمال کرتی ہیں میں دھو لیتی برتن ایسے ہی تھکی رہتی ہیں آپ نہ کیا کریں کچن کا کام'' وہ فریج سے آٹا نکالتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی۔ شیشے کا باول جس میں دال گوشت کا سالن تھا مائیکرو ویو میں رکھا اور پھلکے بنانے لگی۔ پھلکے بناتے ہوئے سوچ رہی تھی پروفیسر تیمور یزدانی نے اماں سے بات نہیں کی ہوگی ورنہ وہ مجھ سے ذکر ضرور کرتیں۔ جانے اماں کا کیا ردعمل ہوگا اس بات کی اسے تشویش تھی۔ میں اماں کو ضرور منا لوں گی۔ بریڈ فورڈ یونیورسٹی کے ایم فل کے پہلے سمسٹر شروع ہونے میں ابھی دو ماہ تھے ٹائم بہت کم تھا اس کے پاس، اگر پندرہ بیس دن تک ویزہ کی کلیرنس ہوگی تو اسے فوراً جانا ہوگا آیت پر عجیب سی گھبراہٹ طاری تھی، روٹی توے پر ڈالنے کے بعد اس نے پروفیسر تیمور کو میسج کیا'' سر پلیز آپ پروفیسر عظمیٰ خان سے جلدی بات کریں۔'' تھوڑی دیر بعد ان کا جواب آیا تھا۔ کل ان سے بات کروں گا اس نے شکر ادا کیا دل کو قدرے سکون ملا۔ اماں کافی دیر سے سوچوں کی تھاہ گہرائیوں میں گم تھیں۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی، اس نے شانے اچکائے آگے ڈھلک آنے والی قیص کو دوبارہ فولڈ کیا بھنویں ہلکے سے کھچائیں اور سنک میں ہاتھ دھونے لگی۔ خوامخواہ شادی کا ڈھول گلے میں نہیں ڈال سکتی ناں۔ اللہ جی آپ سے تو میری بات ہو چکی ہے ناں ہر وقت وہ اللہ پاک سے مشورہ کرتی رہتی تھی۔ تنہائی میں وہ صرف باتیں اپنے رب دوجہاں سے کرتی تھی، اپنا ہر مسئلہ اس کے سامنے رکھتی تھی اس انداز سے پکارتی جیسے اللہ اس کے پاس موجود ہے۔ اسے پتہ بھی نہ چلا وہ اس کی شہ رگ سے بھی نزدیک ترین ہو گیا۔ وہ محسوس کرتی تھی اسے یقین کامل تھا اللہ پاک اس کی شہ رگ سے بھی قریب تر آ چکا ہے۔ اس کے رحیم نے یہ آگہی خود ہی تو اسے عطا کی تھی۔ اس کی بندگی اس کی عبادت صداقت سچے دل کی گہرائیوں سے اس کی وحدانیت کا اعتراف وہ محسوس کرتی تھی اس کا دل کیسے بدل دیا تھا، خدا تعالیٰ نے اسے بھروسہ تھا اپنے پیدا کرنے والے پر کہ اس مالک یوم الدین کا ایک دن میرے لیے حکم آئے گا اقرا۔ اقرا جب میرے اندر باہر کن فیکون کی بازگشتیں برپا ہو جائیں گی کیونکہ جب وہ کن فرماتا ہے تو ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ اس رب کل نے اسے اپنی طرف رجوع کر لیا ورنہ وہ گھاٹے میں چلی جاتی کہیں کی نہ رہتی۔ اس نے کرم کر دیا میرے جیسی بے نمازی پر مجھے ہدایت دے دی۔ اس کا دل چاہتا چیخ چیخ کر کہے کوئی ہے اسے سچائی سے پکارنے والا۔ وہ دور نہیں ہے تمہارے روم روم میں براجمان ہے، بس اسے تلاش کر لو جو تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہے، وہ اللہ ہے اے اللہ کی مخلوق سنبھل جاؤ۔ اب تمہارے پاس وقت اور موقع ہے پھر یہ دونوں چیزیں تمہاری زندگی سے ناپید ہو جائیں گی اس وقت کوئی تمہارا مددگار نہیں بنے گا۔ سفارشی نہیں ہوگا، اس رب عرش سے معافی مانگ لو، وہ اپنے بندوں کو معاف کر دے گا، صرف ایک اللہ اور اس کے رسولؐ کے ماننے والے بن جاؤ اس کا دل چاہتا یہ آواز دنیا کے تمام جن و انسان سن لیں، تمام جاندار سن لیں اور وہ اس رب کی تسبیح شروع کر دیں پہلے دل میں رب کا ذکر تواتر سے وہ ذکر ہے لا الہٰ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ اللہ جب بندے کے اندر کی گہرائیوں میں روم روم میں سرائیت کر جاتا ہے پھر بندے کے اندر باہر اللہ ہی اللہ بولتا ہے پھر خود بخود اس رب کے عطا کردہ سجود کی طرف کھنچا چلا آتا ہے، مومن وہ جس نے اللہ کو ڈھونڈا۔ سیاہ مہیب رات کے اندھیروں میں ہماری دنیاوی ضروریات تو دن کی روشنی کی محتاج ہیں لیکن اللہ کو پاتے ہیں گھمبیرتا سیاہی آمیز رات کے پچھلے پہروں میں۔ پانچ نمازیں امت مسلمہ پر فرض ہوئیں کیا ہم پانچ نمازیں بھی نہیں پڑھ سکتے۔ آیت خود سے لڑتی۔ میں غافل تھی میرے رب تو نے مجھے ہدایت دے دی، میں تیری احسان مند ہوں، مجھے بھی تہجد گزاروں میں شامل کر لے۔ اب عظمیٰ خان کو کہنا نہیں پڑتا تھا کہ آیت اللہ سے اپنے لیے ہدایت مانگا کرو۔ وہ اپنے رب سے اپنے لیے ہدایت مانگتی رہتی تھی۔ ''میرے رب مجھے ہدایت پانے والوں میں شمار کر لے۔ مجھے مومنین کے گروہ کا حصہ بنا دے میں ہدایت پانے والوں میں ہو جاؤں۔'' وہ اکثر باری تعالیٰ سے

التجائیں کرتی مجھے تہجد گزار لوگوں کی فہرست میں شمار کرلے۔

اس دن پروفیسر تیمور یزدانی نے میڈم عظمیٰ کو میٹنگ روم میں بلایا تھا اس وقت عظمیٰ خان ان کے سامنے براجمان تھیں۔ پروفیسر عظمیٰ خان آپ کے لیے گڈ نیوز ہے۔ عظمیٰ خان نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ آپ کی بیٹی آیت خان کو اسکالرشپ کی آفر ملی ہے۔ وہ قدرے حیران ہوئیں یہ بات تو ان کے لیے نئی تو نہیں تھی۔ آیت فرسٹ ائیر سے اسکالر شپ لے رہی تھی۔ بریڈفورڈ شائر یونیورسٹی میں آیت خان کا نام او کے ہوگیا ہے۔ بریڈفورڈ شائر یونیورسٹی...... عظمیٰ خان کو یقین نہیں آرہا تھا ''جی چار بچے ٹمل سے سلیکٹ ہوئے ہیں۔'' وہ دل میں سوچ رہی تھی آیت نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا۔ انہیں خاموش دیکھ کر وہ گویا ہوئے آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟ پروفیسر تیمور مجھے بہت خوشی ہوئی ہے پروفیسر عظمیٰ خان آپ کو مبارکباد دوں گا آپ کی بیٹی بہت لائق ہے وہ انشاءاللہ پاکستان کا نام روشن کرے گی۔ انشاءاللہ۔

''ابھی دو مہینے ہیں وہاں ایڈمیشن ہونے میں۔ آپ پاسپورٹ وغیرہ بنوالیں ویزہ ٹکٹ وغیرہ انگلینڈ کی ایمبیسی ارینج کرے گی۔ باقی ڈیٹیل ٹمل کے ڈین مسٹر ملک نے چاروں اسٹوڈنٹس کو دے دی ہیں، ہم کنٹیکٹ میں رہیں گے۔''

''تھینکس پروفیسر تیمور!'' عظمیٰ خان زیادہ نہیں بول رہی تھیں وہ نارمل دکھائی دے رہی تھیں۔ کیا وہ خوش تھیں وہ خود نہیں جان پارہی تھیں۔ ماں والی فکر انہیں لاحق تھی، اکیلی کیسے رہے گی غیروں کی سرزمین پر، جانتی تھیں ان کی بیٹی میں بھرپور اعتماد ہے، یہ بھی سمجھ رہی تھیں اسٹڈی کی وجہ سے ہی اتنے بہترین پروپوزل کو اس نے ریجکیٹ کیا ہے۔ اکثر باتوں میں وہ آیت سے کہا کرتی تھی ''اماں میرے لیے دعا کریں مجھے اسکالرشپ مل جائے باہر جانے کے لیے۔'' وہ جواب دیتیں ''بیٹا پاکستان میں معیار تعلیم بھی بیسٹ ہے یہاں رہ کر بھی تم پوزیشن ہولڈر رہی ہوناں۔'' ''اماں باہر کی ڈگری کی ویلیوز زیادہ ہے، ان کا معیار ہم سے بہت بہتر ہے آپ میرے لیے دعا کریں گی ناں۔'' وہ ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہلاتی۔ عظمیٰ خان مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتیں۔ اماں کو کتنے وہم تھے، شاید وہ اپنی تنہائی اپنے اکیلے پن کی بابت تمام وسوسے دل میں لیے بیٹھی تھیں، ان کی زندگی کے بامقصد ہونے کی وجہ صرف آیت تھی ورنہ ان کی لائف ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہوتی کیا میں آیت سے دو سال کی دوری برداشت کرلوں گی، وہاں سمسٹر تو بہت طویل ہوتے ہیں۔ آیت اس وقت اماں کے کالج سے لوٹنے کا انتظار کررہی تھی۔

اس نے آج کڑھی چاول بنائے تھے

''السلام علیکم اماں۔'' دروازہ کھولتے ہوئے اس نے پرتپاک انداز میں انہیں سلام کیا۔ ''وعلیکم سلام''۔ انہوں نے مسکرا کر آیت کی طرف دیکھا۔ وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گئیں تو آیت جلدی سے ان کے لیے پانی لے کر آگئی۔ ''بیٹھو میرے پاس۔'' وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ''آیت تم نے اتنی بڑی گڈ نیوز مجھ سے چھپائی۔'' انہوں نے اس کا ماتھا چوما ''اماں میں آپ کو سرپرائز دینا چاہتی تھی آپ خوش ہیں ناں۔''

''جس کی اتنی لائق بیٹی ہو وہ بھلا کیسے خوش نہیں ہوگی۔'' اماں محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ کچھ تفکرات بھی ہنوز تھے، ان کے چہرے پر

''اماں کوئی پریشانی ہے؟''

''نہیں میری جان بھلا پریشانی کیوں ہوگی۔''

آیت اس قدر خوش تھی پھر وہ اپنی فکرمندی اس پر ظاہر کیوں کرتیں۔ وہ خوش تھیں کہ ان کی محنت رنگ لائی ہے انہیں فخر تھا اس لڑکی پر جس کو انہوں نے جنم نہیں دیا تھا لیکن وہ انہیں اولاد سے بڑھ کر پیاری تھی۔ ''اماں میں نے کڑھی چاول بنائے ہیں آپ فریش ہوجائیں میں کھانا نکالتی ہوں۔'' عظمیٰ خان کو بھوک نہیں تھی۔ آیت انگلینڈ جارہی ہے یہ سن کر اب کیسے انہیں بھوک لگ سکتی تھی۔ وہ ڈسٹرب تھیں لیکن آیت کے سامنے کمپوزڈ دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ آیت کے لیے ڈسٹرب تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ اس کی پروٹیکشن چاہی تھی کہ وہ ایک عورت کے علاوہ ایک ماں بھی تھیں۔ ہزاروں میل دور غیر کے دیس میں تنہا، وہ تو آج تک ایک رات بھی ان سے الگ نہیں رہی تھی۔ سوچتی اس آزاد ماحول میں کیسے ایڈجسٹ کرے گی۔ وہ اپسیٹ تھیں لیکن آیت پر ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھیں۔ ''ہاں میں چینج کر کے آتی ہوں۔'' عظمیٰ خان بلاوجہ مسکرائیں۔ اس وقت بھی ان کے لہجے میں گداز تھا لیکن آج اس گداز پن میں فکرمندی کی جھلک بھی شامل تھی۔ فی الفور تو انہیں اس کی خوشی سیلیبریٹ کرنا تھی، آیت کس قدر خوش نظر آرہی تھی اس کا خواب تھا اپنی زندگی کو نہایت ایمانداری سے کامیاب بنانا باپ بھائی کا تحفظ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھ چکی تھی۔ وہ دن بہت قریب تھا جب آیت خان ایک کامیاب شخصیت کے طور پر ان کے سامنے آنے والی تھی۔ خوفزدگی کے پہراب اس کی زندگی سے خارج ہوچکے تھے۔ جس دن سے اس نے اللہ تعالیٰ سے گلے شکوے کرنے چھوڑے تھے اس کی زیست سہل ہوگئی تھی۔ بچپن میں اس نے اسپائیڈر مین کے کارٹون بہت دیکھے تھے، دیوانی تو وہ سنڈریلا کے کارٹونز کی بھی تھی جس میں سنڈریلا کی سوتیلی ماں اس پر بہت ظلم کرتی تھی پھر اس کی زندگی میں ایک شہزادہ آیا جس نے سنڈریلا کی تمام تکالیف دور کردی تھیں لیکن آیت کی زندگی میں قطعی کوئی ایسا شہزادہ نہیں تھا اسے تو بس ہر لمحہ یہی خبط رہتا اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہے۔ اس کی نیلی آنکھوں کی پتلیوں میں ہر پل امیدوں کے جگنو روشن رہتے جنہیں ہر صورت اس نے روشن ہی رکھنا تھا اگر وہ اپنی سوچوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکی تو وہ ایک دم سے خود کو معذور و ناکارہ سمجھنے لگے گی۔ مایوسیوں کے ریلوں کی نذر وہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ ایسا بے ثبات کوئی ریلا اپنے نزدیک نہیں آنے دینا چاہتی تھی وہ دن میں انگنت بار خود کو ریمائنڈ کراتی۔ اس روز لاؤنج میں بیٹھے ہوئے عظمیٰ خان آیت سے کہہ رہی تھیں اپنے ابا کو بتادو کہ تم نے ٹاپ کیا ہے۔ اماں کیا انہیں ابھی تک پتہ نہیں چلا ہوگا۔ نیٹ پر سب کچھ آجاتا ہے۔ یقیناً وہ جان چکے ہوں گے۔ انہیں مجھے فون کرنا چاہیے تھا اگر انہیں میری پروا نہیں ہے تو مجھے بھی اب ان کی پروا نہیں ہے آیت کوئی بات نہیں تم انہیں فون کرلو۔

''نہیں اماں۔''

''اچھا میں انہیں فون کرکے بتادوں گی۔'' اس دن شام کو خود ہی اولیس خان کا فون آگیا تھا آیت کے سیل نمبر پر۔

''آیت کیسی ہو میری جان۔'' ان کی آواز کی پور پور میں کھنکتی خوشی چھلک رہی تھی۔

''الحمدللہ بہت اچھی ہوں۔'' جب سے آیت نے اللہ پاک کو اپنے بیحد نزدیک محسوس کیا تھا تب سے اس کا غصہ ختم ہوگیا تھا کیونکہ غصہ جائز نہیں ہے پھر اس نے تو اللہ کا حکم ہر صورت ماننا تھا۔

''ابا انعم اور شہرام کیسے ہیں، ان کی امی کا کیا حال ہے؟'' اولیس خان شاکڈ رہ گئے۔ آئی ڈونٹ بلیو اٹ وہ آہستگی سے بڑبڑائے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے۔ آج ان کی بیٹی نے ان کے ساتھ کھور پن کا

اظہار نہیں کیا اپنی بیزاری ناپسندیدگی نہیں جتائی۔
''تمہارے بھائی نے نیٹ پر تمہارے بارے میں جانا ہے۔ میں بہت خوش ہوں بیٹا تم میری خوشی کا اندازہ نہیں کرسکتی۔''
''مجھے اندازہ ہے آپ کی آواز آپ کی خوشی محسوس کرا رہی ہے۔ وہ تحمل سے متانت بھرے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔
''اب آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''
''اسکالرشپ پر انگلینڈ جارہی ہوں بریڈفورڈ شائر یونیورسٹی میں۔''
''گڈ میری بیٹی نے میرا نام روشن کردیا۔'' وہ ملال سے مسکرائی دل تو چاہا کہہ دے آپ کا بیٹا آپ کا نام روشن کرے گا مجھے تو پیدائش کے وقت سے ہی منحوس کے لقب سے نواز دیا گیا تھا اسے قرآن پاک کی ایک سورۃ یاد آئی اللہ صبر کرنے والوں اور صبر کرنے والیوں کو پسند فرماتا ہے۔ اور اس کا انہیں اچھا صلہ ملے گا۔'' وہ باپ سے بدلحاظی نہیں کرنا چاہتی تھی اویس خان کا دل چاہ رہا تھا پوچھیں کس بات نے تمہیں یوں بدل دیا وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ دلوں کو بدلنے والا اللہ ہے جب وہ کن کہتا ہے تو سب ناممکن ممکن ہوجاتا ہے۔ آیت وہاں تمہارے ذاتی اخراجات بھی تو ہوں گے۔''
''جی ہوں گے یونیورسٹی صرف تعلیمی اخراجات اٹھائے گی۔''
اچھا'' وہ کچھ سوچنے لگے تھے'' ابا آپ فکر نہ کریں میں خود انشاء اللہ کچھ نہ کچھ کرلوں گی۔ بھلا میں نے کیا کرنا ہے کرنے والی ذات تو عزوجل شانہ کی ہے اس نے انگلی سے گال کھجایا۔ اس کے ہر جملے میں یقین و بھروسہ تھا۔
''بیشک آیت تم درست کہہ رہی ہو میں تمہارا ذاتی خرچہ اٹھاؤں گا تم فکر نہیں کرو۔''

''ابا جب سے مجھے اللہ ملا ہے میں نے فکر کرنی چھوڑ دی ہے۔ آپ تکلیف نہ کریں میں خود کچھ نہ کچھ کرلوں گی میں اور اماں اپنا بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔''
''عظمیٰ پاکستان میں اکیلی رہے گی؟''
''اماں میرے ساتھ جائیں گی۔''
''اچھا لیکن وہ کیسے جاسکتی ہے؟''
''جیسے سب لوگ باہر جاتے ہیں۔'' وہ مختصراً جواب دے کر ہر بات میں اویس خان کو لاجواب کررہی تھی۔
''اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ پرسوچ آواز میں بولے۔
''اماں کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم ہے کہ وہ باآسانی جاسکتی ہیں۔''
''اب مجھے تسلی رہے گی اگر تم اکیلی جاتیں تو مجھے بہت فکر رہتی۔''
''ابا میں تو بیس سال سے ایسے ہی رہ رہی ہوں۔'' آیت کی اس بات پر وہ شرمندہ ہوگئے تھے۔ آیت نپے تلے جملوں میں بات کررہی تھی۔
باپ بھائی والے رشتے ہمیشہ میری زندگی سے کشیدہ رہے۔ لیکن میری ماں ہے جس نے اپنی سانسوں کی گرمی سے مجھے پروان چڑھایا جب تک میری ماں کے ہاتھ میرے لیے دعا کے لیے اٹھے رہیں گے مجھے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''
''بیٹا تم ٹھیک کہہ رہی ہو تمہارا ویزہ آگیا؟''
''آنے والا ہے۔ اماں کے ویزے کے لیے بھی برطانیہ میں ریکویسٹ دی ہے ان کے تمام ڈاکومنٹس کے ساتھ امید ہے جلد وہاں کی حکومت اماں کا ویزہ جاری کردے گی آج زندگی میں پہلی بار آیت نے اویس خان سے اتنی تفصیلی بات کی تھی ابھی تک آیت نے اماں سے بات نہیں کی تھی کہ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے اس کا ارادہ تھا آج رات اماں سے ضرور بات کرے گی انہیں منانا اس

کے لیے مشکل لگ رہا تھا مگر ناممکن نہیں۔ اپنے ہی سوال کا اس نے خود جواب دیا تھا باپ سے بات کرکے آیت کو اچھا لگا تھا۔ ہمیشہ وہ اسے بھاری اماؤنٹ بھجواتے رہتے تھے اسے مس بھی کرتے ہوں گے آخر وہ ان کی اولاد تھی ان کی محبوب بیوی کی نشانی۔ بعض اوقات مصلحتوں کے رنگ زندگی کے کینوس پر مجبوراً یا خودفریبی میں مبتلا ہونے کے لیے سجانے پڑتے ہیں شاید ابا کی بھی مجبوریاں ہوں گی۔ ایک بارگی اس کے ذہن نے اسے یاد کرایا، درگزر کرنے والوں کا بڑا اجر و ثواب ہے اللہ کی بارگاہ میں۔ ممکن ہے ابا کی بیوی مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ نہ ہوئی ہوں تبھی تو ابا نے مجھے اپنے ساتھ امریکہ لے جانے کی بات کبھی نہیں کی۔ ابا یقیناً میری طرف سے مطمئن ہوں گے کہ اماں سگی ماں سے بڑھ کر مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ پہلے وہ صرف اپنے بارے میں سوچا کرتی تھی خود کو حق بجانب تصور کرتی تھی دوسروں کی زندگیوں میں کیا معاملات ہیں اس نے سمجھنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ اب وہ ابا کے بارے میں بھی سوچنے لگی تھی۔ رات کو عشا کی نماز اور پھر کھانے سے فارغ ہوکر وہ اور اماں اپنے گھر کے سامنے بنے لان میں واک کررہی تھیں۔ اس نے فون آف کررکھا تھا۔ رسمی چند باتوں کے بعد وہ اصل مدعا کی طرف آئی تھی۔ ''اماں''۔ ''ہوں''۔
''میں سوچتی ہوں کہ وہاں میں آپ کے بغیر کیسے رہ سکوں گی؟''
''بیٹا رہنا تو پڑے گا چند سالوں کی تو بات ہے۔'' عظمیٰ خان کا دل نہیں مان رہا تھا کہ آیت انگلینڈ جائے ان کا خیال تھا کہ اپنے ملک میں رہ کر بھی تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے لیکن آیت کی خوشی دیکھتے ہوئے وہ خاموش تھیں تمام وسوسے دل سے نکال کر اسے اللہ کے سپرد کردیا تھا'' بیٹا تم پڑھائی میں مصروف ہوجاؤ گی تو پھر تمہیں فرصت ہی نہیں ملے گی میرے لیے اداس ہونے کی۔''
''اماں میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں۔'' وہ ٹھٹھک کر رکتے ہوئے بولی تھی۔
''ہاں میں جانتی ہوں۔'' اب وہ اپنے دائیں بازو پر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سرسرا رہی تھی وہ اس وقت قدرے فکرمند اور اداس دکھائی دے رہی تھی اس کی نیلی آنکھوں میں دھندلے عکس ہلکورے لے رہے تھے اور اس کی ناک میں ڈائمنڈ کی ننھی سی نوز پن دمک رہی تھی جو اس کے دیز سراپے کو چار چاند لگا رہی تھی۔ اماں نے رکتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا'' ہم روزانہ فیس بک پر باتیں کیا کریں گے۔ میں تمہیں فون بھی کیا کروں گی۔''
''فون تو آپ کبھی کبھار کریں گی ناں تب میں تو آپ کے لیے اداس رہوں گی ناں اماں ایک حل ہے میرے پاس۔''
''کیا؟'' وہ دونوں ایک سنگی بینچ پر بیٹھ چکی تھیں۔ ان سے قدرے فاصلے پر ہوسٹل کی چند لڑکیاں بھی واک کرتی خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔
''آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔'' آیت نے جیسے دھماکہ کردیا۔
''واٹ!'' انہوں نے اپنا پورا رخ آیت کی طرف موڑ لیا تھا۔
''آیت!'' اماں نے آواز کو کھینچ کر اسے پکارا تھا۔ اس نے اماں کی جانب مسکرا کر دیکھا'' تم اسٹوڈنٹ ویزے پر پڑھنے جارہی ہو میں کیسے تمہارے ساتھ جاسکتی ہوں؟''
''کیوں نہیں جاسکتیں آپ پہلے میری بات تو سنیں۔'' عظمیٰ خان کی توجہ اس کی جانب تھی۔
''آپ اپنے خرچے پر جائیں گی۔''
''آیت فضول بات نہیں کرو۔''

''اماں اگر آپ ٹکٹ وغیرہ افورڈ نہیں کرسکتیں تو میرے اکاؤنٹ میں خاصی رقم ہے۔''

''بیٹا تم تو پڑھائی کے لیے جارہی ہو میں وہاں کیا کروں گی؟''

''آپ وہاں جاب کرنا۔''

''اور یہاں جو فل پیکیج جاب ہے میری؟''

''یہاں سے فی الحال ایک سال کی چھٹی لے لیں۔''

''بیٹا یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا سمجھ رہی ہو۔ تم ابھی بچی ہو۔'' اماں بندہ ہمت کرے تو کچھ ناممکن نہیں ہے مدد تو اللہ پاک کرتا ہے۔'' وہ بغور اماں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے عظمیٰ خان کا کاندھا نرمی سے دبا رہی تھی۔'' آیت مجھے مزید امتحان و الجھنوں میں مت ڈالو۔''

ان کے دھیمے لہجے سے صاف محسوس ہورہا تھا کہ وہ یہاں سے جانے والی نہیں ہیں۔'' اماں اللہ پاک سب اچھا کرے گا اور کوئی پرابلم نہیں ہوگی بس آپ کو میرے ساتھ جانا ہوگا۔ اب وہ ضدی بچے کی طرح ان کا کاندھا ہلا رہی تھی۔ یکبارگی اس کی نیلی آنکھوں میں اداسیاں امڈنے لگی تھیں۔'' یہاں میری جاب ہے پورا سیٹ اپ ہے۔'' آپ ایک سال کی چھٹی پر تو جاسکتی ہیں۔'' آیت میں یہاں آرام سے ہوں خوش ہوں مطمئن ہیں اس سے زیادہ کی مجھے طلب نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر میں بھی نہیں جاؤں گی۔ ابھی تک تو میں آپ کی انگلی پکڑ کر چلتی ہوں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''بیٹا ضد نہیں کرو اللہ پاک تمہیں کامیاب کرے۔''

''کہہ دیا تو بس کہہ دیا۔'' آیت روہانسی ہوگئی۔ آواز رندھ رہی تھی اس سے پہلے کہ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر گالوں پر پھیل آتے اس نے چہرہ دوسری طرف کرلیا اماں کم روشنی میں بھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز دیکھ چکی تھیں۔

وہ آج اماں کی خاطر روئی تھی جبکہ اماں نے کبھی اسے رونے کا موقع نہیں دیا تھا اس وقت صرف ان کی وجہ سے ان کی بیٹی روئی تھی۔ آخر وہ کیسے یہاں سے جاسکتی تھیں نئی جگہ نئے لوگ الگ کلچر۔

''اماں سوری آپ کی اجازت کے بغیر میں نے آپ کے ویزے کے لیے برطانیہ ایمبیسی اسلام آباد اپلائی کیا تھا ٹھیک ہے میں انہیں منع کردوں گی۔''

''آیت'' عظمیٰ خان اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھیں ان کے ہاتھ ٹھنڈے ہورہے تھے یہ اس قدر شدت پسند لڑکی ہے۔ وہ ہول اٹھیں اپنی جگہ سے ہل نہ پائیں۔

ایک اسلامک یونیورسٹی میں آپ کی جاب ارینج کرلی جائے گی سرچ کرنے کے دوران وہاں کی دو لڑکیوں سے میری تفصیلی گپ شپ چلتی ہے۔ آیت کی تمام تر توجہ اماں کی طرف تھی وہ بغور اس کی باتیں سن رہی تھیں اماں کے ہاتھ میں تھمی تسبیح کے ایک منکے پر بدستور ان کی انگلی جمی ہوئی تھی۔

''ایک لڑکی ایرانی ہے دوسری ترکی سے ہے 'وہاں مسلم کیمونٹی نے اقرا دارالسلام کے نام سے ایک یونیورسٹی قائم کی ہے آپ کی سی وی میں نے انہیں ای میل کردی ہے، وہ بہت خوش ہیں بقول ان کے یورپ کی ریاستوں میں ایسے ہی لوگوں کی اشد ضرورت ہے۔ پلیز میری ماں۔ آیت کی آواز میں بے حد درد اور التجائیں تھیں۔ اس کی نیلی آنکھیں گلابی ڈوروں سے بھر رہی تھیں۔ بھینچے ہوئے ہونٹوں پر ضبط کے احکام باندھ رکھے تھے تب بھی ان پر لرزش طاری تھی۔ آیت نے اماں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اماں میں سچ کہہ رہی ہوں اگر آپ میرے ساتھ نہیں چلیں گی تو میں بھی اپنا پروگرام کینسل کردوں گی۔ عظمیٰ خان اپنی جگہ پر ساکت رہ گئیں وہ آیت کی ضد سے بخوبی واقف تھیں۔ آیت میں نے خود کو تمام عمر تین گز کی چادر میں لپیٹے رکھا اب تم اصرار کررہی ہو کہ میں انگریزوں کے ملک میں تمہارے ساتھ چلوں، بیٹا میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے لیکن اپنی روایات ان کی ویلیوز کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔'' اماں کون کہتا ہے آپ ایسا کریں آپ وہاں بھی اسی طرح پردے میں رہ سکتی ہیں۔ وہاں بھی مسلم خواتین عبایا پہنتی ہیں حجاب لیتی ہیں۔'' آیت یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا تم سمجھ رہی ہو تم چلی جاؤ، مجھے یہیں رہنے دو، یہاں میرا پورا سیٹ اپ ہے۔'' میں وہاں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی اب مجھے جاب بھی کرنی ہے۔''

''پہلے پڑھائی تو مکمل کرلو'' عظمیٰ خان نے کافی دیر سے اس کے جڑے ہوئے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اب وہ اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ دبا رہی تھیں اماں میں آپ کو یقین دلاتی ہوں وہاں آپ کو کسی قسم کی پرابلم فیس نہیں کرنی پڑے گی جب آپ میرے پاس ہوں گی تو مجھے تسلی رہے گی ابا کہہ رہے تھے وہ ہمارے ذاتی خرچے کے لیے بڑ اماؤنٹ بھجواتے رہیں گے ٹھیک ہے ناں اماں آپ چلیں گی ناں میرے ساتھ اپنی بیٹی کے ساتھ۔ واقعی اماں میں آپ کے بغیر کچھ نہیں کرسکوں گی۔ آپ میری ڈھارس میری امید میرا یقین ہیں جب آپ میرے ساتھ ہوں گی تو میرا اعتماد بحال رہے گا'' اس نے ان کے ہاتھ ہونٹوں سے لگالیے تھے تب عظمیٰ خان نے اثبات میں آنکھوں کو جنبش دی آیت کے سامنے ان کی کچھ نہیں چلتی تھی وہ بے بس ہوجاتیں اس کے سامنے انہیں صرف اتنا معلوم تھا کہ اگر وہ آیت ہے تو وہ ہیں۔'' میری اچھی اماں!'' اس نے ان کے گلے لگتے ہوئے زور سے انہیں بھینچا تھا اور اب وہ مسلسل ان کے گالوں کے باآواز بوسے لیے جارہی تھی'' بس کرو لڑکی کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔''

''یہی کہے گا ناں کہ اپنی ماں کو چوم رہی ہے محبت و عقیدت سے۔'' جب بھی آیت انہیں اماں کے بجائے ماں کہتی ان کے دل میں کہیں دور تک ٹھنڈ پڑ جاتی '' ہم کل ہی جائیں گے آپ کا پاسپورٹ بنوانے۔ آپ اپنی تیاری ابھی سے شروع کردیں اور ہاں ان بدتمیزوں کو بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''کن کو؟'' عظمیٰ خان نہ سمجھتے ہوئے گویا ہوئیں

''آپ کے بھائی صاحبان کی یاجوج ماجوج قوم کو''

''بری بات آیت'' اماں مسکرادیں'' اماں میں جو بات کہوں نا اسے مان لیا کریں آپ نے کسی کو کچھ نہیں بتانا۔ میں نے ابا کو بتادیا ہے آپ بھی میرے ساتھ جائیں گی۔ یہ سن کر وہ مطمئن معلوم ہورہے تھے۔ اماں خاموش تھیں شاید اپنی اداسی کو پیچھے دھکیل رہی تھیں ''اماں مسکرائیں نا'' آیت ان کے مزید قریب کھسک آئی ''اچھا اب چلو بہت دیر ہوچکی ہے۔'' عظمیٰ خان اٹھتے ہوئے بولیں تو وہ بھی اٹھ گئی۔

آیت بہت خوش تھی اس نے اماں کو منالیا تھا ورنہ اندر سے سہمی ہوئی تھی اگر اماں نہ مانیں اماں ضدی نہیں تھیں وہ جانتی تھیں کہ اماں ضرور مان جائیں گی اب آیت کا دل چاہ رہا تھا وہ زور زور سے قہقہے لگائے ساری دنیا کو بتائے دیکھو میں اپنی ماں کو اپنے ساتھ لے کر انگلینڈ جارہی ہوں۔ وہ رات کو بہت گہری اور پرسکون نیند سوئی تھی۔ آج ویک کا فرسٹ ورکنگ ڈے تھا۔ عظمیٰ خان تو کالج چلی گئیں آیت نو بجے تک اٹھ گئی تھی وہ خاصی فریش دکھائی دے رہی تھی ناشتہ کرنے کے بعد وہ لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئی

اسے ترکی کی رقیہ گل اور ایران کی صوفیہ الاسد سے بات کرنی تھی۔ عظمیٰ خان کی سی وی ان تک پہنچ گئی تھی۔ وہ خوش ہو رہی تھیں۔ رقیہ کہہ رہی تھی مذہبی اسکالر ہیں تمہاری مدر۔ ''ہاں۔'' آیت مسکرائی تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں آیت سے یہ ہماری خوش نصیبی ہوگی اگر عظمیٰ خان اقرا اسلام یونیورسٹی میں اپنے علم کی روشنی پھیلائیں گی۔ آیت نے ان سے رہائش کی بابت پوچھا تھا ''نو پرابلم یہاں پر سیکریٹریٹ رہائشی ایریاز بھی ہیں بے شمار اپارٹمنٹ بلڈنگز ہیں۔'' رقیہ میں رہائش ایسی جگہ رکھنا چاہتی ہوں جہاں سے اماں کی اور میری یونیورسٹی نزدیک ہوں۔'' تم آ تو جاؤ رہائش کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ مناسب رینٹ پر رہائش مل جاتی ہے، وہ بتا رہی تھیں آج کل یہاں کا ٹمپریچر قدرے گرم ہے، اگر تمہیں ایک مہینہ بعد آنا ہے تو فیبرک وغیرہ کے کپڑے ساتھ لانا، ونٹر سیزن کے لیے تمہیں یہیں اسپیشل ڈریسز دستیاب ہو سکتے ہیں، یہاں حلال فوڈز با آسانی مل جاتا ہے، بریڈ فورڈ میں مسلم کیمونٹی خاصی تعداد میں ہے یہاں پر کئی اسلامی سینٹرز ہیں جن میں مسلم ممالک کے دینی اسکالرز آتے رہتے ہیں۔ یہاں مقامی برطانوی امت مسلمہ کے خلاف بھی ہیں، بس یہ سوچنا اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ آیت کو بریڈ فورڈ کے بارے میں کافی معلومات مل چکی تھیں۔ زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اماں اس کے ساتھ رہیں گی لیکن عظمیٰ خان دل سے خوش نہیں تھیں۔ آیت کی ضد کے سامنے انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ وہ اپنے ملک میں رہنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے کبھی لگژری خواہشات ایڈاپٹ نہیں کی تھیں۔ عظمیٰ خان شیشے جیسے سراپے کی میدے اور گلابوں میں گندمی رنگت والی خاتون تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ اللہ کی رضا کو اپنی رضا بنانے کی کوشش کی تھی۔ انہیں سیر و سیاحت کا شوق نہیں تھا۔ فیشن کی دلدادہ نہیں تھیں، ہمیشہ سادگی اپنائے رکھی۔ میانوالی جیسا شہر کوئی نہ لگتا، یہ شہر ان کے آباؤ اجداد کا تھا، جہاں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ کالج ٹرپ کے ساتھ جہاں بھی جاتیں انہیں اپنا شہر ضرور یاد آتا عیسیٰ خیل یاد آتا جو ان کے والد ماسٹر ولی خان کا شہر تھا۔ اب آیت ضد کیے بیٹھی تھی کہ میرے ساتھ انگلینڈ چلیں۔ وہ میانوالی کو چھوڑ کر برطانیہ چلی جاتیں، یہ عمل عظمیٰ خان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

دونوں کے پاسپورٹ بن گئے تھے۔ عظمیٰ خان نے اپنے اور آیت کے لیے موسم کی مناسبت سے کپڑے بنوا لیے تھے۔ اس دن جب موسم ایک دم سے اچھا ہو گیا تھا۔ اماں کالج گئی ہوئی تھیں پہاڑوں اور سبزے کے درمیان نمیری جھیل کا منظر بہت دلفریب لگ رہا تھا۔ نیلے شفاف پانی پر آبی پرندوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ آج کل سائبریا کے مائیگریٹ کرنے والے پرندے یہاں کا رخ کر رہے تھے جو ہر سال اس علاقے میں ہزاروں کی تعداد میں آتے تھے۔ آیت کا موبائل اچانک بجا۔ اسکرین پر زنبیل خان کا نام چمک رہا تھا۔ ''ہیلو'' وہ باؤنڈری وال پر ہاتھ جمائے گویا ہوئی ''کیسی ہو زنبیل میری جان۔'' آگے سے اداسی بھری ہنسی کا ارتکاز ٹوٹا ''میں روحیل خان ہوں پلیز آیت فون مت بند کیجیے گا۔'' لہجے کی پور پور میں التجا تھی۔ ''کریں بات میں سن رہی ہوں۔'' اس کے لہجے کی تندی روحیل خان نے بھی محسوس کی تھی۔ اگنور کرتے ہوئے بولا ''میں پوچھ سکتا ہوں آپ نے اس پروپوزل سے انکار کیوں کیا؟'' وہ اداس تھا۔ ''مجھے اپنی اسٹڈی مکمل کرنی ہے۔''

''وہ تو آپ مکمل کر سکتی ہیں یہ تو کوئی جواز نہیں ہے انکار کا۔ میں آپ کا انتظار کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔'' تب پھیکی مسکراہٹ آیت کے چہرے پر اتری تھی۔ روحیل خان اسے برا نہیں لگتا تھا خوش قسمت ہوگی وہ لڑکی جس کے ماتھے کی ریکھاؤں میں وہ لکھا جا چکا ہے۔ اس کسرتی سراپے والے روحیل خان کو فرسٹ ٹائم دیکھ کر وہ بھی دم بخود ہوئی تھی۔ ہلکی سی لرزش اس کی گلابی ہتھیلیوں پر اتری تھی۔ روحیل خان کی مقناطیسی سنہری آنکھوں کے سحر بھرے فسوں نے اسے جکڑ لیا تھا، کتنے لمحے وہ اس سحر کے ریلوں میں بہی رہی تھی۔ لیکن وہ وجیہہ شخص اس کے نصیب میں نہیں تھا، اگر وہ اس کی قسمت کی لکیروں میں ہوتا تو وہ بلا جھجک اس کے حق میں فیصلہ دے دیتی۔ بھلا وہ کون تھی فیصلہ کرنے والی، فیصلے تو آسمانوں کی وسعتوں میں براجمان رب کائنات نے کرنے ہوتے ہیں اگر اس کے اللہ کو منظور ہوتا تو وہ کبھی روحیل خان سے انکاری نہ ہوتی جب اس کے رب کا حکم نہیں تھا تو انکار خود اس کی زبان پر آ گیا تھا۔ ''پلیز آیت کچھ تو بولیں مجھے جواب دیں۔''

''روحیل خان میں اسٹڈی کے لیے انگلینڈ جا رہی ہوں وہاں جانے مجھے کتنے سال لگیں وقت کا پتہ نہیں چلتا وہ پل بھر میں اپنی پرتیں بدل لیتا ہے۔ میں آپ سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتی جو پورا نہ ہو سکے اور ٹوٹ جائے آپ کی قابلیت پر کسی کو شک نہیں ہے لیکن کچھ فیصلے ہمارے اختیار میں نہیں ہوتے۔''

''تو کس کے اختیار میں ہوتے ہیں؟'' روحیل خان کی امیدیں دم توڑنے لگیں۔ ''اللہ کے اختیار میں۔'' وہ بولی ''آیت اگر اللہ ہم دونوں کا ملاپ چاہے تو؟'' روحیل خان کے لہجے کے روم روم سے رنجیدگی ٹپک رہی تھی۔ آیت شدید اذیت ناک درد سے مسکرائی ''روحیل صاحب تب مجھے اچھا لگے گا اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی۔''

''تو پھر آپ مان کیوں نہیں جاتیں۔ آپ یہ پروپوزل ایکسیپٹ کر لیں جب آپ کی اسٹڈی مکمل ہو جائے گی تب ہم دونوں اس مقدس رشتے میں بندھ جائیں گے، مجھے بھی ابھی اپنا کیریر بنانا ہے۔''

''میں قبل از وقت کچھ نہیں کہہ سکتی۔ روحیل صاحب اگر آپ کو اپنے جذبوں پر اتنا ہی یقین ہے تو اللہ پر چھوڑ دیں۔''

''ہاں آیت میں اللہ کی ذات سے مایوس قطعی نہیں ہوں۔''

''اگر آپ مایوس نہیں ہیں تو پھر فکر کس بات کی؟'' وہ پر اعتماد لہجے میں بولی'' پلیز آیت آپ جانے سے پہلے میرے حق میں فیصلہ دے دیں۔''

''روحیل صاحب خدا کی ذات پر بھروسہ رکھنے والے بندوں میں شامل ہونے کی کوشش کریں۔'' اس کے ایسے جواب پر روحیل خان افسردہ تھا۔ آنکھوں کی چبھن میں اضافہ ہوا تھا۔ گلا خشک ہو کر جلنے لگا تھا۔ بے بسی کا انتشار بھرا ریلا اسے بہائے لے جا رہا تھا۔ اس لڑکی کے تفاخرانہ جملوں پر اس کے اندر شام غریباں کے منظر آن بسے تھے۔ روحیل خان خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ کسی کی پروا نہ کرنے والے روحیل خان کا دل اس شدت سے اس لڑکی پر آیا کیسے۔ اس گھمنڈی آیت خان کا سراپا بار بار اس کے اندر کلک ہو رہا تھا۔ لیکن آیت کے دماغ میں اپنی پڑھائی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس کا وژن تھا اپنے کیریر کو برائٹ بنانا۔ عظمیٰ خان نے ہمیشہ اسے سراہا تھا اس کی ہمت بڑھائی تھی۔ اسٹرگل کے بنا زندگی کامیاب نہیں بنائی جا سکتی۔ عظمیٰ خان کی باتیں اس نے ایسے ذہن میں محفوظ کر لیں کہ اب مزید پڑھنے کے علاوہ اسے کچھ سوجھتا نہیں تھا۔ اب اس نے خود کو غیر محفوظ کبھی محسوس نہیں کیا تھا کیونکہ اسے خود پر بھرپور اعتماد تھا۔ آیت کا ویزہ آ چکا تھا اب ٹکٹ کنفرم ہونا تھے۔ عظمیٰ خان کا وزٹ ویزہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ آیت فکر

مند تھی اس نے ایجنسی سے رابطہ کیا جواب آیا عنقریب ان کا ویزہ آ جائے گا۔ اس دوران اویس خان مسلسل ان کے رابطے میں رہے۔ انہوں نے بتایا تھا آیت تم بریڈ فورڈ پہنچتے ہی اپنا اکاؤنٹ کھلوا لینا۔ میں فوراً تمہارے اکاؤنٹ میں اماؤنٹ ٹرانسفر کرا دوں گا پھر ضرورت پڑنے پر کسی بھی اے ٹی ایم سے تم رقم نکلوا سکتی ہو۔

☆.....☆

"تھینکس ابا۔"

بریڈفورڈ شہر کے نام پر اس یونیورسٹی کا نام بریڈ فورڈ شائر یونیورسٹی تھا۔ نمل سے وہاں جانے والے چاروں بچے احمر شاہ، اقرب جیلانی، نسا ملک اور آیت خان کی ۱۶ اگست کو لندن جانے والی فلائیٹ پی آئی اے میں سیٹ کنفرم ہو چکی تھی۔ ابھی ان کے جانے میں ایک ہفتہ تھا۔ آیت کی تمام تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ اماں کے ویزہ کے لیے وہ فکر مند تھی۔ تمام ڈاکومنٹس کلیئر ہو چکے تھے۔ وہ حد درجہ متوحش کیفیت میں تھی۔ وہ سوچتی کہیں اماں اپنا ارادہ نہ بدل دیں۔ وہ سوچ رہی تھی وہاں اماں کے بغیر کیسے رہوں گی خوشی کے اس موقع پر اس کا دل بجھا ہوا تھا۔ حلیم الطبع ماں اسے تسلیاں دیتیں۔ وہ اس سے کہتیں آیت تم کیوں فکر مند ہوتی ہو میں نے تم سے وعدہ کر لیا ہے تو میں ضرور تمہارے پاس آؤں گی۔" وہ اماں کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی اور عظمیٰ خان اس کے سلکی بال سہلا رہی تھیں۔ عظمیٰ خان کی باتیں سنتے ہوئے وہ بلاوجہ آنکھیں گلابی کرتی رہی۔ پیاری سی ناک بھی آگے سے ریڈ ہو چکی تھی۔ نیلی آنکھوں میں سفید آنسوؤں کا جل تھل تھا برملا وہ عظمیٰ خان کو باور کرانا چاہتی تھی" اماں پلیز آپ آ جانا۔" اچانک ملتجیانہ لہجہ ہو گیا تھا اس کا۔ انہوں نے آیت کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالے وہ مسکرائیں۔ عظمیٰ خان جب بھی مسکراتیں مزید خوبصورت دکھائی دینے لگتیں۔ اماں کی ایسی مسکراہٹ پر وہ جی جان سے فدا تھی۔ عظمیٰ خان کا ہر ہر لمس آیت کے دل پر نقش تھا۔ اس دن اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب انگلینڈ ایمبیسی نے اسلام آباد سے اسے اطلاع دی ویزہ او کے ہونے کی۔ آیت کے جانے میں دو دن باقی رہ گئے تھے۔

"جی اماں اب آپ ایک سال کی چھٹی کی درخواست دیں اور تیاری کریں۔"

"ہوں آیت تم وہاں پہنچو دس پندرہ دنوں تک میں بھی آ جاؤں گی تب تک تم رہائش کا انتظام بھی کر لو گی۔"

"جی اماں میں آپ سے رابطے میں رہوں گی۔" آیت کو خوشی اس بات کی تھی کہ وہاں پر بھی وہ اپنی پیاری اماں کے ساتھ رہے گی۔" آیت آج شام فیض بھائی کے ہاں چلیں گے ملنے۔"

"جی اچھا اماں۔" عظمیٰ خان سوچ رہی تھیں اصولاً تو انہیں آنا چاہیے تھا۔ عظمیٰ خان نے انہیں فون کر کے بتایا بھی کہ میں اور آیت انگلینڈ جا رہے ہیں تب بھی وہاں سے کوئی نہیں آیا تھا۔ کزنز کے باری باری فون آئے تھے۔ شہلا آپی کہہ رہی تھیں" آیت تم بہت لکی ہو مبارک ہو!" "شکریہ شہلا آپی۔" اب آیت نے دل میں کدورتیں رکھنی چھوڑ دی تھیں جس نے جو کیا اس کا عمل۔ میں جو کروں گی وہ میرا عمل ہوگا دوسروں کی خاطر میں کیوں اپنے کھاتے میں بدیاں ڈالوں۔ اگر میں کسی کو اچھا نہیں کہہ سکتی تو برا کہنے کا بھی مجھے کوئی حق نہیں ہے شہلا نے فوراً پینترا بدلا" ہاں بھئی وہاں تو تم خوب انجوائے کرو گی وہ جگہ ہی ایسی ہے دنیاوی جنتیں تو وہیں پر آباد ہیں۔" شہلا اپنی بات پر خود ہی طنزیہ انداز میں زور سے ہنسی تھی۔ وہاں پر خوب گھومنا پھرنا سیریں کرنا عیش ہی عیش ہیں بھئی تمہارے تو۔"

"شہلا آپی میں وہاں انجوائے کرنے نہیں جا رہی پڑھنے جا رہی ہوں میرا پورا فوکس اسٹڈی پر ہوگا۔"

"آیت تم بھی ٹھیک کہہ رہی ہو ویک اینڈ پر تو دوستوں کے ساتھ تفریح کے لیے جا سکتی ہو ناں، سنا ہے وہاں ڈسکو کلب، بار، کیفے فیشن کے طور پر انجوائے کیے جاتے ہیں۔"

"شہلا آپی اسٹوپڈ آپ نے یہ سب باتیں کرنے کے لیے مجھے فون کیا ہے بہتر تھا اگر آپ یہ نوازش مجھ پر نہ ہی کرتیں۔ اچھا اللہ حافظ مجھے ابھی اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔"

عظمیٰ خان نے اسلام آباد ایئر پورٹ پر کسٹم میں تعینات اپنے ایک اسٹوڈنٹ کو بنک ڈرافٹ بھجوا دیا تھا کہ میری سیٹ کنفرم کروا لو۔ آیت اب آ کر قدرے مطمئن ہوئی تھی کہ اماں اب کوئی بہانہ نہیں بنا سکیں گی۔ عظمیٰ خان جانا نہیں چاہتی تھیں لیکن اپنی بیٹی کو روتا یا اداس بھی نہیں دیکھ سکتی تھیں، یہ بھی وہ جانتی تھیں کہ وہ آیت کے بغیر زیادہ دن نہیں رہ سکیں گی۔ وہ تو ان کی زندگی تھی وہ آیت سے بہت محبت کرتی تھیں۔ وہ خود پر خود ہی حیران ہوتیں میرے دل کے روم روم میں اس کے لیے ایسی بے پایاں محبت سمٹ کیسے آئی۔ ایسی بے غرض بے لوث محبتیں تو اللہ ہی اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے۔

آج صبح سات بجے ان چار طلبا کو جن کے ساتھ پروفیسر ضیاالدین تھے۔ نمل کی کیری بس پر اسلام آباد کے لیے روانہ ہونا تھا۔ شام چھ بجے ان کی لندن کی فلائٹ تھی۔ نمل مینجمنٹ کے فول پروف انتظامات کیے گئے تھے۔ ان بچوں کی ذمہ داری نمل انتظامیہ ہی کی تھی۔ آگے پھر بریڈفورڈ شائر یونیورسٹی کی ذمہ داری تھی۔ غیر ملکی اسٹوڈنٹس صرف تعلیمی اعتبار تک۔ وہاں کے رولز فالو کرنا از حد ضروری تھا ورنہ نمل کے ساتھ کیا گیا بریڈ فورڈ شائر یونیورسٹی کا معاہدہ زیر دپر آ سکتا تھا۔ جس میں فوری طور پر یہاں سے نکال دیے جانے کے چانسز سو فیصد تھے جانے سے پہلے نمل یونیورسٹی میں ان طلبا کے چار سیشن ہوئے تھے جن میں ایک ایک پوائنٹ پر ڈسکشن ہوئی تھی۔ آپ سب کو یہ بات ذہن نشین کر کے وہاں رہنا ہے آگے کھائی ہے پیچھے گڑھا، اور آپ ایک اینٹ کی دیوار پر چل رہے ہیں۔ توازن آپ نے اپنی سوچ سے خود برقرار رکھنا ہے چھوٹی سے چھوٹی بھول بھی آپ کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے وہاں کی یونین، الیکشن یا غیر نصابی سرگرمیوں کا حصہ ہرگز نہیں بنیں گے۔ گیمز میں اگر حصہ لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں وہاں پوری دنیا کے اسٹوڈنٹس آتے ہیں۔ بعض ممالک کے طلبا بہت غصے والے ہوتے ہیں، خاص طور پر افغانستان، انڈیا، برما، آسٹریلیا، انڈونیشیا اور جنوبی افریقہ کے لوگ بہت غصیلے ہوتے ہیں۔ خصوصی طور پر ایسے اسٹوڈنٹس سے آپ کو بچ کر رہنا ہوگا۔ ہر وقت دماغ حاضر رکھیں کہ آپ یہاں پڑھنے آئے ہیں جب تک آپ لوگ اپنی رہائش کا انتظام نہیں کر لیتے آپ کو ساتھ ساتھ رہنا ہے۔

"سر ہم پورا خیال رکھیں گے۔"

"آپ کو لندن ایئر پورٹ پر لینڈ کرنا ہوگا وہاں سے میٹرو ٹرین یا ٹیکسی میں بریڈفورڈ جانا ہوگا ٹرین آپ کو ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچا دے گی وہاں یونیورسٹی کے نزدیک ہوٹل میں رہائش رکھیں گے۔ دوبئی میں آپ کو وقفہ نہیں لینا آپ لوگ سیدھے لندن جائیں گے۔ پی آئی اے کی انٹرنیشنل پرواز سے۔ یہاں سے اسلام آباد پہنچنے میں آپ کو تقریباً سات گھنٹے لگیں گے۔ رخصت ہوتے ہوئے وہ بار بار عظمیٰ خان کے گلے مل رہی تھی۔" آیت انشاءاللہ اگلے

سنڈے میں تمہارے پاس ہوں گی۔"

'انشاء اللہ۔" وہ آنکھوں میں آنسو بمشکل روکے ہوئے تھی۔"میم آپ فکر نہ کریں ہم دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھیں گی۔" نسا ملک نے عظمیٰ خان کو تسلی دینا چاہی۔ انہوں نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا۔ راستہ بھر آیت خاموش تھی۔ بار بار اسے عظمیٰ خان کا خیال آ رہا تھا۔ کیا دنیا میں ایک ہی ایسی ہستی تھی جس سے وہ اس قدر محبت کرتی تھی۔ اسے کسی کا بھی خیال نہیں آیا تھا سوائے اماں کے۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی پتھریلی صاف شفاف سڑک جس کے سینے پر بس فراٹے بھرتی ہوئی منزل مقصود کی جانب رواں تھی۔ آسمان کی طرف منہ اٹھائے قطار در قطار درختوں کو پیچھے چھوڑ رہی تھی۔ اب بس خوشاب سے کلر کہار کی جانب ٹرن لے چکی تھی۔ وہ پہاڑوں اور سبزے سے گھرے اس علاقے کے دلکش مناظر میں کھوئی ہوئی تھی۔ موٹر وے پر سفر کلر کہار کی خوبصورت وادی جہاں لوکاٹ کے درخت کثرت سے تھے پہاڑوں سے نکلتے جھرنے آس پاس' ہرن دکھائی دے رہے مور بھی یہاں خاصی تعداد میں نظر آ رہے تھے جو چہل قدمی کرتے خوبصورت لگ رہے تھے۔ وہ چونکی جب اس کے نزدیک بیٹھی نسا نے منرل واٹر کی بوتل اسے تھمائی "تھینکس نسا۔" اسے اس وقت پانی کی طلب بھی محسوس ہو رہی تھی۔ چکوال سے آگے ایک پرسکون ڈھابے پر انہوں نے کھانا کھایا تھا۔ ظہر کی نماز پڑھی اور پھر سفر جاری کر دیا۔ اب تک وہ دو بار عظمیٰ خان کو میسج کر چکی تھی "اماں کیا کر رہی تھیں؟"۔ "بیٹھی ہوئی ہوں۔" آیت کو لگا اماں نے بڑی اداسی سے اسے میسج سینڈ کیا ہے۔ کھانے کے دوران آیت نے انہیں میسج کیا" میں کھانا کھا رہی ہوں آپ نے کھانا کھایا؟" فوراً جواب آ گیا چائے کے ساتھ اسنیکس لیے ہیں چھ بجنے میں ابھی کافی ٹائم تا وہ لوگ فیصل مسجد تک آ گئے تھے۔ اسلام آباد کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی اس مسجد میں انہوں نے عصر کی نماز ادا کی۔

کسٹم وغیرہ سے فراغت کے بعد بورڈنگ پاس انہیں مل گئے تھے۔ لندن جانے والی پرواز PK 7797 کے مسافر اندر لاؤنج میں تشریف لے آئیں۔ پروفیسر ضیا الدین کا ان سب نے باری باری شکریہ ادا کیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے گڈ وشیز کے ساتھ انہیں سی آف کیا تھا۔ آیت نے عظمیٰ خان کو میسج کیا ہم اندر آ چکے ہیں تھوڑی دیر میں ٹیک آف کرنے والے ہیں۔ خوشی کے ساتھ وہ اداس بھی تھی اپنے ملک، اپنی ماں سے دور جا رہی تھی۔ لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے پھر عظمیٰ خان کو میسج کیا "اماں ابھی سے آپ کے لیے اداس ہو رہی ہوں انشاء اللہ سنڈے کو آپ سے ملاقات ہوگی۔" آیت اللہ کے سپرد ہو انشاءاللہ جلدی تم سے ملاقات ہوگی۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔"

جہاز کے اندر آیت نے عشا کی نماز ادا کی تھی۔ تسبیح پڑھنے کے بعد وہ کتنی دیر تک اللہ سے باتیں کرتی رہی۔ کھانا سرو ہو رہا تھا۔ مستعد ایئر ہوسٹس بہترین اخلاق کے ساتھ ایک ایک مہمان سے پوچھ رہی تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد نساء چونکہ تھکی ہوئی تھی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے سو چکی تھی۔ آیت کو نیند نہیں آ رہی تھی اس کے بیگ میں چھوٹے سائز کی قرآنی تفسیر تھی وہ پڑھنے لگی جیسے جیسے پڑھتی جا رہی تھی، گہری طمانیت اس کے رگ و پے میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ اس نے قرآن پاک بند کر کے بیگ میں احتیاط سے رکھا۔ اب وہ سیٹ سے سر ٹکائے آنکھیں بند کر چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند میں جا چکی تھی۔ "آیت اٹھ جاؤ، ہم رن وے پر جا رہے ہیں۔ لینڈ کرنے ہی والے ہیں۔"

جہاز لینڈ کر چکا تھا، سیڑھی لگائی جا رہی تھی تمام مسافر سیٹ بیلٹ کھول چکے تھے۔ مسافر لائن میں ڈور کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ایئر ہوسٹس سب کو تھینکس بول رہی تھی۔ ہیتھرو ایئر پورٹ پر تمام مراحل سے گزرنے کے بعد وہ چاروں باہر آ گئے تھے۔ یورپ کے خطے انگلینڈ کے شہر لندن میں ان چاروں کی پہلی انٹری۔ موسم بے حد اچھا تھا۔ چکا چوند روشنیوں کے درمیان فضا میں سانس لینا آیت کو اچھا لگ رہا تھا۔ اس وقت وہ لانگ شرٹ اور چوڑی دار پاجامے میں تھی۔ میچنگ کا دوپٹہ اسکارف کی طرح سر پر لپیٹا ہوا تھا۔ ان سب کے ساتھ ایک کیری بیگ اور ایک ایک سوٹ کیس تھا۔ وہ انٹرنس لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ احمر اور اقرب نے ان دونوں لڑکیوں کے بیگ بھی اٹھائے ہوئے تھے جو اب ایک جگہ پر رکھ چکے تھے۔ واقعی لندن، لندن تھا انتہائی صاف پرکشش اور پررونق ایئر پورٹ تھا یہ۔ لوگ آ جا رہے تھے ہر ملک ہر مذہب ہر لباس میں دکھائی دے رہے تھے۔ ان چاروں کو سامان میں گھرے دیکھ کر ایک ٹیکسی ڈرائیور ان کے پاس آیا؟ "ٹیکسی!" وہ مسکرایا۔

"بریڈ فورڈ جانا ہے یونیورسٹی روڈ پر۔" اقرب جیلانی گویا ہوا۔ "بریڈ فورڈ یہاں سے دو گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔" ڈرائیور نے مزید معلومات پہنچائیں بریڈ فورڈ کے لیے ٹرین ہر بیس منٹ بعد جاتی ہے "آپ ہمیں ٹرین کے اسٹاپ تک چھوڑ سکتے ہیں؟" "شور...... بیس پونڈ کرایہ ہوگا" "ٹھیک ہے" وہ چاروں میٹرو ٹیکسی میں بیٹھ چکے تھے۔ رات کا پرفسوں سرمئی اندھیرا روشنیوں سے جگمگاتی روڈ روشنی کے ایسے جھمگھٹے کہ گری ہوئی سوئی بھی دکھائی دے جائے وہ چاروں دلچسپی سے سڑک کے اطراف بنی عمارتیں دیکھ رہے تھے۔ اقرب ڈرائیور کے قریب فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ڈرائیور سے ان عمارتوں کے بارے میں پوچھتا بھی رہا ڈرائیور ہندوستانی تھا اخلاق کا بہت اچھا تھا وہ ڈیٹیل سے ہر گزرتی عمارت، کیفے، مال، مارکیٹ کے بارے میں بتا رہا تھا جو ان چاروں کی معلومات میں لندن کی بابت اضافہ تھا۔ ٹھیک بارہ منٹ بعد وہ بریڈ فورڈ جانے والی ٹرین کے مین جنکشن پر کھڑے تھے۔ جب وہ بریڈ فورڈ پہنچے تو صبح ہو چکی تھی۔ یہاں بھی سورج ویسا ہی تھا جیسا پاکستان میں نکلتا ہے سورج کی جامنی روشنی آہستہ آہستہ مشرق سے ابھر رہی تھی اس کی تانبے جیسی کرنیں ہر چیز کو اپنے رنگ میں رنگ گئی تھیں۔ اسٹاپ پر خاصی رونق تھی آس پاس کے تمام سینٹرز پلازے، مال مختلف شاپس بند تھیں۔ یہاں سے بریڈ فورڈ یونیورسٹی واکنگ ڈسٹینس پر تھی۔ قریب سے گزرتے سویپر سے احمد شاہ نے کچھ پوچھا" جہاں یہ روڈ ختم ہو رہی ہے لیفٹ پر لیمپ پوسٹ کی جانب کراس کریں تھوڑا آگے ایسٹ پر یونیورسٹی روڈ ہے۔

ہمیں اسی ایریا میں عارضی رہائش کا انتظام کرنا ہوگا۔ اب چاروں کے پاس اپنے اپنے بیگز تھے جنہیں کھینچتے ہوئے چل رہے تھے۔ اسی روڈ پہ ایک اچھا سا ہوٹل تھا۔ مناسب چارجز پر انہوں نے دو کمرے بک کرا لیے تھے۔ حسب ضرورت ان کے پاس پونڈز تھے۔ باقی رقم کا بندوبست انہیں بینک کی مدد سے کرنا تھا۔ آیت کی فجر کی نماز قضا ہو چکی تھی اب دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ سامان کمرے میں رکھنے کے بعد اس نے واش روم جا کر وضو کیا پھر فجر کی قضا نماز ادا کی۔ یہاں آ کر ان چاروں نے اپنے فونز میں یہاں کی سمیں ڈلوالی تھیں۔ ہوٹل کے سامنے

سینٹر میں موبائل شاپ تھی جہاں سے اقرب اور احمر نے سمیں خرید لی تھیں ایکٹیویشن وغیرہ کمپیوٹرائز تھی دل میں ان دونوں نے یہاں کے سسٹم کو سراہا۔ پاکستان میں کوئی بھی سم ایکٹویٹ کرانے میں خاصا ٹائم لگ جاتا ہے۔ اپنا پاسپورٹ اور آئی ڈی کارڈ اور یہاں کی انٹری کی سلپ دکھانے پر چاروں موبائل چارج ہوگئے تھے۔ یہاں کی سروس کا پہلا امپریشن ان پر اچھا پڑا تھا۔ نسا اور آیت کو موبائل دینے کے بعد ان سے ناشتے کے لیے پوچھا تھا ان دونوں نے ناشتہ کے لیے منع کر دیا تھا۔ وہ چند گھنٹے سونا چاہتی تھیں پھر انہیں انٹری پاس لینے یونیورسٹی جانا تھا۔ رہائش بھی تلاش کرنی تھی۔ اقرب جیلانی کا فون نسا کے نمبر پر آیا تھا" تیار ہو کر نیچے آؤ ایک گھنٹہ تک ہمیں یونیورسٹی پہنچنا ہے۔ اپنے تمام ڈاکومنٹس بھی ساتھ رکھ لینا۔"

"اوکے ہم تیار ہو کر آتے ہیں۔" اس نے قریب سوئی ہوئی آیت کو اٹھایا اور خود واش روم چلی گئی۔ بیس منٹ میں وہ تیار ہو کر نیچے آ چکی تھیں۔ لابی میں وہ دونوں ان کے منتظر تھے۔ اس وقت ساڑھے نو بجے تھے ناشتہ کرتے ہیں اور پھر یونیورسٹی کے لیے نکلتے ہیں۔ وہ چاروں ایک بڑے سے ہال میں داخل ہوئے وہ ایک ٹیبل کے گرد بیٹھ گئے۔ "کیا لوگی تم دونوں؟" تھوڑا سا وقت ساتھ رہنے سے احمر شاہ اور اقرب جیلانی ان سے فری ہو گئے تھے۔

"ہری اپ زیادہ ٹائم نہیں ہے ہمارے پاس۔" ویٹر کو قریب آتے دیکھ کر بولا" چائے کے ساتھ اسنیک منگوالو لیکن ہاں وجیٹیبل یا بٹر والے ہوں۔" کچھ سوچتے آیت نے برا منہ بنایا ناک سکوڑی۔ ویٹر ان چاروں کی زبان نہ سمجھتے ہوئے ٹر ٹر دیکھ رہا تھا ویٹر آرڈر لے کر جا چکا تھا یہاں سے یونیورسٹی پانچ منٹ کے فاصلے پر تھی۔ "تم سب نے اپنے ڈاکومنٹس رکھ لیے ہیں ناں۔"

"ہاں بھئی ہم خاصے ذمے دار ہیں۔" نساء عموماً سر پر دوپٹہ نہیں لیتی تھی لیکن یہاں آخر خود بخود اس نے سر پر دوپٹہ لے لیا تھا۔ انہیں اپنے ملک کا نام و تقدس یہاں بڑھانا تھا تاکہ کسی کو موقع نہ ملے پاکستانی اسٹوڈنٹس پر تنقید کرنے کا۔ آخر وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔ آیت نے اس وقت سفید چوڑی دار پاجامہ، سفید اور آتشی پھولوں والی لوزشرٹ پہنی ہوئی تھی۔ میچنگ دوپٹہ دیدہ زیب انداز میں سر پر لپیٹ رکھا تھا۔ نیلی آنکھوں پر اٹھی ہوئی ناک اس کے بیضوی چہرے پر بہت جچتی تھی۔ طویل ہائیٹ پر کوٹ شوز اس کے سراپے میں مزید رونق بخش رہے تھے۔ وائس پرنسپل سے دن کے بارہ بجے میٹنگ تھی وہ وقت مقررہ پر پہنچ گئے تھے اور پورے بارہ بجے انہیں آفس میں بلوا لیا گیا تھا۔ وہ چاروں حیران تھے یہاں کے ڈسپلن پر۔ چونکہ وہ چاروں پاکستانی اسٹوڈنٹس تھے اور عمل یونیورسٹی سے باقاعدہ طور پر بریڈفورڈ شائر یونیورسٹی کا معاہدہ طے پایا تھا سو انہیں کہیں بھی پرابلم نہیں ہوئی تھی۔ وہاں کی کلیرنس کے بعد انہیں دو جگہ اور بھیجا گیا۔ اقرب جیلانی اور احمر شاہ کا بار ایٹ لا میں ایڈمیشن ہوا تھا ان دونوں کا ایک ہی ڈیپارٹمنٹ تھا جبکہ نسا ملک اور آیت خان کے الگ الگ ڈیپارٹمنٹ تھے۔ بار ایٹ لا میں انہوں نے اسٹیپ بائی اسٹیپ ڈگریاں لی تھیں۔ کل سے انہوں نے کلاسز اٹینڈ کرنی تھیں۔ ادھر ادھر گھومنے اور جگہیں تلاش کرنے میں انہیں کافی وقت لگا تھا۔ انہیں ہمت و حوصلے سے ہر مشکل و کٹھن مرحلے سے گزرنا تھا۔ ان کے حوصلے بلند تھے۔

اس سلسلہ وار ناول کی پانچویں قسط آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔

تنہائی کا زہر

آخری قسط

ایک ایسی مضبوط لڑکی کی داستان جو زندگی سے لڑ کر جیتنا چاہتی تھی۔
الجھنوں کو سلجھنوں میں تبدیل کرتی خوش رنگ تحریر

میں سوچ رہی ہوں کہ صفائی کے لیے الگ ماسی رکھ لوں گا تاکہ جب دونوں میں سے کوئی ایک چھٹی کرلے تو دوسری سے کام کروالیا جائے۔''

یہ لوگ ایسے ہی کرتی ہیں پیسے جتنے بھی دو مگر کام بھی اپنی مرضی سے کرنا ہے اور اتوار کی چھٹی کے علاوہ مہینے میں پانچ چھ فالتو چھٹیاں ان کا جائز حق بنتا ہے شاید اس قدر کام چور اور خود غرض ہوتی ہیں یہ عورتیں، جانتی ہیں تاکہ ان کے بغیر گزارا نہیں ہوسکتا ہمارا اس لیے بلیک میل کرتی ہیں دنیا بھر کی اموات اور شادیاں ان کے گھروں میں ہوتی ہیں ویسے ہر وقت اپنی غریبی کے رونے روتی رہتی ہیں مگر شادیوں میں یہ دھوم دھڑ کے کرتی ہیں ظاہر ہے ہر ایک سے تو جھوٹے سچے قصے سنا سنا کر پیسے بٹورتی ہیں۔ مجبوری ہے ان کے نخرے برداشت کرنے پڑتے ہیں اب مجھے فکر لگ گئی ہے کہ نور کے کپڑوں کا کیا بنے گا پورے ہفتے کے گندے کپڑے وہ بیگ میں بھر لائی ہے۔'' فیروزہ جلیل نے پریشانی سے کہا

''ایسا کرتی ہوں میں ثمرہ کی دوست نرما کے گھر میں فون کر کے پتہ کرتی ہوں کہ ان کی ماسی اگر کل بھی آجائے تو اسے کچھ دیر کے لیے ہماری طرف بھیج دیں تاکہ ہم کپڑے دھلوالیں اور صفائی وغیرہ کروالیں۔ چھٹی کا دن ہے کوئی مہمان آ ہی جاتا ہے عروہ کے سسرال والے بھی آج کل شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں اکثر ہی چکر لگاتے رہتے ہیں نجمہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا'' بیٹھو نجمہ میں تمہارے لیے چائے بناؤں میں نے بھی نہیں پی ابھی دونوں بہنیں مل کر پی لیتی ہیں نور تو جانے کب جاتے۔'' فیروزہ جلیل نے بھی کھڑے ہوتے ہوئے

کہا"نہیں شکریہ آپا میں نے چائے چینی کم کر دی ہے شوگر کی وجہ سے چینی تو ڈال نہیں سکتی اور پھیکی چائے کا مزہ ہی نہیں آتا۔" نجمہ نے سیڑھیوں کا رخ کرتے ہوئے کہا

"اچھا پھر عروہ اور ثمرہ کو بھیج دینا کچھ دیر کے لیے میں نور کو بیدار کرتی ہوں کچھ دیر بہنوں کے ساتھ گپ شپ لگائے گی تو فریش ہو جائے گی میں سوچ رہی ہوں آج ہم لوگ رات کا کھانا باہر ہی کھائیں کافی دن ہو گئے ہیں باہر نکلے ہوئے۔ کیا خیال ہے تمہارا" فیروزہ جلیل نے نجمہ سے پوچھا تو اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے پلٹ کر جواب دیا

"جیسا آپ مناسب سمجھیں عروہ اور ثمرہ آ گئیں تو ان سے اور نور سے مشورہ کر لیں جہاں یہ لڑکیاں جانے کو کہیں چلے جائیں گے اصل خوشی تو ان بچوں ہی کی ہے ہم بوڑھوں کا کیا ہے۔" نجمہ کے لہجے میں دنیا بھر کی یاسیت گھلی ہوئی تھی۔

نجمہ کے جانے کے بعد فیروزہ جلیل کمرے میں آئیں تو نور بیدار ہو کر اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی اور تیز تیز کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔

"اٹھ گئی میری بیٹی۔ کیا ہو رہا ہے؟" فیروزہ جلیل نے پیار سے پوچھا

"کچھ خاص نہیں وہ میں نے فیس بک پر کچھ نئے فرینڈز ایڈ کیے ہیں ان سے چیٹ چل رہی تھی" نور نے قدرے شگفتہ لہجے میں کہا

"گڈ اچھی بات ہے کچھ وقت دوسری سرگرمیوں کو بھی دینا چاہیے ہر وقت پڑھائی کو ذہن پر سوار کرنے سے انسان گھبرا جاتا ہے۔ وہ عروہ اور ثمرہ آ رہی ہیں اوپر ان کے ساتھ گپ شپ لگاؤ پھر رات کے کھانے کے لیے پروگرام بناؤ کہ کہاں جانا ہے اور کیا کھانا ہے میں تم لوگوں کے چائے اور اسنیکس وغیرہ بنا لوں۔"

"نہیں نہیں آپ تھک جائیں گی ہم لوگ خود چائے بنا لیں گے" نور نے کمپیوٹر آف کرتے ہوئے کہا

"اوہو..... میں نے کیا تھکنا ہے۔ سارا دن تو فارغ رہتی ہوں کوئی مسئلہ نہیں ہے میرے لیے تم لوگ باہر ٹیرس میں بیٹھو بڑا اچھا موسم ہو رہا ہے ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے ہیں اور بڑی خوشگوار فضا ہے سامنے مرگلہ کی پہاڑیاں شفق کی سرخی میں بڑی اچھی لگ رہی ہیں۔" فیروزہ جلیل نے منظر کشی کی اور پھر کچن کی جانب چلی گئیں اور نور اپنا حلیہ درست کرنے کے لیے باتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔

☆......☆

سکندر علی جب نیویارک ائیر پورٹ پر اترا تو اس کی اس قدر سخت جامہ تلاشی لی گئی جیسے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کو تباہ کرنے والے دہشت گرد اس نے اپنے لباس میں چھپا رکھے ہوں یا پھر وہ خود ہی ان کا ساتھی ہو یہی نہیں الٹے سیدھے اس قدر سوالات کیے گئے کہ وہ زچ ہو گیا مثلاً یہاں کیوں آئے ہو؟

"جی میں ایک ڈاکٹر ہوں اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

"تعلیم کیسے حاصل کرو گے"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمہیں اسپانسر کون کرے گا؟"

"میں نے کہا نا کہ یہاں میرے والد برسوں سے مقیم ہیں وہ یہاں ایک کامیاب بزنس مین ہیں اور انہوں نے میرے تمام اخراجات پورے کرنے کی ضمانت دی ہے گارنٹی لیٹر میرے پیپرز کے ساتھ منسلک ہے۔

اس پہ امیگریشن افسر نے کاغذات کی فائل کو کھول کر گارنٹی سرٹیفکیٹ نکالا اس کا بغور مطالعہ کیا اور مطمئن ہو کر بولا

"یہاں مستقل رہائش کا ارادہ تو نہیں؟"

"فی الحال تو نہیں"

"شادی تو نہیں کرو گے یہاں کی کسی سٹیزن سے؟" کڑے تیوروں میں پوچھا گیا

"ہوں..... سوچا نہیں ابھی۔"

"مطلب یہ کہ مستقبل میں ایسا کرنے کا ارادہ ہے؟"

فوراً ہی اگلا سوال داغا گیا۔

"یہ میں نے کب کہا؟"

"اوکے ینگ مین وش یو بیسٹ آف لک۔" بالآخر ادھیڑ عمر کے امیگریشن افسر نے اپنے کرخت چہرے پر ہلکی سی پیشہ ورانہ مسکراہٹ زبردستی سجا کر لہجے کو قدرے نرم بناتے ہوئے کہا

اور سکندر علی دل ہی میں اللہ کا شکر ادا کیا ورنہ جس طرح وہ اس سے سوال جواب کر رہے تھے اور جس طرح اس کی تلاشی لی گئی تھی اسے اندیشہ ہو رہا تھا کہ شاید اسے ڈی پورٹ ہی نہ کر دیا جائے۔

سکندر علی ائیر پورٹ کی عمارت سے باہر نکلا تو اس کے والد، سوتیلی والدہ شبنم اور اس کے سوتیلے بہن بھائی اس کے منتظر تھے سبھی نے اس کا نہایت پرتپاک استقبال کیا۔

"سفر کیسا رہا مائی سن؟" والد نے پوچھا

"سفر تو بے حد اچھا رہا مگر یہاں کی چیکنگ نے تھکا کر رکھ دیا۔"

"ہاں 9/11 کے بعد سے انہوں نے ہر آنے والے کی چیکنگ بہت سخت کر دی ہے۔"

"یہ امریکی بھی عجیب قوم ہے خود نام نہاد سپر پاور ہونے کے زعم میں ساری دنیا کی ٹھیکیدار بنے پھرتے ہیں جس ملک میں چاہے اپنی فوجیں بھیج دی ڈرون حملے کیے جاتے ہیں ہر اہم ملک کے گرد نواح میں اپنے مسلح بحری بیڑے تعینات کر رکھے ہیں مگر اپنے ملک میں آنے والوں کے ساتھ اس قدر برا برتاؤ کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ اگر کسی شخص میں ذرا بھی Self respect ہو تو وہ کبھی یہاں کا رخ نہ کرے مجھے تو یہاں صرف اعلیٰ تعلیم کے لیے آنا پڑا ہے ورنہ میں کبھی یہاں نہ آتا" سکندر علی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اوکے۔ اوکے۔ ڈونٹ وری بیٹا" جب تم کچھ عرصہ یہاں رہو گے تو یہاں کے قانون قاعدے سیکھ جاؤ گے یہاں کی سہولتوں سے آشنا ہو جاؤ گے تو پھر یہ ملک تمہیں کسی جنت سے کم نہیں لگے گا مجھے دیکھو کیسے خالی ہاتھ یہاں آیا تھا اور آج ایک خوشحال کاروباری ہوں یہاں انسان کو اس کی محنت کا صلہ ملتا ہے اسی لیے تو دنیا کا ہر شخص یہاں آنے کے لیے ترستا ہے ایسے ہی تو اسے لینڈ آف اپر چونیٹی نہیں کہا جاتا۔"

سکندر گاڑی کی کھڑکی سے ٹریفک کے اژدہام کو دیکھتے ہوئے والد کی باتوں کو بے دلی سے سن رہا تھا۔ اسے اپنے ملک، اپنی والدہ اور بھائی بہنوں کی یاد ستا رہی تھی۔ جنہیں وہ اپنے بہتر مستقبل کی خاطر اداسیوں کے حوالے کر آیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ گھر پہنچ گئے۔ گھر کیا تھا ایک خوبصورت سا محل تھا۔ اگرچہ وہ نیویارک کے نواح میں تھا مگر بے حد سرسبز علاقہ تھا۔ گھر کے اردگرد وسیع سبزہ زار تھا۔ سکندر علی گھر کو دیکھ کر بیحد خوش ہوا اور اس ساری کوفت دور ہو گئی۔ شبنم نے ایک ادھیڑ عمر کے بنگلہ دیشی ملازم کو ہدایت کی کہ وہ سکندر کا سامان اس کے کمرے میں پہنچا دے۔

"سکندر بیٹا آپ بھی فریش ہو جاؤ، پھر سب مل کر کھانا کھائیں گے۔" شبنم نے پیار بھرے لہجے میں سکندر سے کہا۔

"اوکے ماما۔ تھینک یو۔" سکندر نے مودب

لہجے میں کہا اور ملازم کے پیچھے پیچھے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

اس کا کمرہ بیحد خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔

''شاب اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ کال بٹن پش کر دیجیے گا میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' بنگالی ملازم نے بنگلہ ملی اردو میں سکندر سے کہا

''تھینک یو فی الحال تو میں غسل کرنا چاہتا ہوں۔'' سکندر نے کہا۔

''یہ دائیں طرف ڈریسنگ روم اور اٹیچڈ باتھ ہے تاول اور سوپ وغیرہ باتھ ہی میں ہیں۔'' ملازم سکندر کا سامان ڈریسنگ روم میں الماری کے قریب رکھتے ہوئے کہا سکندر نے اپنا اٹیچی کیس کھول کر ہلکا پھلکا شلوار قمیص اور چپل نکالے اور پھر باتھ روم میں گھس گیا۔

جب وہ نہا کر اور لباس تبدیل کے اور بال وغیرہ سیٹ کر کے نیچے لیونگ روم میں آیا تو سامنے ہی واقعہ ڈائننگ ہال سے اشتہا انگیز کھانوں کی مہک آ رہی تھی سکندر نے گہری سانس لے کر اس خوشبو کو اپنے اندر اتارا تو بھوک اور بھی چمک اٹھی۔

''جلدی آؤ سکندر بیٹا۔ تمہاری ماما اور دونوں بہنوں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے انتہائی مزیدار کھانے تمہارے انتظار میں ہیں۔'' ارشاد علی نے سکندر کو دیکھ کر کہا۔ اور سکندر مسکراتا ہوا بڑی سی ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اس کے سوتیلے بہن بھائی عائشہ علی اور خدیجہ علی اور بھائی جلیل علی اور احتشام علی بالترتیب پندرہ تیرہ بارہ اور آٹھ سال کے تھے جبکہ شبنم کے پہلے شوہر سے دو بچے رشیدہ اور منیب الرحمن تھے رشیدہ کی شادی اس کی خالہ کے بیٹے عظیم سے ہو چکی تھی جبکہ منیب الرحمن واشنگٹن میں یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا اور وہ وہاں ہاسٹل میں رہتا تھا۔ کبھی چھٹیوں میں آ جاتا تھا کبھی اپنے حقیقی والد سے ملنے بنگلہ دیش چلا جاتا۔

ٹیبل پر پاکستانی اور بنگالی کھانے چنے ہوئے تھے تلی ہوئی مچھلی، جھینگا پلاؤ، کوفتے، شامی کباب، چکن قورمہ، مٹن کڑھائی چھوٹے چھوٹے پراٹھے۔ گجریلا، کسٹرڈ بنگالی رس گلے، سلاد اور رائتہ کئی قسم کی چٹنیاں اور دو تین قسم کے پاکستانی اور بنگالی فروٹ۔

''اف ماما آپ نے اتنا کچھ کیسے تیار کر لیا؟'' سکندر نے میز پر سجے انواع اقسام کے کھانوں کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے کہا

''بھئی ابھی تو میں نے تمہارے لیے بریانی بھی بنانی تھی کیونکہ تمہارے پاپا نے بتایا تھا کہ تمہیں بریانی بہت پسند ہے مگر پھر سوچا کہ پھر کبھی سہی۔ اب تو تم نے یہیں رہنا ہے نا'' شبنم نے جھینگا پلاؤ کی ڈش سکندر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو...... ماما پلیز آپ بھی بیٹھ جائیے جو لینا ہوگا میں خود ہی لے لوں گا۔'' سکندر نے شبنم سے کہا تو وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بڑے خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ سکندر کھانے کھاتے ہوئے ہر ڈش کی دل کھول کر تعریف کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اپنے بھائیوں سے ان کی تعلیم اور دیگر سرگرمیوں کے بارے میں پوچھ بھی رہا تھا۔ چاروں اپنے ڈاکٹر بھائی کے آنے پر بیحد خوش تھے اور وہ بڑی گرمجوشی سے اس کے ہر سوال کا جواب دے رہے تھے۔ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ لوگ اتنے عرصے بعد آپس میں مل رہے ہیں۔

کھانے کے بعد سب آ کر لیونگ روم میں صوفوں پر بیٹھ گئے اور ٹی وی دیکھتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے عائشہ اور خدیجہ چھوٹی چھوٹی نازک سی پیالیوں میں قہوہ لے آئیں۔ ساتھ مختلف قسم کے ڈرائی فروٹ بھی تھے۔ سکندر حیران تھا کہ امریکہ میں رہتے ہوئے بھی دونوں بہنوں میں انتہا کی سادگی اور معصومیت تھی۔ سانولی سلونی رنگت کی نازک سراپے والی یہ لڑکیاں لگتا تھا کہ ابھی ابھی پانیوں اور دھرتیوں کی سرزمین بنگلہ دیش (جو کبھی پاکستان کا بازو تھا) سے آئی ہوں امریکی معاشرے اور تہذیب کا ان پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ مشرقی تہذیب میں رنگی یہ پیاری پیاری لڑکیاں اتنی سی عمر میں گھرداری میں بھی ماہر ہو چکی تھیں اور یہ سب شبنم کی اچھی تعلیم و تربیت کا اثر تھا جس نے امریکہ کے مادر پدر آزاد معاشرے میں رہتے ہوئے بھی اپنے بچوں کی تربیت اسلامی اور مشرقی روایات کے مطابق کی تھی۔

☆......☆

زاریہ کی صحت بے حد گر چکی تھی۔ مسلسل دکھوں، غموں اور ذہنی خلفشار نے اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا حالانکہ ابھی اس کی عمر محض 54 سال تھی مگر وہ اپنی عمر سے دس سال بڑی لگتی تھی۔ بلڈ پریشر، شوگر اور دماغی مرض کی وجہ سے وہ نسیان کا شکار بھی ہو چکی تھی۔ کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے وہ بھول جاتی تھی کہ کس ٹاپک کو ڈسکس کر رہی ہے اپنے بنائے ہوئے نوٹس اسے سمجھ نہیں آتے تھے۔ پھر اس نے کتاب کھول کر اسٹوڈنٹس کو سمجھانا شروع کر دیا اس پر اسٹوڈنٹس پرنسپل سے شکایت کرتیں کہ'' میڈم لیکچر ڈیلیور کرنے کے بجائے بک ریڈنگ کرتی ہیں اور ایکسپلین نہیں کرتیں اور فزکس جیسا سبجیکٹ ہمیں سمجھ میں نہیں آتا۔'' ظاہر ہے زاریہ ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھی سینئر پروفیسر تھی پرنسپل اسے کچھ ڈائریکٹ ویسے میں تو نہیں کہہ سکتی تھیں البتہ میٹنگ میں ان ڈائریکٹلی کہتیں کہ کچھ ٹیچرز کلاس میں بک ریڈنگ کرتی ہیں اور اسٹوڈنٹس کمپلینٹ کرتی ہیں کہ انہیں کچھ سمجھ نہیں آتا اب زاریہ تو میٹنگ کے وقت بھی اپنے ہی سوچوں کے تانے بانے بنتی رہتی تھی وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتی تھی کہ اصل میں اس پر چوٹ کی جا رہی ہے۔

شوگر کی وجہ سے اس کی ٹانگوں اور سارے جسم میں ہر وقت شدید قسم کی ٹیسیں اٹھتی رہتی تھیں اس کے دو پیریڈز ہوتے تھے اور دونوں کلاسز اوپر کی منزل پر تھیں بیچاری بڑی مشکل سے ریلنگ کو پکڑ کر رک رک کر سیڑھیاں چڑھتی تھی۔ اگر اسٹوڈنٹس پاس سے گزر رہی ہوتیں تو وہ اظہار ہمدردی اس کا بیگ رجسٹر اور کتابیں پکڑ لیتیں اور سہارا دے کر اوپر جانے میں مدد کر دیتیں وہ اکثر سیڑھیاں چڑھنے اور اترنے کی مشقت کی وجہ سے تھک کر نڈھال ہو جاتی سانس پھول جاتی اور کلاس میں جا کر بے دم سی ہو کر کرسی پر بیٹھ جاتی اور جب ذرا اوسان بحال ہوتے تو پڑھانا شروع کرتی۔ اس کی ایج گروپ کی باقی پروفیسرز نے اپنی کلاسز نیچے لگوالی تھیں کسی کو گھٹنوں کے درد کی شکایت تو کسی کو ہارٹ پرابلمز چونکہ وہ لوگ اسٹاف روم میں بیٹھتی تھیں ٹائم ٹیبل سیٹ کرنے والی ٹیچر سے ان کی علیک سلیک تھی اس طرح اسے اپنے مسئلے بتا کر اپنا ٹائم ٹیبل اور کلاسز اپنی سہولت کے مطابق کروا لیتی تھیں مگر چونکہ زاریہ کی کسی ٹیچر کے ساتھ کوئی خاص ریلیشن شپ نہیں تھی۔ پھر وہ زیادہ تر لیب ہی میں رہتی تھی پھر اسے ویسے بھی اپنے مسائل دوسروں کے ساتھ شیئر کرنے کی عادت نہیں تھی اس لیے مشکل کے باوجود نہ اس نے پرنسپل سے کبھی کہا نہ ہی کسی اور سے کہ اس کی کلاسز نیچے رکھی جائیں خود ہی مشکل ہی سے سہی اپنا کام خاموشی سے کرتی رہتی۔

زاریہ اب زندگی سے انتہائی مایوس ہو چکی تھی۔ گھر کے حالات بھی خاصے ابتر تھے راحیلہ کے دو اور بچے ہو چکے تھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ وہ زیادہ تر اوپر اپنے پورشن میں رہتی تھی۔ ویک اینڈ

پر بچوں کو لے کر میکے چلی جاتی زاریہ اور سحرش سے سلام دعا کرنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ نہ بچوں کو پھوپھو کے پاس آنے دیتی اور اگر شہروز تھوڑی دیر کے لیے بھی آفس جاتے ہوئے یا واپسی پر چند لمحوں کیلیے زاریہ کے پاس رک کر اس کا حال چال پوچھنے لگتا تو راحیلہ کو فوراً خبر ہو جاتی اور وہ کسی نہ کسی بچے کو بھیج کر کسی بہانے سے شہروز کو اوپر بلا لیتی۔ شہروز بھی کچھ راحیلہ کے الٹا سیدھا سکھانے بھڑکانے اور کچھ اپنے گھرداری کے بکھیڑوں میں الجھ کر کافی حد تک بدل چکا تھا۔ بچوں اور بیوی اور سسرال والوں کے علاوہ اسے کسی اور کی کوئی پرواہ ہی نہیں تھی اپنی گاڑی پر آفس چلا جاتا اور وہاں سے اکثر رات ہی کو واپس آتا جبکہ زاریہ کی گاڑی راحیلہ کے قبضے میں تھی وہ اس پر بچوں کو اسکول چھوڑنے اور لانے جاتی۔ شام کو بچوں کو لے کر کسی پارک میں چلی جاتی یا پھر شاپنگ کے بہانے مارکیٹوں میں گھومتی رہتی۔ اور زاریہ کو کھانے کو بھی نہ پوچھتی جب کبھی سحرش اپنی والدہ کی طرف کچھ دن کے لیے رہنے چلی جاتی تو زاریہ باہر گلی میں بیٹھے چوکیدار یا محلے کے کسی بچے سے اپنا کھانا بازار سے منگواتی کیونکہ بلڈ پریشر اور شوگر کی وجہ سے وہ کچن میں کھڑی ہو کر کھانا نہیں بنا سکتی تھی۔ پھر جب ایک دن چوکیدار نے شہروز کو بتایا کہ باجی اکثر مجھ سے کھانا بازار سے منگواتی ہیں تو شہروز کو بے حد غصہ آیا اور اس نے راحیلہ کو سمجھایا کہ وہ باجی کو کھانا بنا کر نیچے دے دیا کرے دراصل سحرش نے ایک اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا تھا اور شام کو ایک اکیڈمی میں انگلش کا کورس کر رہی تھی ایم اے انگلش پاس کرنے کے بعد بھی وہ ابھی تک کسی اچھے کالج میں ملازمت حاصل نہیں کر سکی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی انگلش اسپیکنگ اتنی اچھی نہیں تھی اور انٹرویو اور ٹیسٹ میں رہ جاتی اس لیے اس نے اپنی انگلش امپروو کرنے کی غرض سے اکیڈمی جوائن کر لی تھی وہ سالن وغیرہ تو رات ہی کو تیار کر دیتی تھی مگر زاریہ روٹی تازہ کھاتی تھی پھر آج کل سحرش کی بہن اقرا کی شادی قریب تھی اور شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں شرمین نے زاریہ سے کہا تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے سحرش کو اس کے پاس بھجوا دے زاریہ نے اجازت تو دے دی تھی مگر اس کے لیے مسئلہ ہو گیا تھا ناشتہ کھانا اور پھر کپڑے وغیرہ پریس کرنا کام والی بھی اکثر چھٹی کر جاتی تھی کیونکہ زاریہ دو ڈھائی بجے گھر آتی تھی جبکہ کام والی صبح آ کر اوپر راحیلہ کا کام کر کے چلی جاتی تھی۔

دوسری طرف سحرش کی ماں شرمین کو بھی اس کی بے حد فکر تھی۔ سحرش سے بڑی دونوں بہنوں کی منگنیاں اس نے اپنی دونوں بہنوں کے بیٹوں سے کر دی تھیں اور اقرا کی شادی تو ہونے جا رہی تھی اقرا کے بعد اسے حمنیٰ کی شادی کرنا تھی شرمین چاہتی تھی کہ سحرش اور حمنیٰ کی شادی ایک ساتھ کر دے تاکہ کچھ اخراجات کے سلسلے میں بچت ہو سکے مگر سحرش کا ابھی کوئی مناسب رشتہ ہی نہیں آیا تھا اس لیے بھی وہ اکثر سحرش کو اپنے ہاں بلا لیتی تاکہ ملنے جلنے والوں سے اس کے لیے مناسب رشتہ ڈھونڈ سکیں مگر سحرش کے جانے کے بعد زاریہ بالکل ہی تنہا رہ جاتی تھی اور اکثر جب کبھی شہروز دیر سے رات کو گھر آتا تو وہ بھوکی ہی سو جاتی تھی جس سے اس کی دوائی کا بھی ناغہ ہو جاتا تھا اور اس کی بیماری بڑھ جاتی تھی وہ اکثر رات کو تنہا کمرے میں کبھی ٹی وی دیکھتی رہتی کبھی کوئی کتاب پڑھ لیتی اور جب تنہائی سے گھبرا جاتی تو ماضی کو یاد کرنے لگتی ماں باپ کی یاد ستاتی اپنی چند روزہ شادی شدہ زندگی کو یاد کرتی تو اس کی ذہنی رو بہک جاتی اور وہ بڑبڑانے لگی خود سے باتیں کرنے کی عادت تو اسے ماں کے انتقال کے فوراً بعد پڑ گئی تھی البتہ ایسا تبھی ہوتا تھا جب وہ بالکل اکیلی ہوتی تھی دوسروں کی موجودگی میں اس کی توجہ بٹی رہتی تھی اس لیے ذہنی خلفشار اس قدر بڑھ جاتا تھا کہ وہ اردگرد سے بیگانہ ہو کر اپنے تصورات کی دنیا میں کھو کر خیالی اور تصوراتی ہیولوں سے ہم کلام ہونے لگتی۔

ایک دن زاریہ کالج سے آئی تو کچھ دیر بعد سحرش اور شرمین بھی آ گئیں وہ دراصل اقرا کے لیے شاپنگ کر کے آئی تھیں۔ اور زاریہ کو دکھانا چاہتی تھیں۔ سحرش اوپر جا کر راحیلہ کو بھی بلا لائی راحیلہ ان کے لیے کھانا بھی ایک ٹرے میں رکھ کر لے آئی دراصل وہ شرمین کو یہ جتانا چاہتی تھی کہ وہ حقیقی بھابی ہو کر زاریہ کے پاس نہیں رہتی نہ ہی اس کا خیال رکھتی ہے جبکہ وہ منہ بھولے بھائی کی بیوی ہو کر بھی اس کی خدمت اور دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔ وہ اکثر شہروز اور زاریہ کو بھی یہ طعنے دیتی رہتی تھی

راحیلہ اور سحرش نے مل کر کھانا لاؤنج میں ٹیبل پر لگایا۔ راحیلہ نے بریانی قورمہ اور فروٹ ٹرائفل بنایا تھا دراصل رات ہی کو شرمین نے اسے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ کل صبح شاپنگ کے بعد آئیں گی اس لیے راحیلہ نے کھانا وغیرہ تیار کر لیا تھا۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے وہ ایسے ہی ہمیشہ زاریہ کو کھانا وغیرہ بنا کر دیتی ہے۔

ابھی وہ لوگ کھانا نکال ہی رہے تھیں کہ باہر بیل ہوئی۔ سحرش نے گیٹ کھولا تو عابدہ چوہدری اپنی بڑی بیٹی عدیلہ کے ساتھ کھڑی تھیں جبکہ سلیم گاڑی پارک کر رہا تھا۔ گاڑی ایک سائیڈ پر پارک کر کے وہ بھی آ گیا۔

السلام علیکم! عابدہ آنٹی عدیلہ باجی۔ کیسی ہیں آپ لوگ سحرش نے کہا'' وعلیکم السلام' کیا حال ہے میری بیٹی کا؟'' عابدہ چوہدری نے سحرش کو گلے لگا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا'' شکریہ آنٹی میں ٹھیک ہوں۔'' سحرش نے مودب لہجے میں کہا پھر عدیلہ نے بھی اسے گلے لگا کر پیار کیا'' وعلیکم سلام جیتی رہو بیٹی'' سلیم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شفیق لہجے میں کہا پھر سحرش نے ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اور اندر جا کر زاریہ کو اطلاع دی کچھ دیر بعد زاریہ اور شرمین ڈرائنگ روم میں آ گئیں اور راحیلہ اور سحرش مہمانوں کے لیے چائے وغیرہ بنانے لگیں۔

'' کیا بات ہے؟ زاریہ میری بہن تم اس قدر کمزور کیوں ہو گئیں؟ خیریت ہے نا؟'' عابدہ چوہدری نے زاریہ سے گلے ملتے ہوئے تشویشناک لہجے میں استفسار کیا۔'' ٹھیک ہوں بس کچھ دنوں سے طبیعت خراب تھی۔ زاریہ نے سلیم اور عدیلہ کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کمزور لہجے میں عابدہ چوہدری سے کہا۔ پھر شرمین سے گلے مل کر عابدہ چوہدری اور عدیلہ صوفے پر بیٹھ گئیں اور ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ جبکہ سلیم خاموشی سے ترحم آمیز انداز میں زاریہ کی گرتی ہوئی صحت کا جائزہ لیتا رہا۔ آج وہ پورے دو سال بعد اس کے گھر آیا تھا۔ اس کی والدہ کے انتقال کے بعد وہ تعزیت کے لیے آیا تھا پھر آنا ہی نہ ہو سکا۔ البتہ کبھی کبھار فون پر زاریہ کی خیریت دریافت کر لیتا تھا ایک آدھ بار وہ زاری کے ہمراہ کالج بھی گیا تھا مگر زاریہ سے ملاقات نہ ہو سکی تھی چونکہ وامق دو سال کے لیے ایک بزنس کورس کے سلسلے میں امریکہ گیا ہوا تھا اس لیے سلیم نے یہی سوچا تھا کہ وہ اس کی واپسی پر ہی اس کی شادی کے سلسلے میں زاریہ سے بات کرے گا اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں سحرش کا رشتہ کہیں اور طے نہ ہو جائے اس لیے وہ زاریہ سے فون پر رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ تاکہ اسے سن گن ملتی رہے کہ کہیں سحرش کا رشتہ تو طے نہیں کر دیا اس لیے ہر بار جب بھی وہ فون کرتا تھا زاریہ

سے سحرش کے بارے میں بطور خاص پوچھتا تھا۔

کچھ دیر بعد سحرش اور راحیلہ چائے اور دیگر لوازمات ٹرالی میں سجا کر لے آئیں سحرش نے نہایت سلیقے سے سب کو چائے اور لوازمات پیش کیے بڑے خوشگوار ماحول میں چائے پی گئی چائے کے بعد سحرش نے برتن وغیرہ سمیٹے ٹیبل کو صاف کیا اور برتن لے کر کچن میں چلی گئی تو عابدہ چوہدری نے کہا "سنو زاریہ آج ہم ایک خاص مقصد کے لیے بلکہ ایک درخواست لے کر تمہارے پاس آئے ہیں۔"

"میں سمجھی نہیں؟" زاریہ نے حیرت سے پوچھا

"دراصل ہم سحرش بیٹی کو اپنی بیٹی بنانا چاہتے ہیں۔" اب کے سلیم نے کہا

"سحرش آپ ہی کی بیٹی ہے" زاریہ نے یونہی بے خیالی سے کہہ دیا

"ہاں ٹھیک ہے مگر ہم اب ہم اسے باضابطہ طور پر اپنے گھر لے جا کر گھر کی رونق میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔" عابدہ چوہدری گویا ہوئیں اس پر شرمین، راحیلہ اور زاریہ ایک لمحے کے لیے خاموش سی رہ گئیں۔

"کیا بات ہے زاریہ آنٹی۔ آپ سب خاموش کیوں ہو گئے۔ کیا آپ لوگوں کو اچھا نہیں لگا ہمارا یوں آنا اور سحرش کا رشتہ طلب کرنا۔" عدیلہ نے صاف الفاظ میں کھل کر استفسار کیا

"نن..... نہیں..... عدیلہ ایسی کوئی بات نہیں ...... آپ...... لوگوں نے ہماری بچی کے لیے ...... اس طرح کی خواہش کا اظہار کر کے ہماری عزت افزائی کی ہے مگر دیکھیے نا شادی بیاہ اور رشتوں ناطوں کا معاملہ بے حد نازک ہوتا ہے۔ اس میں کئی طرح کی سوچ بچار اور صلاح مشورہ کرنا پڑتا ہے پھر ہی کوئی مناسب فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ نا" زاریہ نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

"بالکل، بالکل ...... آپ لوگ جب تک چاہیں سوچ سمجھ لیں۔ اچھی طرح صلاح مشورہ کر لیں۔ بیٹی کی مرضی بھی پوچھ لیں ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے میرے بیٹے نے ایم بی اے کے بعد دو سال تک امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور حال ہی میں وہ واپس آیا اور آج کل سارے کاروبار کو وہی دیکھ رہا ہے۔ نہایت محنتی، سلجھا ہوا اور شریف لڑکا ہے اس کی شرافت کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو گا کہ جیسا امریکہ گیا تھا ویسا ہی واپس آ گیا ہے" سلیم نے مسکرا کر خوشگوار لہجے میں کہا۔

"وہ سب ٹھیک ہے مگر پھر بھی ہمیں اس سلسلے میں کچھ سوچنا سمجھنا ہے۔ بچی کا باپ بھی سر پر نہیں ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ نادانستگی میں ہم سے کوئی ایسا ویسا فیصلہ نہ ہو جائے کہ کل کو بچی کی زندگی مشکل ہو جائے۔" شرمین نے سلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بہن۔ بیٹی کا معاملہ ہے سوچ بچار تو کرنی پڑتی ہے۔ مگر یقین ہے کہ آپ لوگوں کا جو بھی فیصلہ ہو گا وہ ہمارے بیٹے کے حق میں ہو گا" عابدہ چوہدری نے مسکرا کر کہا

"جی جو قسمت میں ہوا" راحیلہ نے کہا۔

اس طرح کی باتوں میں کچھ وقت گزار کر وہ لوگ چلے گئے تو وہ سب لاؤنج میں آ گئیں جہاں سحرش کھانا گرم کر کے دوبارہ ٹیبل پر لگا رہی تھی۔

کچھ دیر تک خاموشی سے کھانا کھایا گیا پھر شرمین بولی "پھر آپا کیا خیال ہے آپ کا اس رشتے کے سلسلے میں؟"

"میں کیا کہوں۔ تم ماں ہو تم بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔" زاریہ نے آہستگی سے کہا

"ایسا نہ کہیں آپا میں نے سحرش کو جنم ضرور دیا ہے مگر اصل ماں تو آپ ہیں اس کی جس نے اسے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا...... یہ سب آپ کی ہی ہمت اور حوصلہ ہے ورنہ میری کہاں بساط تھی کہ میں ان لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلا سکتی۔ بلکہ اقراء اور حسنیٰ کے تعلیمی اخراجات بھی آپ نے ہی پورے کیے تبھی آج دونوں بہنیں اپنے پیروں پر کھڑی ہیں۔ اور باعزت روزگار کما رہی ہیں تبھی میری بہنوں نے اپنے پڑھے لکھے برسرروزگار بیٹوں کے رشتے طے کیے ہیں میری یتیم اور بے آسرا بیٹیوں کے ساتھ۔ کیونکہ فی زمانہ رشتے ناطے بھی مادہ پرستی کی بنیاد پر ہوتے ہیں" شرمین نے گلوگیر لہجے میں کہا

اس پر کچھ دیر کے لیے کمرے میں گھمبیر سناٹا چھا گیا۔ پھر زاریہ بولی "انہوں نے ہمیں سوچنے سمجھنے کا وقت دیا ہے شہروز آ جائے اس سے بھی پوچھنا ہو گا کیونکہ اب تو وہی ہمارا سرپرست ہے اس کی مرضی کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا نا۔ پھر سب سے اہم سحرش کی مرضی ہے وہ پڑھی لکھی سمجھدار بچی ہے ہمارا زمانہ تو نہیں نا کہ ماں باپ نے جس کے پلے باندھ دیا لڑکی چپ چاپ اس کے ساتھ رخصت ہو گئی خواہ ساری زندگی اذیتوں کی سولی پر ہی لٹکی رہے۔"

"اور ایک بات تو آپ لوگ نظر انداز کر رہے ہیں سلیم صاحب وہی شخص ہیں جنہوں نے زاریہ آپا کی زندگی برباد کی۔" راحیلہ نے کہا۔

"ہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کیا پتہ بیٹا بھی باپ جیسا ہی ہو۔" شرمین نے بھی لب کشائی کی۔

"بس جو بھی فیصلہ کرنا ہے سارے پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر ہی کرنا ہے۔" زاریہ نے سحرش کو لاؤنج میں آتے دیکھ کر بات سمیٹی۔

خدا خدا کر کے نور اپنے فائنل ائیر کے امتحان سے فارغ ہوئی تو فیروزہ جلیل نے سکون اور اطمینان کی گہری سانس لی اور سجدہ شکر بجا لائیں کہ وہ نور کو ڈاکٹر بنانے کے مقصد میں کامیاب ٹھہریں ورنہ تو گزشتہ تین سال سے جب سے سکندر امریکہ گیا تھا نور کی ذہنی حالت انتہائی دگرگوں رہتی تھی۔

نور کے امتحان کے فوراً بعد ہی عروہ کی شادی کی تیاریاں عروج پر پہنچ گئیں اور نور بھی عروہ کے ساتھ مل کر شادی کی تیاریاں کرنے لگی اس نے بڑے اہتمام سے اپنے لیے سارے فنکشنز میں پہننے کے لیے بہترین سوٹ سلوائے تھے۔

چونکہ گھر میں بڑی بیٹی کی شادی تھی اور اتنے عرصے بعد خوشی کا موقع آیا تھا اس لیے گھر کا ہر فرد خوش تھا۔ گھر میں نیا رنگ روغن کرایا جا رہا تھا۔ گھر کا فرنیچر۔ پردے اور سیٹنگ بھی تبدیل کی جا رہی تھی۔ ارشاد علی اور اس کی بیوی شبنم اور چاروں بچے بھی آ رہے تھے۔ کویت سے عاطف اور سعودی عرب میں مقیم بھائی بھی آ رہا تھا۔ اتنے مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے بیسمنٹ والا پورشن بھی خالی کرا لیا گیا تھا۔

جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے نور غیر معمولی طور پر خوش رہنے لگی تھی کیونکہ اسے امید تھی کہ سکندر بھی ضرور آئے گا اور پورے تین سال بعد وہ اس سے ملنے کی خوشی میں دل ہی دل میں نہال ہو رہی تھی اور اس کے انگ انگ سے اس کی خوشی کا اظہار ہو رہا تھا، پھر رفتہ رفتہ مہمان آنے شروع ہو گئے، مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیے کئی نئے ملازم رکھے گئے تھے، ان میں دو کک اور دو بیرے تھے اس کے علاوہ کئی عورتیں مستقل طور پر رکھی تھیں جو صفائی کپڑے دھونے اور گھر کی جھاڑ پونچھ اور دیگر چھوٹے موٹے کام کرنے کی ذمہ دار تھیں۔ غرضیکہ ہر کام اعلیٰ پیمانے پر ہو رہا تھا۔

شادی سے ایک ہفتہ قبل ارشاد علی شبنم اور بچوں کے ہمراہ آ گیا مگر سکندر نہیں آیا کیونکہ اس کی پڑھائی کے شیڈول کی وجہ سے اسے چھٹی نہیں مل سکی تھی۔ اس پر نور ایک دم بجھ کر رہ گئی اور اب وہ ہر کام میں بڑی بے دلی سے حصہ لے رہی تھی مگر پھر اس نے یہ سوچ کر دل کو سمجھا لیا کہ اتنی جلدی تو سکندر آ بھی نہیں سکتا تھا جب تک کہ جس مقصد کے لیے وہ امریکہ گیا ہے پورا نہ ہو جائے۔

مہندی کا فنکشن ایک بڑے ہوٹل میں منعقد کیا گیا تھا لڑکے اور لڑکی والوں کی طرف سے مشترکہ انتظام تھا، مشترکہ سارا کیا سارا انتظام لڑکی والوں کی طرف ہی سے تھا کیونکہ لڑکے والوں کی اتنی حیثیت ہی کہاں تھی کہ اس شاندار تقریب کا اہتمام کرسکیں، چونکہ رشتہ داری کا معاملہ تھا اس لیے مہمانوں کو یہی تاثر دیا گیا تھا کہ یہ مشترکہ طور پر انتظام کیا گیا ہے۔

عروہ بے حد خوبصورت سبز اور سرخ رنگ کے فراک اور چوڑی دار پاجامے میں انتہائی حسین لگ رہی تھی اور آج جب اس نے کڑھائی والا انتہائی دیدہ زیب ڈریس پہنا اور فیشل کروا کر بیوٹی پارلر سے میک اپ کرایا تو اس کے حسن کو چار چاند لگ گئے۔

نور نے دلہن کی بہنوں کی حیثیت سے اسی کی طرح کے ڈریسیز بنوائے تھے۔ بالوں کو بیوٹی پارلر سے چوٹیوں کی صورت میں بنوا کر ان میں ہرے اور سرخ رنگ کے پراندے انتہائی دیدہ زیب لگ رہے تھے۔ بالوں پہ سرخ اور سبز رنگ کی پٹی بھی اپنی الگ بہار دکھا رہی تھیں غرضیکہ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دلہن کون سی ہے عروہ اور نور کی سہیلیوں نے بھی ملتے جلتے ڈریسیز پہن رکھے تھے پھر جب وہ مہندی کی مشعلوں سے سجی ٹوکریاں اٹھا کر ہال میں داخل ہوئیں تو یونہی لگ رہی تھیں جیسے پریاں قطار در قطار چلی آ رہی ہوں۔ پھر اسٹیج کے پاس پہنچ کر جس پر زرتار سجی ہوئی کرسی پر دلہن اور دلہا بیٹھے تھے وہاں ٹوکریاں رکھ دی گئیں تو سارا ہال جھلملاتی روشنیوں سے جگمگانے لگا اور پھر سرخ و سبز پہلے پیرہنوں میں لڑکیوں نے لڈی ڈالنی شروع کی تو گویا ایک وجد سا طاری ہو گیا۔

ارشاد علی کے چاروں بچے جو امریکہ میں پیدا ہوئے اور پل بڑھ رہے تھے نہایت دلچسپی اور اشتیاق سے یہ خوبصورت مناظر دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے بلکہ دونوں لڑکے تو جوش میں آ کر خود بھی رقص کرنے لگے جبکہ دونوں بہنیں محض تالیاں بجانے ہی پر اکتفا کر رہی تھیں۔ جب نوجوانوں کی ٹولیاں ڈانس کر کے تھک کر بیٹھ گئی تو پھر رسم کا آغاز ہوا۔ پہلے دونوں خاندانوں کی بزرگ خواتین نے لڑکے اور لڑکی کی ہتھیلیوں پر رکھے ٹشو پیپر پر تھوڑی سی مہندی رکھی پھر سر پر تیل لگایا اور چمچ سے تھوڑی سی مٹھائی دونوں کو کھلائی۔ پھر دیگر افراد نے رسم ادا کی ساتھ ہی ساتھ لڑکی اور لڑکے پر روپے وار کر سامنے رکھے ٹیبل پر ڈھیر کیے جا رہے تھے۔

نور بھی ہی کھلے گھیر کی سرخ اور سبز رنگ کی فراک میں ملبوس تھی جس پر گوٹے کناری کا بھاری کام تھا اور ویسا ہی گھونگروں سے سجا ہوا دوپٹہ کندھوں پر سیٹ کیا ہوا تھا۔ بالوں، کانوں اور گلے اور بازوؤں پر سرخ گلاب کے زیورات پہن رکھے تھے اور وہ خود بھی ایک خوبصورت نوشگفتہ پھولوں کی ڈالی محسوس ہو رہی تھی خوبصورتی سے کیے میک اپ میں اس کا چہرہ بے حد دلکش لگ رہا تھا اگرچہ چہرے پر ہلکا سا افسردگی کا پرتو بھی تھا جو سکندر کے اس خوبصورت محفل میں شامل نہ ہونے کے سبب تھا تاہم وہ پھر بھی اپنی خوبصورت مسکان میں افسردگی کو چھپانے میں

کافی حد تک کامیاب رہی تھی۔

''یار یہ لڑکی جو عروہ باجی کے ساتھ بیٹھی ہے کون ہے یہ؟'' نور کو پرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے عاطف کے ایک بے تکلف دوست نے عاطف سے پوچھا۔ ''او...... یہ...... میری کزن ہے۔ حال ہی میں میڈیکل کے فائنل ایئر کے امتحان سے فارغ ہوئی ہے بڑی ذہین اور نائس لڑکی ہے۔'' عاطف نے نور کو ستائشی انداز میں دیکھتے ہوئے اپنے دوست فاخر کو جواب دیا ''خوبصورت بھی بے حد ہے کہتے ہیں کہ خوبصورت لڑکیاں زیادہ ذہین نہیں ہوتیں مگر اس پر یہ بات صادق نہیں آتی۔'' فاخر نے نور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار...... آہستہ بولو اور یوں گھور گھور کر مت دیکھو۔ فیروزہ پھپھو نے دیکھ لیا تو کان پکڑ کر تمہیں ہال سے نکال باہر کریں گی۔'' عاطف نے فاخر سے تنبیہی لہجے میں کہا۔

''ناؤ...... لیو...... دس ٹاپک۔''

''چلو اب ہماری باری ہے۔ رسم ادا کرنے کی۔'' عاطف نے فاخر کو ٹالتے ہوئے کہا اور پھر وہ دونوں بھی اسٹیج کی جانب بڑھ گئے۔ جب نور اسٹیج سے اتر رہی تھی تو فاخر نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے سرگوشی کی ''لکنگ ویری اٹریکٹیو!''

جواب میں نور نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ جلدی سے اسٹیج کی جانب متوجہ ہو گیا۔

رسم کے بعد کھانے کا دور چلا۔ اور کھانے کے بعد ایک مرتبہ پھر ڈانس اور گانوں کی بھرپور محفل جمی اور رات گئے تک یہ فنکشن ہوتا رہا اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے اپنے ارمان پورے کیے اسی خوشی کے موقع پر بزرگ خواتین حضرات نے بھی نوجوان نسل کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ ایسے موقع روز روز تو نہیں آتے ویسے بھی زیادہ تر خاندان کے افراد ہی تھے۔

شادی کے سارے فنکشن میں نور فاخر کی نگاہوں کا مرکز رہی بلکہ جب کبھی اسے اس کے قریب جانے کا موقع ملتا تو وہ ہولے سے کوئی نہ کوئی ستائشی جملہ اس کی سماعتوں میں اتار دیتا تھا مگر نور یوں انجان بن جاتی جیسے کہ سنا ہی نہ ہو۔

شادی کی تقریبات اختتام پذیر ہوئیں تو نور کچھ عرصے کے لیے لاہور چلی گئی۔ جبکہ فاخر کی حالت بے حد دگرگوں ہو گئی تھی۔ وہ بہانے بہانے عاطف کے گھر کے چکر لگاتا رہتا کہ کسی طرح نور کی ایک جھلک دیکھ سکے مگر ہر بار مایوسی ہی ہوئی۔

☆......☆

کچھ ضروری ٹیسٹوں اور کورسز کے بعد بالآخر سکندر کو واشنگٹن یونیورسٹی میں میڈیکل کے شعبے میں داخلہ مل گیا۔ اسے پہلے ایم ڈی کرنا تھا اس کے بعد اسپیشلائزیشن کر سکتا تھا یہ ایک طویل جدوجہد تھی جو اپنے نصب العین کو پانے کی تگ ودو میں مصروف سکندر کے لیے بڑی اہمیت کی حامل تھی اور وہ اپنی عادت کے مطابق پڑھائی کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ یونیورسٹی کی دیگر سرگرمیوں میں بھی متحرک ہو گیا۔

اگرچہ سکندر کے سارے اخراجات ارشاد علی نے اپنے ذمے لے رکھے تھے بلکہ ایک بڑی رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دی گئی تھی مگر اس کے باوجود سکندر شام کو چند گھنٹوں کے لیے ایک ڈاکٹر کے کلینک میں اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ غیر نصابی سرگرمیوں اور کلینک کی چند گھنٹوں کی ملازمت کے علاوہ سکندر کی تمام تر توجہ اپنی پڑھائی کی جانب تھی اس لیے اس کا تعلیمی ریکارڈ انتہائی شاندار جا رہا تھا۔ وہ اپنے کلاس فیلوز میں اپنے حسن سلوک اور ذہانت کی وجہ سے انتہائی پاپولر تھا۔ اب اس کا ایم

ڈی کا کورس بھی مکمل ہونے میں صرف ایک سال ہی رہ گیا تھا پھر اس نے ہارٹ اسپیشلسٹ کا کورس کرنا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ ایم ڈی کے گریڈ میں اچھے نمبر آئیں تاکہ اسے باآسانی اپنے پسندیدہ شعبے میں داخلہ مل سکے۔ اب وہ اپنا سارا فالتو وقت لائبریری ہی میں اسٹڈی میں مصروف رہتا تھا۔ کلینک کی جاب بھی چھوڑ دی تھی۔

ایک دن سکندر ویک اینڈ پر اپنے ہاسٹل کے کمرے میں یونہی نیٹ سرچنگ کر رہا تھا۔ اس نے فیس بک پر اپنا اکاؤنٹ بنا رکھا تھا اور کبھی کبھار ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ جب پڑھائی سے اکتا جاتا تو پاکستان اور دنیا بھر میں موجود اپنے فیس گروپ فرینڈز سے گروپ چیٹنگ کر لیتا تھا۔ اس نے ایک ڈاکٹرز کا گروپ بھی جوائن کیا ہوا تھا اور اس وقت بھی وہ یونہی گروپ میں مختلف ممبرز کی طرف سے شیئر کی گئی پوسٹیں دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک پوسٹ پر پڑی پوسٹ شیئر کرنے والے یا والی کی آئی ڈی بلومنگ فلاور کے نام سے تھی۔ اور ڈی پی کی جگہ ایک زرد رنگ کے گلاب کا پھول دیا ہوا تھا۔ پوسٹ بیحد میننگ فل تھی۔ سکندر نے بے اختیار اس پوسٹ کو نہ صرف لائک کیا بلکہ اس پر بھرپور کمنٹ بھی دیا۔ دوسرے ہی لمحے بلومنگ فلاور نے اس کے کمنٹ کو لائک کر لیا۔ سکندر نے رپلائی کرتے ہوئے تھینک یو لکھا تو جواب میں ویلکم لکھا گیا اور پھر سلسلہ چل پڑا اور سکندر جو پہلے کبھی کبھی ہی فیس بک پر آن لائن ہوتا تھا اب اکثر ہی جب بھی موقع ملتا فیس بک کھولتا پھر ڈاکٹرز ورلڈ نامی گروپ اوپن کرتا تو وہاں بلومنگ فلاور کی دو تین پوسٹیں ہوتیں جنہیں وہ لائک کرتا اور بلومنگ فلاور کی طرف سے فوراً اس کے کمنٹس کو لائک کر لیا جاتا۔ رفتہ رفتہ سکندر نے بھی کچھ اچھی پوسٹیں گروپ میں شیئر کرنی شروع کر دیں دوسرے لوگوں کے علاوہ بلومنگ فلاور کی جانب سے ان پوسٹس کو نہ صرف پسند کیا جاتا بلکہ ان پر ستائشی کمنٹس بھی دیے جاتے۔ پھر سکندر نے بلومنگ فلاور کو فرینڈ ریکوئیسٹ سینڈ کی اور دوسرے ہی لمحے ریکوئسٹ ایکسپٹ کر لی گئی اور یوں گروپ کی بجائے اب ان باکس اور واٹس اپ پر باقاعدہ چیٹنگ شروع ہو گئی۔

سکندر نے تو اپنا اصل نام اور اصلی تصویر دی ہوئی تھی اس لیے اسے اپنا زیادہ تفصیلی تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی البتہ اس نے یہ ضرور بتایا کہ وہ شکاگو کی ایک یونیورسٹی کے میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں ایم ڈی کر رہا ہے دوسری طرف سے بلومنگ فلاور نے بتایا کہ وہ اسلام آباد میں رہتی ہے اس کا تعلق ایک متوسط فیملی سے ہے اور یہ کہ وہ میڈیکل کالج کے فائنل ائیر میں ہے اور چند ماہ تک وہ فائنل امتحان سے فارغ ہو جائے گی۔ سکندر کے بیحد اصرار کے باوجود اس نے اپنا اصلی نام، پتہ اور تصویر نہیں دی پھر سکندر نے بھی کہنا چھوڑ دیا۔ وہ دونوں رات گئے تک آپس میں مختلف موضوعات پر بات چیت کرتے رہتے سکندر اسے امریکہ کی زندگی کے شب و روز اور یونیورسٹی کی سرگرمیوں کے بارے میں بتاتا جبکہ بلومنگ فلاور اسے اپنے کالج' فرینڈز اور دیگر ایکٹیوٹیز سے آگاہ کرتی البتہ اپنی ذاتی زندگی کو بہت کم موضوع، گفتگو بناتی اور وہ کہتی تھی کہ اسے اپنی ذات کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں اس پر سکندر بھی اسے مجبور نہ کرتا کیونکہ سکندر کی تو یہ ہمیشہ سے ہی پسندیدہ ہابی رہی تھی کہ نت نئی لڑکیوں سے دوستیاں کرنا فیس بک پر بھی اس کی دنیا بھر سے بے شمار فرینڈز تھیں مگر ایم ڈی کی طرف اسٹڈی کی وجہ سے اب وہ ان سے کم کم بات چیت کرتا تھا۔ البتہ بلومنگ فلاور کی لیے دیے رہنے کی عادت اور اپنی ذات کے کئی گوشے خفیہ رکھنے کی وجہ سے سکندر کو اس میں عجیب سی دلچسپی اور تجسس محسوس ہوتا تھا اس لیے وہ اس سے اکثر ہی بات کرتا رہتا تھا تاکہ کسی طرح وہ اپنی پراسرار شخصیت کو اس پر واضح کر سکے مگر وہ اس سلسلے میں بے حد محتاط تھی۔

''ہائے مسٹر...... کین آئی سٹ ہیئر'' سکندر لائبریری میں اپنے مخصوص گوشے میں بیٹھا کچھ ضروری نوٹس تیار کر رہا تھا۔ اس کے سامنے میڈیکل بکس کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اور وہ اپنے گردونواح سے بے خبر مختلف کتابوں کو کھنگال کھنگال کر اپنے مطلوبہ ٹاپکس ڈھونڈ رہا تھا کہ ایک مترنم آواز اس کی سماعتوں میں رس گھول گئی اس نے چونک کر سر اٹھایا تو چند لمحوں کے لیے پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ اس قدر دلکش سراپا اس نے کبھی زندگی میں نہیں دیکھا تھا یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کسی ماہر سنگ تراش نے فرصت میں بیٹھ کر اس خوبصورت جسم کو مجسمے کی صورت ڈھالا ہو اور پھر جب اس نے اس سراپے کی مالکن کے چہرے پر نگاہ پڑی تو وہ مبہوت سا ہو کر رہ گیا کوئی اس قدر بھی حسین ہو سکتا ہے وہ اس کے انتہائی دیدہ زیب نقوش کے حامل شہد اور چودھویں رات کے چاند کی چاندنی سے گندھی ہوئی رنگت کو آنکھوں کے راستے دل میں اتارتے ہوئے سوچے جا رہا تھا۔ بڑی بڑی انتہائی حسین نیلی آنکھیں۔ شانوں پر بکھرے بال سنہری سونے کی تاروں سے بنے ہوئے تراشیدہ گیسو۔ خوبصورت ستواں لمبی ناک اور گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ترشے ہوئے ہونٹ انتہائی دلکش بیضوی چہرہ غرضیکہ چہرے کا ایک ایک نقش اپنی جگہ ایک شاہکار تھا۔

''اے مسٹر واٹ آر یو لکنگ ایٹ؟'' اس ساحرہ نے دوبارہ اپنی آواز کا ترنم بکھیرا تو سکندر ایک دم سے ہوش کی دنیا میں واپس آ گیا اور قدرے شرمندگی سے سر جھکا کر بولا ''یو کین سٹ وئیر ایور یو لائیک۔''

''تھینکس'' کہہ کر وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے مختصر سا لباس پہن رکھا تھا۔ چھوٹا سا ٹائیٹ سرخ رنگ کا بلاؤز سیاہ شارٹ اسکرٹ۔ وہ یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ اتنی شدید سردی میں خود کو دکھانے کی یہ کیسی خواہش ہے کہ موسم کی سختیوں کی بھی اسے پروا نہیں رہی حالانکہ اس کا سراپا قد بے حد سڈول اور سانچے میں ڈھلا ہوا جسم تو پورے لباس میں بھی ایسے ہی خوبصورت محسوس ہوتا اور پھر چہرے کی دلکشی کی وجہ سے اسے تو عریانیت کا سہارا لینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

''آئی ایم...... ٹینا...... اینڈ یو......؟'' اس نے اپنا نازک سا گلابی ہاتھ سکندر کی جانب بڑھاتے ہوئے اپنے موتیوں جیسے خوبصورت دانتوں کی نمائش کی۔ ''میں...... سکندر علی...... فرام پاکستان۔'' سکندر نے قدرے فخریہ لہجے میں کہا۔

''کیا؟...... یومین۔ وہ Terrorist کنٹری۔''

''یو شٹ اپ...... ہاؤ ڈیر یو ٹاک اباؤٹ مائی کنٹری ان دس وے؟'' سکندر نے کھڑے ہوتے ہوئے غصے سے لال پیلے چہرے کے ساتھ ٹینا کو گھورتے ہوئے چیخ کر کہا۔ تو اردگرد بیٹھے اسٹوڈنٹس چونک کر اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ سکندر نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور غصے سے بڑبڑاتا ہوا لائبریری سے نکل گیا اور ٹینا اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔

☆......☆

''پھپھو...... وہ اس دن عابدہ آنٹی اور سلیم انکل کس لیے آئے تھے؟'' سحرش نے زاریہ کے سر کو اپنے نرم ہاتھوں سے دباتے ہوئے پوچھا۔ سحرش کی بڑی بہن اقرا کی شادی کی تقریبات سے فارغ ہو کر

زاریہ اور سحرش آج تقریباً ایک ہفتے بعد اپنے گھر واپس آئی تھیں چونکہ مہمانوں کا آنا جانا بھی لگا رہتا تھا پھر اور بے شمار بکھیڑے تھے۔ اس لیے شادی سے تین دن پہلے ہی زاریہ اور سحرش ثمرین کے گھر ہی میں رہنے کے لیے چلی گئی تھیں چونکہ کالج سے بھی ایک ہفتے کی چھٹیاں تھیں اس لیے زاریہ اور سحرش نے بھرپور طریقے سے شادی کی تیاریوں میں ثمرین کا ہاتھ بٹایا راحیلہ بھی سارا دن ادھر ہی رہتی تھی البتہ رات کو شہروز اسے اور بچوں کو گھر لے آتا تھا۔

شادی کی تمام تقریبات کافی حد تک خوش اسلوبی سے طے پا گئیں۔ شہروز اور زاریہ نے ہی زیادہ تر اخراجات برداشت کیے تھے اور یوں ثمرین باعزت طریقے سے اپنی بڑی بیٹی کو رخصت کر سکی اور اس کے لیے اس کی زبان ان دونوں کا شکریہ ادا کرتے نہیں تھکتی تھی۔

شادی کے ہنگاموں کی وجہ سے زاریہ کی نیند کافی متاثر ہوئی تھی پھر کثر دوائیوں کا بھی ناغہ ہو جاتا تھا اور مصروفیات کی وجہ سے تکان بھی محسوس ہوتی مگر زاریہ نے اپنی طبیعت کی طرف زیادہ دھیان نہ دیا مگر جب گھر واپس آئی تو شوگر اور بلڈ پریشر شوٹ کر چکے تھے۔ سر میں بھی شدید درد تھا جس پر سحرش نے اسے ڈانٹا تھا کہ وہ اپنی صحت کو نظر انداز کر کے اپنی حالت خود ہی خراب کر لیتی ہے اور اس کی پیار بھری ڈانٹ سن کر زاریہ مسکرائے جا رہی تھی اس پر سحرش کو اس پر اور بھی لاڈ آ رہا تھا اور اس طرح یونہی سر دباتے دباتے اسے کچھ دن قبل عابدہ چوہدری اور سلیم کی آمد کا واقعہ یاد آ گیا تو وہ زاریہ سے استفسار کر رہی تھی۔

''ک...... کچھ...... کچھ نہیں۔ ویسے ہی عابدہ آپا کہہ رہی تھیں کہ وہ بہت دنوں سے اس کا ملنے کا موڈ ہو رہا تھا۔'' زاریہ نے بظاہر لاپرواہی سے کہا۔

''پھپھو...... ایک بات بتاؤں آپ کو۔ جھوٹ بولتے ہوئے آپ ذرا بھی اچھی نہیں لگتیں۔'' سحرش نے زاریہ کے بستر کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے کہا۔

''جھوٹ...... کیسا جھوٹ......؟ یہ...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا؟'' زاریہ نے رک رک کر استفسار کیا۔

''مجھے سب پتہ ہے...... کہ وہ لوگ کس مقصد کے لیے آئے تھے مجھے راحیلہ آنٹی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔'' سحرش نے گویا دھماکہ کیا۔

''یہ راحیلہ بھی نا پیٹ کی بہت ہلکی ہے کوئی بات اپنے تک نہیں رکھ سکتی۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ جس گھر میں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر آتے ہی رہتے ہیں۔ اب میری چاند سی شہزادی کو اگر سلیم اپنے بیٹے کے لیے پسند کر لیا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے میری چندا ہے ہی اتنی خوبصورت۔'' زاریہ نے پیار سے سحرش کی روشن پیشانی پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

''قباحت ہے نا...... انکل سلیم کون ہوتے ہیں مجھے اپنے بیٹے کے لیے پسند کرنے والے۔ اپنا کردار بھول گئے ہیں میری پھپھو کی زندگی برباد کر کے اب بڑے بھولے بھالے بن کر یوں بیٹے کا رشتہ لینے آ گئے ہیں جیسے کہ انہوں نے کچھ کیا ہی نہ ہو آپ...... آپ صاف صاف انکار کر دیجیے گا پھپھو مجھے نہیں کرنی اس خود غرض اور ظالم شخص کے بیٹے سے شادی وادی۔'' سحرش نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

''جب میں نے شہروز سے ذکر کیا تو اس کا بھی یہی ردعمل تھا مگر مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تم دونوں چچا بھتیجی آخر سلیم کی ماضی کی غلطی کو لے کر اس قدر کیوں سیخ پا ہو جاتے ہو زیادتی تو اس نے میرے ساتھ کی تھی جب میں نے اسے معاف کر دیا تو تم لوگ بھی اب اس تلخ قصے کو بھول جاؤ۔ وہ شخص اپنے کیے پر اس قدر شرمسار ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کی پیدائش کے فوراً بعد ہی اس کا رشتہ اپنے طور پر ہی تم سے طے کر دیا تھا حالانکہ تم اس سے تقریباً دو سال بڑی ہو اور اس نے اپنی بیوی اور بچوں کو بھی یہ بات بتا دی تھی تو اس سے بڑا ثبوت اس کے اخلاص کا کیا ہو سکتا ہے۔'' زاریہ نے رسان سے کہا۔

''جیسا باپ ویسا بیٹا آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے آپ نے کسی طرح برداشت کر لیا کہ آپ کا بھرا پرا خاندان تھا، ماں باپ تھے اور بھائی تھے۔ اگر اس شخص کے بیٹے نے بھی مجھے کم حیثیت گردان کر چھوڑ دیا تو میں کہاں جاؤں گی؟ یہ بھی سوچا ہے کہ بھی آپ نے۔'' سحرش نے بے تحاشا روتے ہوئے استفسار کیا۔

''او ہو میری جان...... میری پیاری بیٹی اگر تم نہیں چاہتی ہو تو ہرگز ایسا نہیں ہوگا زندگی تم نے گزارنی ہے، میں نے یا ثمرین نے نہیں جہاں اللہ نے اقرا اور اس سے چھوٹی کے اتنے اچھے رشتے عطا کیے ہیں وہاں تمہارا بھی کوئی نہ کوئی رشتہ مل ہی جائے گا۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ مجھے تو تمہاری دوست نیلو کا بھائی جہاں زیب بھی بہت پسند تھا مگر وہ لوگ تو یہاں سے چلے ہی گئے ہیں شاید نیلو کا تو تم سے کوئی رابطہ بھی نہیں رہا ہے اب زاریہ نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے سحرش کے آنسو صاف کرتے ہوئے پیار سے کہا۔

نیلو اور جہاں زیب کے ذکر کے ساتھ ہی سحرش کے تصور میں وامق کی صورت در آئی۔ دو سال سے اس کو اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اگرچہ اس نے اسے اپنا سیل نمبر دیا تھا مگر فطرتاً شرمیلی سحرش کی کبھی ہمت ہی نہ ہوئی تھی اس سے رابطہ کرنے کی۔

☆......☆

''آپا...... آپ نے نور کے رشتے کے سلسلے میں کچھ سوچا ہے خیر سے ڈاکٹر تو بن ہی گئی ہے اب یہی عمر ہوتی ہے لڑکیوں کے رشتے ناطے کرنے کی۔'' نجمہ نے فیروزہ جلیل سے پوچھا۔ وہ دونوں لان میں بیٹھی شام کی چائے پی رہی تھیں۔ آج موسم کافی خوشگوار تھا۔ کئی روز کی شدید گرمی کے بعد دوپہر میں ہلکی بارش ہو گئی تھی جس سے گرمی کی شدت میں کافی حد تک کمی آ گئی تھی۔

گھر میں نجمہ اور فیروزہ جلیل ہی تھیں نور ابھی تک لاہور سے نہیں لوٹی تھی۔ عروہ شادی کے بعد پنڈی میں اپنے سسرال میں مقیم تھی۔ ثمرہ آج کل اپنی کچھ دوستوں کے ساتھ سوات، کاغان وغیرہ کی سیاحت کے لیے گئی ہوئی تھی۔

فیروزہ جلیل بھی نور کے لاہور جانے کی وجہ سے خود کو اکیلا محسوس کر رہی تھیں۔ نیچے والے پورشن میں تو وہ دونوں عروہ کی شادی کے بعد ہی سے منتقل ہو گئی تھیں۔

میں نے تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا ہے کہ اس نے اپنی پڑھائی مکمل کر لی ہے اب رزلٹ کے بعد ہاؤس جاب کرے گی پھر اس کا ارادہ چائلڈ اسپیشلسٹ بننے کا ہے خیر وہ تو بعد کی باتیں ہیں فی الحال تو میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ کسی طرح کوئی مناسب رشتہ مل جائے تو اس کو اپنے گھر کا کر دوں۔

میری کتنی ہی خواہش تھی کہ سکندر اور نور کی شادی ہو جائے دونوں ذہین بھی ہیں خوبصورت بھی پھر ڈاکٹر بھی، چاند سورج کی جوڑی ہوتی مگر سکندر کے تو ارادے ہی اور تھے خیر اللہ دونوں کے لیے جو مناسب اور بہتر ہو وہی کرے گا۔''

ہاں یہ تو میری بھی دلی تمنا تھی کہ سکندر کا رشتہ نور کے ساتھ ہو جائے میں نے تو کئی بار سکندر سے

اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا مگر وہ یہی کہتا ہے کہ اس کا ابھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔

آپا وہ عاطف کا دوست ہے فاخر...... آپ تو ملی ہیں اس سے' بے حد مہذب' اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ خاندان بھی اچھا ہے۔

فاخر نے عروہ کی شادی میں نور کو دیکھا تھا تو اسے بہت پسند آئی تھی۔ اس نے اس سلسلے میں عاطف سے بات کی تھی کہ وہ اپنے والدین کو رشتے کی غرض سے لانا چاہتا ہے پھر نور لاہور چلی گئی اور عاطف نے کویت جاتے ہوئے مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ سے بات کرلوں اور جیسے ہی نور لاہور واپس آئے فاخر کو بتادوں تا کہ وہ اپنے والدین سے بات کر سکے۔

☆......☆

سکندر یونیورسٹی کے لان میں ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس کا دوست وحید احمد بھی اس کے پاس ہی بیٹھا تھا پھر اس کی کلاس کا وقت ہو گیا تو وہ کلاس اٹینڈ کرنے چلا گیا۔ سکندر بھی لائبریری جانے کا سوچ رہا تھا کہ کسی نے اس کے قریب آ کر زور سے ہائے کہا آواز اس قدر اچانک اور اونچی تھی کہ سکندر یکدم چونک پڑا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کے سامنے وہی لڑکی کھڑی تھی جس سے اس دن لائبریری میں اس کی ہلکی پھلکی جھڑپ ہوئی تھی۔ سکندر کے ذہن سے اس کا نام تو نکل ہی گیا تھا کیونکہ اس بات کو دو ہفتے ہو چکے تھے البتہ اس کا حسین چہرہ وہ باوجود کوشش کے فراموش نہیں کر سکا تھا اور اکثر جب بھی وہ فارغ ہوتا تو اس کا تصور اسے ڈسٹرب کرنے لگتا۔

''کین آئی سٹ ہیئر؟'' اس نے کہا اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس کے بے حد قریب انتہائی بے تکلفی سے براجمان ہو گئی۔

''Why you are always so angry?'' اس نے سکندر کی بڑی بڑی پرکشش براؤن آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا

''You disgraced my country'' سکندر نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

''I said sorry & I am sorry again.'' اس نے اپنی انتہائی حسین بلوریں آنکھیں سکندر کے پرکشش چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے اپنے یاقوتی لبوں پر ایک دلکش مسکراہٹ بکھیر کر انتہائی معصومیت سے کہا۔

''Its ok but plz be careful next time'' یہ کہہ کر سکندر نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف دیا۔ آئی ایم سکندر علی۔ اسٹوڈنٹ آف فائنل ایئر ایم ڈی۔ فرام پاکستان اینڈ وہاٹ اباؤٹ یو؟'' سکندر نے بھی چہرے سے خفگی کے تاثرات دور کر کے قدرے بشاش لہجے میں کہا۔

''I am jew اینڈ I am tina'' اس نے مسکرا کر سکندر کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''اوہ تو تم یہودی ہو۔'' اور ٹینا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سر ہلا دیا

Very tradional family I have a 2 brothers and I am erdest.

ٹینا نے ایک گہری سانس لے کر اپنی بات مکمل کی اور پھر اپنے شولڈر پہ لٹکے ہوئے کینوس بیگ سے ایک چیونگم کا پیکٹ نکالا ایک گلابی رنگ کی چھوٹی سی چیونگم نکال کر اپنے منہ میں رکھ لی اور دوسری سکندر کی جانب بڑھا دی۔ پھر اپنی کلائی پر بندھی نازک سی رسٹ واچ پر نظر پڑی تو بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اوہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ میری جاب کا ٹائم ہو گیا ہے او کے بائے پھر ملیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی کتابیں کینوس بیگ میں ٹھونستی ہوئی تیز تیز قدموں سے بیرونی گیٹ کی جانب چل پڑی۔ اور سکندر مبہوت سا ہو کر اسے لہراتے ہوئے سنہری ریشمی بالوں کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

اور پھر مزید ایسی ہی دو چار اتفاقی ملاقاتوں کے بعد ان دونوں میں گہری دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا اور پھر ہر ویک اینڈ اکھٹے کسی نہ کسی ریسٹوران یا تفریحی مقام پر گزارنا دونوں کے لیے لازمی ٹھہرا تھا اب پڑھائی کے علاوہ سکندر کی دو ہی مصروفیات تھیں نیٹ پر بلومنگ فلاور سے چیٹنگ اور ٹینا سے ملاقاتیں۔

☆......☆

''وہ عابدہ چوہدری کا فون آیا تھا آج وہ پھر پوچھ رہی تھی کہ ہم نے سحرش کے رشتے کے سلسلے میں کیا سوچا ہے کب تک انہیں جواب ملے گا۔'' زاریہ نے چائے کا آخری سپ لے کر خالی کپ ٹیبل پر پڑے ٹرے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''سوچنا کیا ہے۔ صاف جواب دے دیں میں نے کوئی نہیں اس خود غرض شخص کے بیٹے سے شادی کرنی جس نے میری پیاری پھپھو کو اس قدر دکھ دیے اور زندگی بھر انہیں تنہائی کا تلخ زہر پینے کے لیے چھوڑ دیا۔'' سحرش نے بے حد غصیلے لہجے میں کہا۔

''لیکن بیٹا تم نے کہیں نہ کہیں تو شادی کرنی ہی ہے ساری زندگی تو یہاں نہیں بیٹھے رہنا۔ پھر جو لوگ اس قدر چاہت سے تمہیں اپنانا چاہتے ہیں وہی کیوں نا؟''

''ویسے باجی سحرش ٹھیک کہتی ہے۔ مجھے تو خود وہ شخص زہر لگتا ہے آپ کی زندگی برباد کر کے اب سحرش کو اپنی خود غرضی کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔'' شہروز نے بسکٹ کھاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''وقت وقت کی بات ہے۔ تب اس کے حالات اچھے نہیں تھے اور پھر عابدہ آپا نے اس کی مرضی کے خلاف اسے جھوٹے سچے خواب دکھا کر مجھ سے اس کی شادی کروائی تھی جبکہ وہ فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتا تھا اور باہر جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواہشمند تھا اس نے میرے ساتھ جو کچھ کیا وہ غصے اور جھنجلاہٹ میں کیا تھا شاید میرے مقدر ہی میں یہ دکھ لکھا تھا۔ مگر ایک شوہر کے علاوہ اللہ نے مجھے ہر نعمت سے نوازا شاندار ملازمت، والدین' بھائی اور پھر سحرش۔ اور اپنی ان مصروفیات میں کھو کر مجھے نہ وقت گزرنے کا احساس ہوا اور نہ ہی کبھی اپنی کسی محرومی کا۔ اگر میں شادی شدہ زندگی گزار رہی ہوتی تو تب بھی یہی کرنا تھا جو اب کر رہی ہوں دو چار بچے ہوتے اور ان کی ذمہ داریاں تو یہاں بھی سحرش اور ثمر دونوں اور سحرش کی تینوں بہنیں تو پھر تمہارے بچے بھی تو میری آنکھوں کے تارے ہوئے نا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مصلحت کی وجہ سے ہم سے کوئی چیز چھن جاتی ہے تو وہ اس سے بہتر متبادل عطا فرما دیتا ہے۔ اور یوں بھی وہ بار بار ماضی کی طرف دیکھنے اور مستقبل کے بارے میں سوچنے کے بجائے اپنے آج کو بہتر اور بھرپور طریقے سے گزارنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے اس پر بھروسہ کرنا چاہیے استخارہ کر کے اور بہتری کی توقع کر کے جو مناسب ہو وہ کام کر لینا چاہیے۔'' زاریہ نے رسان سے کہا۔

شہروز اور زاریہ نے فیصلہ کیا کہ اگلے اتوار کو وہ لوگ لڑکے کو دیکھنے کے لیے سلیم کے گھر جائیں گے۔ زاریہ نے عابدہ چوہدری کو فون کر کے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ خوش ہو گئی۔ زاریہ نے شرمین

کو بھی فون کر دیا تھا اور اس نے بھی اس فیصلے کو سراہا۔

☆......☆

ہفتے کی شام کو ٹینا نے سکندر کو اس کے ہاسٹل سے پک کیا۔ آج ان کا پروگرام واشنگٹن کے مضافات میں ایک مشہور ریستوران میں ڈنر کرنے کا تھا۔ ٹینا آج بے حد خوش تھی۔ اس نے بلیو جینز اور بلیو ہی ٹاپ پہن رکھی تھی چونکہ سردی کا موسم تھا۔ اس لیے کندھوں پہ بلیک وولن شال ڈال رکھا تھا۔ سر پر بھی موٹی اونی ٹوپی تھی پھر بھی اس کا چہرہ اور ناک سردی کی شدت سے سرخ ہو رہی تھی۔ اور اس طرح اس کا حسن مزید دو آتشہ ہو چکا تھا۔ سکندر کنکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کو قدرت نے فرصت میں اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے اور دنیا بھر کی حسین ترین لڑکیوں کے سارے اعضا اس میں یکجا کر دیے ہیں۔

سکندر کی سب سے اچھی بات ٹینا کو یہی محسوس ہوتی تھی کہ اس نے نا کبھی اسے آفر کی کہ وہ اس کے ہاسٹل میں آکر اس کے پاس ویک اینڈ گزارے نہ ہی اس نے ٹینا کے اپارٹمنٹ میں کبھی جا کر رات رہنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حالانکہ ہفتہ اتوار کی رات وہ اپنے اپارٹمنٹ میں اکیلی ہوتی تھی۔ اس کی دونوں فرینڈز ویک اینڈ اپنے اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ گزارتی تھیں کبھی ٹینا حیران ہو کر سکندر سے پوچھتی کہ وہ اس لحاظ سے دوسرے لڑکوں سے کیوں مختلف ہے کہ اس نے کبھی بھی اس کے ساتھ غلط قسم کے تعلقات قائم کرنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ ان کی دوستی کو ایک سال سے زیادہ ہو رہا تھا کہ اس پر سکندر نہایت سنجیدگی سے جواب دیتا کہ ایک تو اس کے مذہب میں شادی کے بغیر اس قسم کے تعلقات حرام ہیں دوسرے اس کی گھریلو تربیت بھی ایسی ہے کہ وہ ناجائز تعلقات کو پسند نہیں کرتا۔

اگرچہ لڑکیوں کے ساتھ دوستیاں کرنا گھومنا پھرنا اور ہوٹلنگ کرنا بھی معیوب اور ناپسندیدہ فعل تھا۔ مگر پاکستان میں اپنے کچھ دوستوں کی کمپنی کی وجہ سے اس لت میں مبتلا تو ہو گیا تھا مگر وہ لڑکیوں کو انسان ہی سمجھتا تھا اور ان کے ساتھ ایسے ہی دوستیاں کرتا تھا جیسے کہ لڑکوں کے ساتھ۔ ان کی عزت کرتا تھا ان کے ساتھ احترام اور وقار سے پیش آتا تھا اور کبھی بھی انہیں کسی قسم کی غلط پیش کش نہیں کی تھی۔ نہ ہی ان کے ساتھ اس حد تک انوالو ہو جاتا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنے کے سپنے دیکھنے لگتیں۔ بس وہ ہفتے میں ایک آدھ بار ان کے ساتھ خوشگوار ماحول میں چند گھنٹے گزارتا تھا یا پھر فون اور انٹرنیٹ پر چیٹنگ کر لیتا تھا۔ مگر فون اور نیٹ پہ بھی وہ مہذب اور علمی باتیں ہی کرتا تھا۔ اس لیے غلط قسم کی لڑکیاں اس کی ان عادتوں کی وجہ سے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ ہی نہیں بڑھاتی تھیں اور اسے طنزاً صوفی اور مولوی کہہ کر پکارتی تھیں کیونکہ وہ پانچوں وقت نماز کا پابند تھا۔

چونکہ ٹینا کی بہت سی عادتیں سکندر کے ساتھ ملتی جلتی تھیں اس لیے اس کی اس کے ساتھ دوستی اتنے عرصے سے برقرار تھی۔ اور دونوں ہی سنجیدگی سے ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے لائف پارٹنرز بننے کا سوچ رہے تھے۔ اگرچہ ایسا اظہار تو ایک دوسرے سے کبھی نہیں کیا تھا۔ البتہ دل ہی دل میں یہ ارادہ کیے ہوئے تھا۔

☆......☆

زاریہ اپنی گرتی ہوئی صحت سے بے حد پریشان تھی اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ آخر اسے ہوتا کیا جا رہا ہے۔ اب تو ہر وقت کسلمندی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ ہر وقت بس بستر پر پڑی رہے اور سوچوں کے تانے بانے بنتا اسے اچھا لگتا تھا قریب کی باتیں بھولنے لگی تھیں۔ جبکہ ماضی کی ایک ایک بات اپنی جزیات سمیت ذہن میں موجود تھی۔ وہ الزائمر میں مبتلا ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن زاریہ نے شہروز اور شرمین کے مشورے سے عابدہ چوہدری کو فون کر دیا کہ وہ لوگ لڑکے کو دیکھنے کے لیے آنا چاہتے ہیں تو عابدہ نے دوسرے دن سلیم سے بات کر کے انہیں اگلے روز شام کو پانچ بجے بلا لیا چونکہ ہفتے کا دن تھا رامق اور باقی بچے بھی گھر پر ہوتے اس طرح ان کی ساری فیملی سے ملاقات ہو جاتی۔ چونکہ آج کل نور بھی لاہور آئی ہوئی تھی اس لیے عابدہ چوہدری دوپہر ہی کو اسے لے کر سلیم کے گھر پہنچ گئی تاکہ مہمانوں کے لیے شام کی چائے کا اہتمام کروایا جا سکے۔

نور، زاری اور واثق بار بار رامق کو چھیڑ رہے تھے۔

شام کو ٹھیک ساڑھے پانچ بجے تک زاریہ، شرمین اور شہروز پہنچ گئے اور گیراج میں جیسے ہی شہروز نے گاڑی پارک کی اور وہ لوگ گاڑی سے اترے تو سلیم اور عابدہ چوہدری نے آگے بڑھ کر نہایت تپاک سے ان کا استقبال کیا اور پھر برآمدے کے دائیں طرف واقع دروازے سے وسیع و عریض نہایت قیمتی ساز و سامان سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے ڈرائنگ روم میں نہایت بیش قیمت وال ٹو وال کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ صوفے نہایت اعلیٰ ڈیزائن کے سینٹر ٹیبل کی شیشے کی سطح سے فانوس کی روشنیاں منعکس ہو کر خوبصورت لگ رہی تھیں۔ دیواروں پر انتہائی خوبصورت پینٹنگز مکینوں کے باذوق ہونے کی مظہر، سامنے دیوار گیر الماری میں انواع و اقسام کے امپورٹڈ ڈیکوریشن پیس سجے ہوئے، ڈرائنگ روم کی کلر اسکیم بھی بے حد منفرد تھی کارپٹ پردوں اور فرنیچر کے رنگوں میں بے حد نفاست اور ہم آہنگی تھی غرضیکہ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ سے ہی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ ایک انتہائی دولت مند سلجھے ہوئے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ باذوق لوگوں کا گھر ہے۔

زاریہ، شرمین اور شہروز نے دل ہی دل میں سلیم کی امارت سے مرعوب ہو رہے تھے اور انہیں اپنی کم مائیگی کا بری طرح احساس ہو رہا تھا کہاں تو ان کا سات مرلے کا عام سا فرنیچر سے آراستہ گھر، چھوٹی سی گاڑی اور کہاں یہ دو کنال کا پوش ایریا میں واقع محل نما گھر شرمین دل ہی دل میں جہاں اپنی بیٹی کی خوش قسمتی پر ناز کر رہی تھی۔ وہیں ذہن کے کسی گوشے میں یہ فکر بھی تھی کہ اس کی بیٹی اس قدر دولت مند گھر میں ایڈجسٹ بھی کر پائے گی یا نہیں۔

کچھ دیر بعد چائے اور دیگر لوازمات سے لدی ہوئی ٹرالی ملازمہ دھکیلتی ہوئی لے کر آئی پھر کچھ دیر بعد، عابدہ چوہدری کے ہمراہ نور اور زاری بھی آگئیں اور دونوں نے نہایت پرجوش طریقے سے مہمانوں کو اور خصوصی طور پر زاریہ کو سلام کیا۔ زاریہ نے کھڑے ہو کر دونوں لڑکیوں کو گلے سے لگا کر پیار کیا وہ لوگ اپنے ہمراہ مٹھائی، کیک اور فروٹ لے کر آئے تھے جو ملازمہ اٹھا کر گھر کے اندر چلی گئی۔

نہایت خوشگوار ماحول میں چائے پی گئی۔ زاری اور نور نے مہمانوں کو چائے بنا کر پیش کی سلیم اور عابدہ بھی انہیں ایک ایک چیز لینے پر اصرار کر رہے تھے زیادہ تر اشیاء گھر ہی پر تیار کی گئی تھیں اس لیے انتہائی لذیذ اور تر و تازہ تھیں۔

چائے کے بعد ادھر ادھر کی باتوں کا دور چلا۔ پھر عابدہ چوہدری نے مہمانوں کو گھر دکھانے کی پیش کش کی۔

عابدہ مہمانوں کے ہمراہ جب لاؤنج میں داخل ہوئیں تو واثق اور رامق وہاں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے...

وامق نے جیسے ہی شہروز کو دیکھا وہ چونک سا پڑا۔ اگرچہ کافی عرصے پہلے وہ اس سے سحرش کے والد کی وفات پر ملا تھا۔ پھر ایک دو مرتبہ اور نیلوفر کے گھر میں جب وہ سحرش کو پک کرنے آیا تھا تو سرسری سی ملاقات ہوئی تھی مگر پھر بھی اس کا چہرہ وامق کے ذہن میں ایسے ہی محفوظ تھا۔ جیسے سحرش کی یاد اور اس کی من موہنی صورت۔

"ہم...... ہم...... شاید پہلے کہیں مل چکے ہیں؟"

وامق نے بے تحاشا دھڑکتے دل کی اتھل پتھل پہ قابو پانے کی سعی کرتے ہوئے خوشی سے بھرپور لہجے میں استفسار کیا۔ شہروز نے ایک لمحے کے لیے وامق کے چہرے کو بغور دیکھا اور پھر بولا "ارے ہاں یاد آیا آپ غالباً جہاں زیب کے دوست ہیں اور اس کے ساتھ ذیشان بھائی کی شہادت پر تعزیت کرنے آئے تھے۔ پھر دو ایک بار جہاں زیب کے گھر میں بھی آپ سے ملاقات ہوئی تھی بڑا عجیب اتفاق ہے یہ بھی۔" شہروز نے وامق کو پیار سے گلے لگالیا۔ تو وامق کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے تو آج تک کسی کو اپنا راز داں بھی نہیں بنایا تھا۔ مگر اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ساری دنیا کو یہ خوشخبری سنائے کہ اس کی پسندیدہ لڑکی وہی ہے جسے بچپن ہی سے اس کے والد نے اس کے لیے منتخب کر رکھا تھا۔

کہاں تو اس کا انداز بجھا بجھا سا تھا اور وہ بے دلی سے گھر والوں کے ساتھ مل کر اپنی مستقبل میں ہونے والی بیوی کے اہل خانہ کا منتظر تھا۔ اور اب اس کا چہرہ خوشی سے پھول کی مانند کھل اٹھا تھا اور وہ مہمانوں کے ساتھ مسکرا مسکرا کر نہایت خوشگوار لہجے میں باتیں کر رہا تھا اور پھر کچھ دیر بعد جب مہمان رخصت ہوگئے اور وہ سب لوگ آ کر لاؤنج میں بیٹھ کر خوش گپیاں کرنے لگے کہ اچانک وامق بولا "چلو فرینڈز آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔"

"بل کون پے کرے گا؟"

"مابدولت!" وامق نے قدرے اپنے سر کو خم دے کر سینے پہ ہاتھ باندھ کر شاہانہ انداز میں مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے کہا۔

"کس خوشی میں؟" نور نے پوچھا۔

"ارے نور آپی۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ آخر وامق بھائی کی شادی ہونے جارہی ہے اس سے بڑی خوشی کیا ہوگی بھلا!" واثق نے شوخ لہجے میں کہا۔

"ارے بھئی باتوں میں وقت ضائع مت کرو وامق بھائی جب سخاوت پہ آمادہ ہیں تو جلدی چلو ایسا نہ ہو کہ ارادہ بدل جائے اور یہ کسی بہانے گھر سے کھسک جائیں۔" زاری نے جلدی سے کہا۔

عابدہ چوہدری اور سلیم نے معذرت کرلی اور نوجوانوں کی ٹولی وامق کی گاڑی میں لد کر قریبی آئس کریم پارلر کی جانب روانہ ہوگئی۔

☆......☆

ٹینا چھٹیوں پر اپنے گھر گئی تھی وہاں جا کر بھی اس نے سکندر سے کوئی رابطہ نہیں کیا اور واپس بھی نہیں آئی تھی۔ جب کئی ماہ بعد بھی ٹینا لوٹ کر نہیں آئی اور نہ ہی اس نے کوئی رابطہ قائم کیا تو سکندر انتہائی مایوس اور دلگرفتہ ہوا وہ اپنے ایگزام سے نہ صرف فارغ ہوچکا تھا بلکہ اس کا رزلٹ بھی آچکا تھا اور اس نے اسپیشلائزیشن کے لیے ایک میڈیکل یونیورسٹی میں ایڈمیشن بھی لے لیا تھا چونکہ ابھی کلاسز شروع ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ اس لیے اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ارادہ تو اس کا ٹینا کے ہمراہ جانے کا تھا مگر جب وہ نہیں آئی تو دل برداشتہ ہو کر اکیلا ہی پاکستان روانہ ہوگیا۔

جب ایک دن سکندر اچانک ہی گھر پہنچ گیا تو جہاں برسوں سے اس کی دید کی پیاسی ماں خوشی سے نہال ہوگئی وہیں نور کو تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اسے چھپر پھاڑ کر دولت مل گئی ہو۔ وہ اپنے ہاؤس جاب سے فارغ ہوچکی تھی اور آج کل ایک پرائیویٹ ہاسپٹل میں جاب کر رہی تھی اور ساتھ ہی اپنے ایف پی ایس کے امتحان کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ اس امتحان میں کامیابی کے بعد اسے کسی بھی سرکاری اسپتال میں بہتر ملازمت مل سکتی تھی مگر عابدہ چوہدری اور فیروزہ جلیل یہ چاہتی تھیں کہ وہ مزید پڑھنے اور ملازمت کے چکر میں پڑنے کے بجائے سنجیدگی سے شادی کے بارے سوچے۔

فیروزہ جلیل آئے روز رشتہ کروانے والے اداروں اور ملنے جلنے والوں کے ذریعے مختلف لوگوں کو گھر میں بلواتی رہتی تھیں نور کی اچھی شکل صورت اور میڈیکل کی ڈگری کی وجہ سے ہر کوئی اسے پسند کر لیتا تھا مگر نور اپنی پڑھائی اور بہتر جاب کے حصول کا بہانہ کر کے انکار کر دیتی تھی۔ اور فیروزہ جلیل اس سے زچ آچکی تھیں کیونکہ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ ہوچکی تھی اور وہ جانتی تھیں کہ مزید چند سال اور گزر گئے تو پھر رشتے آنے کا سلسلہ تقریباً رک جائے گا مگر نور ان کی بات پر کان ہی نہیں دھرتی تھی تنگ آ کر ایک دن فیروزہ جلیل نے اس سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ دوسری طرف عابدہ چوہدری نے بھی فون کر کے انہیں تنگ کر رکھا تھا کہ انہوں نے نور کے رشتے کے سلسلے میں کیا کیا ہے؟

نور ہاسپٹل سے آ کر اپنے کمرے میں بیٹھی لیپ ٹاپ پر نیٹ سرچنگ کر رہی تھی کہ فیروزہ جلیل اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے ٹرے میں دو کپ چائے اور بسکٹ نمکو وغیرہ رکھے۔

"نور بیٹی...... چلو آؤ پہلے چائے پی لو۔ یہ کیا ہر وقت لیپ ٹاپ پر لگی رہتی ہو۔" فیروزہ جلیل نے ایک ٹیبل پر ٹرے رکھ کر خود ٹو سیٹر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے ماما آپ نے کیوں زحمت کی مجھے بلالیا ہوتا۔ میں چائے بنالیتی۔" نور نے لیپ ٹاپ کا سوئچ آف کر کے اسٹڈی ٹیبل پر رکھ کر فیروزہ جلیل کے پاس ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جب سے ہاسپٹل سے آئی ہو تب سے کمرے میں ہی بند ہو۔ کیا کرتی رہتی ہو لیپ ٹاپ پر۔ پڑھائی کا سلسلہ تو ختم ہوچکا ہے۔ اب تو سکون کا سانس لو۔" فیروزہ جلیل نے رسان سے کہا۔

"پڑھائی کا تو چکر نہیں ہے فی الحال......" وہ ہولے سے بولی۔

"کیا مطلب۔ فی الحال...... بس اب ختم پڑھائی وغیرہ۔ ایم بی بی ایس کرلیا بہت ہے مزید سر کھپانے کی ضرورت نہیں ہے میں بہت جلد تمہارا رشتہ تلاش کر کے تمہیں رخصت کرنے کا سوچ رہی ہوں۔" فیروزہ جلیل نے نور کی بات کاٹ کر قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"ماما جانی...... آپ بہت سمپل ہیں خالی ایم بی بی ایس کی آج کل کوئی وقعت نہیں ہے جب تک کہ ایف پی ایس سی نہ کیا جائے آپ کو تو پتہ ہے مجھے یہ ملازمت بھی کنڈیشنل ملی ہے جب تک میں ایف پی ایس سی پارٹ ون نہیں کرلیتی۔ میری ملازمت مستقل نہیں ہوسکے گی۔ رہی بات شادی کی تو میں نے اس بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔" نور نے لاپرواہی سے کہا۔

"ویسے ماما بقول آپ کے میری شادی کی عمر تو تقریباً گزر ہی چکی ہے تو پھر کیا ضرورت ہے ان بکھیڑوں میں پڑنے کی میں اسپیشلائزیشن کر کے اپنا ہاسپٹل بناؤں اور یوں دکھی انسانیت کی خدمت میں

وقت گذرنے کا پتہ ہی نہیں چلے گا۔" نور نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"یہ سب کہنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ میری چندا تنہائی کا عذاب بہت اذیت ناک ہوتا ہے سارا دن معروف رہ کر جب رات کو اکیلی بیٹھ کر کھانا کھاؤ گی یا اکیلے کمرے میں رہو گی تو پھر تمہیں احساس ہوگا کہ تم نے شادی نہ کرکے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔" فیروزہ جلیل نے دھیرج سے ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"مگر ماما میں تنہا کیوں ہوں گی آپ ہیں، نجمہ آنٹی ہیں۔ عابدہ امی ہیں۔ پھر ماشاء اللہ میرے اتنے بھائی بہنیں اور کزنز ہیں میں ان سب کے ساتھ جیسے اب تک رہتی آئی ہوں ویسے ہی آئندہ بھی رہوں گی نور نے قدرے شوخ لہجے میں کہا۔ اور فیروزہ جلیل اس کی بات پر اپنا سر پیٹ کر رہ گئیں۔

☆......☆

سلیم کے گھر سے واپسی پہ شہروز اور زاریہ نے شرمین کو اس کے گھر ڈراپ کردیا اور خود اپنے گھر لوٹ آئے جب راحیلہ اور شہروز بچوں سمیت اوپر اپنے پورشن میں چلے گئے تو زاریہ اور سحرش لاؤنج میں بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد زاریہ نے ٹی وی آف کیا اور سحرش سے کہا۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ وہ لڑکا کیسا ہے؟ جس کو آج ہم تمہارے لیے دیکھنے گئے تھے۔"

"اگر آپ، امی اور شہروز چاچو نے اسے پسند کرلیا ہے تو پھر مجھے کوئی پروا نہیں ظاہر ہے میرے اتنے پیارے پیارے چاہنے والوں کی پسند کوئی ایسی ویسی تو نہیں ہوگی نا۔" سحرش نے تجاہل عارفانہ سے کام لے کر کہا۔

"تمہیں...... واقعی کوئی پروا نہیں کہ ہم تمہارا رشتہ کس سے طے کرنے جارہے ہیں اور عام سیدھی سادی لڑکیوں کی طرح تم ہماری پسند کو اپنی پسند بنا لوگی؟" زاریہ نے سحرش کے بے تاثر چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے استفسار کیا "آخر پھپھو آپ کیا جاننا چاہتی ہیں؟" سحرش نے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کو سامنے پڑے صوفے پر پٹخ کر قدرے غصے سے چیخ کر کہا اور پھر تیز تیز قدموں سے کمرے میں آ گئی۔

زاریہ کچھ دیر تو خاموش بیٹھی سحرش کے اس ردعمل پر غور کرتی رہی پھر دھیرے دھیرے اس کے لبوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکالا اور سحرش کے پاس کمرے میں جا کر بیڈ کی پائنتی پر بیٹھ گئی اور اس کے ریشمی براؤن بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتی ہوئی بولی "اگر تمہاری یہاں رشتہ کرنے کی مرضی نہیں تھی تو کیوں ہامی بھری تھی ہم نہیں جاتے وہاں میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اگر تم چاہتی ہو تو ہم اس سلسلے کو آگے بڑھائیں تو تم نے بخوشی اجازت دے دی تھی اور اب یہ غصہ کیوں؟"

"یہ...... یہ...... آپ کو کہاں سے ملا؟" سحرش نے بوکھلا کر پوچھا۔

"اس بات کو چھوڑو...... میری بات کا جواب دو۔"

"نن...... نن...... نہیں تو" سحرش نے نگاہیں جھکا کر آہستگی سے کہا "تم جھوٹ بولتی اچھی نہیں لگ رہی ہو بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ تمہیں جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں۔ کیونکہ میں نے کبھی جھوٹ بولنا سکھایا ہی نہیں۔"

"میں...... میں کب جھوٹ بول رہی ہوں آپ بھی نا بس بال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتی ہیں۔" سحرش جھنجلا کر رہ گئی۔

"یہ تم مجھ سے کس لہجے میں بات کررہی ہو

اپنے ہوش میں تو ہو؟" زاریہ نے سحرش کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"سوری...... سوری پھپھو۔" سحرش نے گھبرا کر کہا۔

آخر تم مان کیوں نہیں لیتیں کہ وامق ہی وہ شخص ہے جسے تم چاہتی ہو مگر تمہیں مجھ پر اتنا اعتماد ہی نہیں کہ مجھے اپنا راز بتا سکو کیونکہ ہوں تو آخر پھپھو ہی نا...... کون سی حقیقی ماں ہوں۔" زاریہ نے آنسوؤں سے نم لہجے میں کہا۔

"پلیز پھپھو...... ایسی دل دکھانے والی باتیں کیوں کررہی ہیں آج آپ...... ٹھیک ہے میں وامق کو پسند کرتی تھی اور کرتی ہوں مگر یہ سب یک طرفہ ہے اور وہ بھی نہیں جانتا کہ میری کیا Feelings ہیں۔

"ارے واہ میری منی سی بچی اتنی بڑی ہوگئی۔" زاریہ نے مسکراتے ہوئے سحرش کو سینے سے لپٹا لیا۔

☆......☆

سکندر کچھ دنوں کے لیے پاکستان آیا ہوا تھا اور چونکہ بلومنگ فلاور بھی اسلام آباد ہی میں مقیم تھی تو سکندر نے کئی بار اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی مگر وہ آئیں بائیں شائیں کردیتی تھی جبکہ ٹینا کے بعد اگر کسی لڑکی نے اسے متاثر کیا تھا تو وہ بلومنگ فلاور ہی تھی۔ اس کی بات چیت اور لیے دیے رہنے والے انداز اور اپنے پروفیشن کے علاوہ زندگی کے دوسرے موضوعات پر اس کی معلومات حیرت انگیز تھیں کبھی کبھی تو وہ اسے اپنی ذات کا پرتو محسوس ہوتی تھی اس لیے وہ اس کے بارے میں اکثر سنجیدگی سے سوچتا تھا۔ اور اب جبکہ ٹینا کے ملنے کی تمام امیدیں دم توڑ چکی تھیں تو وہ بلومنگ فلاور کے بارے میں اس حد تک سیریس ہو چکا تھا کہ اگر اسے کبھی کسی لڑکی سے شادی کرنی ہی پڑ گئی تو اس کی پہلی ترجیح بلومنگ فلاور ہی ہوگی اسی لیے وہ اس سے ملنا اسے دیکھنا اور اس کی ذات کے پراسرار گوشوں سے واقف ہونا چاہتا تھا مگر وہ ملنے پر آمادہ ہی نہ ہوتی تھی اور سکندر عجیب مشکل اور کشمکش میں پڑا ہوا تھا اور کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس سر پھری لڑکی کو کیسے فیس بک کی فرضی دنیا سے حقیقی دنیا میں دیکھے۔

عروہ کو نور کے سکندر کے لیے احساسات کا علم تھا اگرچہ اس نے منہ سے تو اس کے سامنے اس بات کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا مگر سکندر کے سامنے آنے پر یہ اس کی آنکھوں کی چمک کی سرخی اور اکثر خاموش رہنے والی زبان قینچی کی طرح پٹر پٹر چلنے لگتی تھی، عروہ فوراً تاڑ جاتی تھی اور خود ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاتی۔ اور اگلی سیٹ نور کے لیے خالی چھوڑ دیتی۔ شاپنگ کرتے ہوئے بھی اس کی کوشش ہوتی کہ وہ دونوں ساتھ ساتھ رہیں اس پر نور تو بے طرح خوش ہوتی مگر سکندر اپنے ہی دل کی دنیا میں کھویا کھویا ہاں ہوں میں اس کی بات کا جواب دے کر پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی کہ اتنی خوبصورت ذہین اور ساتھ پلی بڑھی لڑکی کو اس نے کبھی کزن کے علاوہ کسی اور نظر سے نہیں دیکھا تھا شاید گھر کی مرغی دال برابر والی بات تھی۔ کہ وہ ادھر ادھر منہ مارتا پھرتا تھا اور ہزاروں خوبیوں والی نور اسے نظر ہی نہیں آتی تھی۔ شاید جن لوگوں کے ساتھ ہم ایک ہی گھر میں عرصے سے رہتے سہتے آرہے ہوتے ہیں ان میں ہمیں کوئی خاص کشش اور انفرادیت محسوس نہیں ہوتی اور جس طرح والدین بھائی اور دیگر افراد ہماری زندگی کا حصہ ہوتے ہیں اسی طرح اگر کوئی کزن وغیرہ آکر اس معمول کی زندگی کا حصہ بن جائے تو اسے بھی ہم دیگر افراد خانہ ہی کی طرح سمجھتے ہیں۔

کچھ دنوں میں سکندر کی چھٹیاں ختم ہونے

والی تھیں تو سکندر نے واپسی کی تیاری شروع کر دی اس دن وہ اپنے کمرے میں اپنا سامان پیک کر رہا تھا کہ نجمہ تھکے تھکے انداز میں کمرے میں داخل ہوئی۔

آیئے امی کیسی ہیں آپ؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟'' سکندر نے نجمہ کے زرد زرد پژمردہ چہرے کو دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔

''ہاں...... ہاں ٹھیک ہوں ویسے بھی اب تو عمر کے جس حصے میں ہوں وہاں کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے اب تو بس چل چلاؤ ہی ہے۔'' نجمہ نے بوجھل لہجے میں کہا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ امی' امریکہ میں تو آپ کی عمر کی خواتین خود کو جواں اور زندگی سے بھرپور سمجھتی ہیں اس لیے زندگی کی ہر سرگرمی میں پورے طور پر حصہ لیتی ہیں۔ اور آپ ابھی سے مایوس ہو رہی ہیں ابھی تو آپ نے اپنے بچوں کے بچوں کو بھی اپنے ہاتھ سے بیاہنا ہے۔'' سکندر نے پیار سے ماں کے سر کو اپنے کندھے سے لگا کر کہا۔

''میرے بیٹے تم بھول رہے ہو کہ تم میرے بڑے بیٹے ہو جب تک میں تمہارے سہرے کے پھول کھلتے نہ دیکھ لوں میں کہاں اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو سکتی ہوں۔'' نجمہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''ارے امی مجھے چھوڑیں میں تو ٹھہرا آزاد پنچھی اور سیلانی آدمی۔ میں کہاں شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریاں اٹھا سکتا ہوں مجھے تو بس ایسے ہی رہنے دیں۔'' سکندر نے شوخ لہجے میں کہا۔

''میں تو ماں ہوں نا۔ میں کیسے اپنے سب سے زیادہ لاڈلے بیٹے کو یوں بے نیل و مرام دیکھ سکتی ہوں۔''

''میں بے نیل و مرام کب ہوں۔ امی اتنا کامیاب ڈاکٹر ہوں۔ انشاء اللہ چار سالوں میں ہارٹ اسپیشلسٹ بن کر آپ کے پاس آؤں گا۔''

''ہاں...... ہاں تب تک بوڑھے ہو چکے ہو گے بال سفید اور آنکھوں پہ موٹے موٹے شیشوں کی عینک نا بھئی۔ مجھے نہیں چاہیے ایسا ہارٹ اسپیشلسٹ بس بہت ہو گئی پڑھائی۔ اب میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی اب تم یہاں ہو گے میرے پاس شادی کرو گے اور میں تمہارے بچوں کو کھلاؤں گی میری زندگی کی یہی تمنا ہے۔'' نجمہ نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

''مجھے تو آپ ان بکھیڑوں میں نہ ہی ڈالیے تو بہتر ہے۔'' سکندر نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔

''سنو...... سکندر اگر اب تم ایسے ہی چلے گئے نا تو پھر جب تم واپس آؤ گے تو ماں تمہیں یہاں نہیں ملے گی ہم لوگ کوئی قیامت تک اس دنیا میں رہنے کے لیے نہیں آئے۔ مختصر سی زندگی ہے اور اسی میں ہر کام اپنے وقت پر پایہ تکمیل تک پہنچ جائے تو اچھا ہے۔ اب تو تم نے باہر کی ترقی یافتہ دنیا کو بھی دیکھ لیا ہے مگر ایک بات یاد رکھنا کہ اچھی باوفا اور خدمت گزار بیوی تمہیں اپنے ملک میں ہی مل سکے گی تم شادی کر لو۔ پھر بے شک ساری زندگی پڑھتے رہنا۔ بس بوڑھی ماں کی ایک آخری خواہش بھی پوری کر دو۔'' اور پھر اپنی بات پوری کرنے سے قبل ہی نجمہ دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر سکندر کے سامنے بیٹھ گئی۔ اور آنکھوں سے جھل جھل اشکوں کی برسات ہونے لگی۔

''اف...... امی یہ...... یہ آپ کیا کر رہی ہیں پلیز اپنے اس بیٹے کو گناہ گار نہ کیجیے۔ ٹھیک ہے جو آپ چاہتی ہیں وہی ہو گا۔ میں آپ کو کل تک ایک لڑکی کے بارے میں بتاؤں گا اگر وہ مان گئی تو ٹھیک ہے ورنہ پھر جہاں مرضی میری شادی کر دیجیے گا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ سکندر نے ماں کے دونوں

ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں کہا تو نجمہ ایک روتے روتے ہنسنے لگی یہ ہنسی اور آنسوؤں کا سنگم اس قدر دلکش تھا کہ سکندر بے اختیار ماں سے لپٹ کر پیار کرنے لگا۔

پھر رات کو سونے سے قبل سکندر نے فیس بک پر بلومنگ فلاور سے رابطہ کیا اور اسے اپنی شادی کے فیصلے سے آگاہ کر کے اسے اگلے روز شام کو کیپٹل پارک میں ملنے کے لیے کہا اور وہ مان گئی تو سکندر کا دل خوشی سے بے طرح دھڑکنے لگا۔

مگر دوسرے دن شام کو وہ ایک گھنٹہ تک کیپٹل پارک کی پارکنگ میں اپنی گاڑی میں بیٹھی بلومنگ فلاور کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہیں آئی اور نہ ہی اس نے کوئی رابطہ کیا بلکہ فیس بک پر بھی وہ آن لائن نہیں ہوئی اس کی اس حرکت پر سکندر بیحد سیخ پا ہوا اور وہ سمجھ گیا کہ فیس بک کی fake دنیا میں وہ بھی کوئی ایسی ہی ہستی تھی وہ اس پر سات حرف بھیج کر گھر لوٹ آیا اور ماں سے کہہ دیا کہ وہ جہاں چاہیں اپنی مرضی سے اس کی شادی کر دیں اور ماں نے بے اختیار بیٹے کی چاند سی پیشانی چوم لی۔

☆......☆

ایک مقامی ہوٹل میں شاندار تقریب میں واثق اور سحرش کے نکاح کی رسم ادا کر دی گئی شرمائی شرمائی سی سرخ خوبصورت کام والے شیفون کے سوٹ میں ملبوس سحرش دل میں اتر جانے کی حد تک اچھی لگ رہی تھی۔ نیوی بلیو تھری پیس سوٹ اور میرون ٹائی لگائے واثق بھی کوئی شہزادہ ہی لگ رہا تھا چونکہ دونوں کے دل بھی خوشی سے سرشار تھے کیونکہ من پسند جیون ساتھی پا لیے۔ اس لیے دلی مسرت و انبساط کے عکس نے ان کے چہروں کو بھی جگمگا دیا تھا خوشی ان کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی انجانے ہی میں ایک دوسرے کی چاہت میں گرفتار ہو جانے والوں کو امید ہی نہ تھی کہ کبھی وہ ایک دوسرے کو پا سکیں گے۔ بغیر کسی کوشش کے قدرت نے ان کا ملاپ کرا دیا تھا اس پہ وہ جتنا بھی بھی پروردگار عالم کا شکر ادا کرتے کم تھا۔

''لگن سچی ہو تو انسان جو چاہتا ہے وہ اسے مل ہی جاتا ہے ہیں نا؟'' اسٹیج پر سحرش کے ساتھ بیٹھے واثق نے سرگوشی کی تو جواب میں سحرش نے شرما کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب تو مجھے فون کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہو گی نا کہ اب ہم نکاح کے شرعی بندھن میں بندھ چکے ہیں۔'' واثق نے چپکے سے اپنا کارڈ سحرش کے مہندی لگے خوبصورت ہاتھ میں دیتے ہوئے استفسار کیا تو سحرش نے جلدی سے کارڈ ہاتھ میں پکڑے چھوٹے سے خوبصورت فینسی پاؤچ میں ایک قیمتی خزانے کی طرح چھپا لیا اور ایک خوبصورت مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر سر جھکا لیا۔

''ارے بھئی یہ تم اس قدر شرمیلی کیوں۔ لگتا ہی نہیں کہ محترمہ نے یونیورسٹی میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور وہ انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا ہے تمہاری زبان بھی ہے کہ نہیں میرا مطلب بولنا آتا ہے نا!'' واثق نے سحرش کی جامد خاموشی سے اکتا کر پوچھا تو جواب میں سحرش نے اپنی بڑی بڑی خوبصورت سحر انگیز آنکھوں سے گھورا تو واثق جلدی سے گھبرا کر بولا ''او کے۔ او کے۔ سوری۔''

پھر جب تقریب اپنے اختتام کو پہنچی تو واثق نے دھمکی دینے کے انداز میں کہا گھر پہنچنے کے بعد آدھے گھنٹے تمہاری مسڈ کال کا انتظار کروں گا۔ سمجھیں......؟''

''آج نہیں...... میں بہت تھک گئی ہوں سخت نیند آ رہی ہے کل سے؟'' سحرش نے ملتجی لہجے میں کہا تو جواب میں واثق نے کہا چلو ٹھیک ہے آج

پہلی مرتبہ تمہیں اس قدر خوبصورت لباس میں میک اپ میں دیکھا ہے ورنہ تو ہمیشہ سفید یونیفارم اور سادہ سے لباس میں نظر آتی تھیں بہت اچھی بہت پیاری لگ رہی ہو مگر......" اور یہ کہہ کر وہ جلدی سے اپنی گاڑی کی طرف کی جانب بڑھ گیا اور سحرش خوشی اور فخر کے احساس سے اس کے شاندار سراپے کو یک ٹک دیکھتی رہی اور پھر زاریہ کے ساتھ شہروز کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور مستقبل کے حسین سپنے آنکھوں میں بسائے رخصتی تک اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ رخصتی اگلے ماہ بیس تاریخ کو ہونا طے پائی تھی تاکہ شادی کی بھرپور تیاریاں کی جاسکیں۔ سلیم کے گھر میں پہلی بار خوشی کی تقریب ہونے جارہی تھی۔ بڑے بیٹے کی شادی تھی اور وہ اسے بھرپور طریقے سے منعقد کرنا چاہتا تھا دوسری طرف زاریہ کے پاس بھی کسی قسم کی کمی نہیں تھی وہ بھی نازوں سے پالی اپنی لاڈلی بھتیجی کو دنیا کی ہر چیز دے کر رخصت کرنا چاہتی تھی چونکہ دو بیٹیوں کو رخصت کرنا تھا اس لیے زاریہ اور شرمین کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ دونوں تقریباً روز ہی سحرش کے ساتھ بازاروں کے چکر لگاتیں رات کو دیر دیر تک وامق سحرش سے فون پر باتیں کرتا رہتا سحرش نے اپنی کالج کی ملازمت چھوڑ دی تھی کیونکہ وامق نہیں چاہتا تھا کہ وہ ملازمت کرے۔ سحرش ویسے بھی مصروف رہنے کے لیے ہی ملازمت کرتی تھی ورنہ اسے ملازمت کی ضرورت بھی نہ تھی زاریہ اس کی تمام ضروریات بخوبی پوری کررہی تھی۔

"سنو...... سحرش شادی کے بعد ہم ہنی مون کے لیے لندن جائیں گے میں تمہیں وہاں کا چپہ چپہ دکھاؤں گا جہاں ہم نے اپنی ماں کے ساتھ بچپن کا خوبصورت اور بھرپور وقت گزارا۔ کاش آج ماں زندہ ہوتی تو کتنی خوش ہوتی کہ جس لڑکی کو پاپا نے بچپن سے میرے لیے منتخب کرلیا تھا آج وہ میری جیون ساتھی بن چکی ہے۔ اور...... اور مجھے یقین ہے کہ جب میں تمہارے ہمراہ لندن جاؤں گا تو ماں کی روح ہمارا استقبال کرے گی۔ اور ہر قدم پر ہمارے ساتھ ساتھ ہوگی کہ شہید تو زندہ ہوتے ہیں ناں۔" ایک رات میں وامق سحرش سے فون پر باتیں کررہا تھا تو ماں کے ذکر پر جذباتی ہوکر آنسوؤں سے بھیگی بھیگی آواز میں بولا۔

"ہاں وامق! شہید کبھی نہیں مرتے...... وہ ہمارے آس پاس ہی رہتے ہیں۔ میں بھی اپنے بابا کی روح کو اکثر اپنے پاس محسوس کرتی ہوں اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ بہت خوش ہیں کیونکہ میں خوش ہوں۔"

☆......☆

جب نجمہ نے فیروزہ جلیل کو یہ خوشخبری سنائی کہ سکندر شادی پر آمادہ ہوگیا ہے تو سارے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور جب لڑکی کے انتخاب کی بات ہوئی تو سب کی متفقہ رائے نور ہی کے لیے تھی۔ نجمہ کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا نور اسے ہمیشہ سے ہی سکندر کے لیے پسند تھی اور سکندر نے ویسے بھی لڑکی منتخب کرنے کا حق ماں کو ہی دے دیا تھا۔

چنانچہ نجمہ نے سکندر کو جب بتایا کہ سب گھر والوں کی مرضی سے نور کا اس کے لیے انتخاب کیا گیا ہے تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ فیروزہ جلیل نے فون کرکے عابدہ چوہدری کو اس فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ بھی بے حد خوش ہوگئی اس کی تو دیرینہ آرزو ہی یہی تھی کی نور کی شادی سکندر سے ہو جبکہ وہ بیٹی کے دلی جذبات سے بھی بخوبی آگاہ تھی۔

پھر گھر میں ایک چھوٹی سی تقریب میں چند قریبی مہمانوں کو بلاکر منگنی کی رسم ادا کردی گئی۔

سحرش اور وامق کی شادی کی تیاریاں بھی عروج پر تھیں اور پھر وہ دن بھی آہی گیا جب سحرش ہمیشہ کے لیے وامق کی دلہن بن کر اس کے گھر آگئی۔

دو ہفتے بعد نور اور سکندر کی شادی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ برات چونکہ اسلام آباد سے آنی تھی اس لیے صرف قریبی عزیز و اقارب ہی کو مدعو کیا گیا تھا تیس پینتیس افراد ہی آسکے تھے۔ عابدہ چوہدری نے برات کو پرل کانٹی نینٹل میں استقبالیہ دیا۔ نور خوبصورت عروسی جوڑے اور ایک بڑے معروف بیوٹی پارلر سے تیار ہوکر بے حد حسین لگ رہی تھی۔ سکندر بھی سنہری شیروانی، سلیم شاہی جوتوں اور سفید پگڑی میں بے حد جچ رہا تھا۔ البتہ اس کے سنجیدہ چہرے پر خوشی کا کوئی پرتو نہیں تھا یوں محسوس ہورہا تھا جیسے مجبوراً دولہا بن کر آگیا ہو اس کے دل کی خوشی اس میں شامل نہ ہو۔ چونکہ برات اسلام آباد سے آئی تھی اس لیے دن میں فنکشن تھا۔ ایک بجے برات پہنچی تھی اور پھر برات کے استقبال اور نکاح کے فوراً بعد کھانا سرو کردیا گیا اور مختصری رسموں کے بعد شام کو چھ بجے برات واپس روانہ ہوگئی اور نور ایک مرتبہ پھر ماں کے گھر سے رخصت ہوگئی۔ فیروزہ جلیل کی نگاہیں تو نور کے چہرے کی بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھیں۔ البتہ سکندر کا اکھڑا اکھڑا انداز اور اترا ہوا چہرہ انہیں تشویش میں مبتلا کررہا تھا اس کے چہرے کی گمبھیرتا نے تقریباً سب ہی کو احساس دلا دیا تھا کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ ایک مرتبہ بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار نہیں ہوئی تھی اور جو بھی اسے مخاطب کرتا نپے تلے انداز میں جواب دے کر خاموش ہوجاتا۔ اس کے اس رویے نے عابدہ چوہدری اور سلیم کو بھی پریشان کردیا تھا مگر ایسا موقع نہیں تھا کہ کسی سے کوئی شکایت کی جاتی نور کے بھائیوں اور بہن اور بہنوئی کے ساتھ بھی بڑی سردمہری سے پیش آیا۔ وامق نے بڑی گرمجوشی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا مگر اس نے بڑی رکھائی سے اس کے سلام کا جواب دیا کہ وہ بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ سحرش زاری کے ساتھ شادی کی تیاری میں پیش پیش رہی تھی مگر سکندر نے اس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کی کہتے ہیں ناکہ اگر لیلیٰ دل میں بس جائے تو اس کا کتا بھی اچھا لگتا ہے چونکہ نور اس کے دل میں جگہ نہیں بنا پائی تھی اس لیے اس کے رشتے دار بھی سکندر کو پسند نہیں آئے تھے۔ سکندر کے اس رویے پر نجمہ اور فیروزہ جلیل کو بڑی شرمندگی محسوس ہورہی تھی وہ سوچ رہی تھیں کہ اگر وہ نور سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا تو ان کے لیے مان کیوں گیا تھا۔

رات گئے برات گھر پہنچی۔ رات کا کھانا پہلے ہی آرڈر کردیا گیا تھا اس لیے کچھ دیر میں کیٹرنگ والوں نے سرو کردیا اور چونکہ ایک ہی دن میں آنے جانے کی وجہ سے سبھی تھک کر چور ہوچکے تھے اس لیے کھانا کھانے کے بعد فوراً سبھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

عروہ نور کو اوپر سکندر کے کمرے میں جسے ہلکے پھلکے انداز میں حجلہ عروسی کے طور پر سجایا گیا تھا لے کر آئی اور اسے خدا حافظ کہہ کر چلی گئی نہ کوئی رسم ہوئی اور نہ ہی کوئی ہلہ گلا ایسے روکھے پھیکے استقبال پر نور کو اپنی بے حد ہتک محسوس ہوئی مگر وہ کیا کرسکتی تھی دل مسوس کر رہ گئی ابھی وہ بیڈ پر بیٹھی ہی تھی کہ سکندر کمرے میں داخل ہوا اور تھکے تھکے انداز میں بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ "اف یہ ہمارے ملک کی فضول شادی کی رسمیں تھکا دیتی ہیں پھر ایک ہی دن میں اتنی دور کا سفر...... خیر...... یہ تمہارا رونمائی کا گفٹ، یہ امی نے دیا ہے اب تم چینج کرکے آرام کرو میں بھی سونے جارہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے

ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک چھوٹی سی ڈبیا سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور پھر کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

اور نور حیرت سے اپنے دولہا کی پشت پر نظریں جمائے حلق میں گرتے اشکوں کی یورش سے نڈھال اپنی ناقدری پہ گم سم سی ہو کر رہ گئی۔ تو یہ تھی اس کی سہاگ رات۔

''نور بی بی اور کرو ایک پتھر کے صنم سے عشق اس طرح تو ہونا تھا...... اس کے دل دماغ نے اسے ڈانٹا تو وہ بے دردی سے آنکھیں رگڑتے ہوئے اشکوں کی مالا پرونے لگی۔ کہتے ہیں نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے اور وہ بھی تو یونہی روتے روتے دل کے درد سے نڈھال سی...... جانے کب نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

صبح اس کی آنکھ چڑیوں کی مخصوص چہکار سے کھلی تھی۔

آنکھ کھلتے ہی اس کی نظر اپنے عروسی جوڑے پر گئی جو پہنے پہنے ہی وہ سو گئی تھی... اپنے اتنے قیمتی برائیڈل ڈریس کا حشر دیکھ کر دل مسوس کر رہ گئی۔

جلدی سے اٹھ کر باتھ روم میں گئی اور وہاں لگے شیشے میں اپنا حلیہ دیکھ کر ایک بار پھر رو پڑی بہت زیادہ رونے سے مسکارا' آئی لائنر اور آئی شیڈ و نے پورے چہرے پر گڈ مڈ ہو کر عجیب سے نقش و نگار بنا دیے تھے انتہائی مہنگے بیوٹی پارلر سے اس نے میک اپ کراوایا تھا اور جس شخص کے لیے اس نے اتنا مہنگا برائیڈل ڈریس اور اس قدر قیمتی میک اپ کروایا تھا اس بے حس' خود پسند اور مغرور بندے نے نظر بھر کر اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا دراصل وہ تھا ہی ہمیشہ سے مشکل پسند کٹھن اور ناممکن منزلوں کے متلاشی کو اتنی آسانی سے برسوں سے دیکھی بھالی ملنے والی دولہن کا اٹریکٹ کر سکتی تھی پہلے ٹینا کے لیے دیوانہ بنا پھرتا تھا وہ نہ مل سکی تو پھر فیس بک کی جھوٹی دنیا کی رنگین بلومنگ فلاور کی محض باتیں اور پوسٹیں پڑھ کر اس کے خواب دیکھنے لگا اور وہ بھی نہ مل سکی تو اسے عورت ذات سے ہی نفرت ہو گئی۔ اور اس کی نفرت کا شکار بے چاری نور ٹھہری جو نو عمری ہی سے اس کی چاہت میں گرفتار تھی اور اسے پانے کے خواب دیکھتی پروان چڑھی تھی اور وہ ملا بھی تو ایسا کہ اس سے بہتر تھا کہ نہ ہی ملتا، کم از کم اس غریب کا بھرم تو رہ جاتا۔ یوں تو وہ اپنی ہی نظروں میں نہ گر جاتی۔

نور نے باتھ روم سے نکل کر اپنی الماری کھولی تو اس میں بہت سے عام اور خاص پہننے والے ملبوسات استری شدہ ٹنگے ہوئے تھے اسے بے اختیار فیروزہ جلیل پر پیار آ گیا۔ اف ماما آپ مجھے اس قدر چاہتی ہیں مجھے ساری زندگی کانچ کی طرح سنبھال کر رکھا میری ایک ایک ضرورت کا خیال رکھا۔ اور آج دیکھیے آپ کی کانچ کی گڑیا کو ایک متکبر شخص کس طرح سہاگ رات میں ٹھکرا کر کرچی کرچی کر رہا ہے۔ مگر ماما میں بھی آپ کی بیٹی ہوں میں آج کے بعد بھی اس شخص کے لیے آنسو بہاؤں گی نہ اس سے محبت کی بھیک مانگوں گی اور نہ ہی اس کے آگے جھکوں گی وہ کیا سمجھتا ہے میں کوئی گری پڑی شے ہوں جسے ساری دنیا کے سامنے اپنا کر یوں ٹھوکر مار کر چلا گیا اب وہ میری محبت کو ترسے گا مگر میں اسے ہمیشہ ٹھکراؤں گی نور نے ایک عزم سے خود کلامی کی۔ پھر ایک ہلکا پھلکا کاٹن کا سوٹ الماری سے نکالا سارے زیورات اتار کر الماری میں اپنے سیف میں محفوظ کیے سکندر کی دی گئی ڈبیا کو کھولے بغیر باقی زیوارت کے ساتھ رکھ دیا اور پھر باتھ روم میں جا کر اپنے تپتے ہوئے سر کو ٹھنڈے پانی سے دھویا غسل کیا اور فریش ہو کر لباس تبدیل کر کے کمرے میں آ گئی اپنے عروسی لباس کی سلوٹیں درست کر کے اسے الماری میں ہینگ کر دیا۔

پھر اپنے رب کے حضور جھک گئی۔ نماز پڑھ کر سکون اور اطمینان کی لازوال دولت سے جھولی بھر کر صوفے پر بیٹھ کر تلاوت کلام سے اپنی روح کو غذا بہم پہنچائی اور پھر دعا مانگ کر نہایت پرسکون طریقے سے بیڈ پر لیٹ گئی اور کچھ دیر بعد نیند کی رحم دل دیوی نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

نور جانے کب تک یونہی بے خبر سوتی رہتی کہ فیروزہ جلیل نے آ کر اسے جھنجوڑ کر جگا دیا۔

''ارے میری شہزادی اس قدر گہری نیند میں مدہوش ہے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا گیارہ بج رہے ہیں اور تم نے پارلر بھی جانا ہے ویسے کا فنکشن دن کا ہے بھول گئیں کیا۔''

''اوہو مما جانی...... بس میں ابھی فریش ہو کر آتی ہوں۔''

''اچھا جلدی سے تیار ہو کر نیچے آ جاؤ میں نے ناشتہ منگوالیا ہے سب لوگ تم دونوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ کہہ کر فیروزہ جلیل جلدی سے کمرے سے نکل گئیں تو نور بیڈ سے اتر کر باتھ روم میں چلی گئی اور ایک قدرے فینسی قسم کا لباس پہنا ہلکا میک اپ کیا اور نیچے چلی گئی۔ وہاں سب لوگ ہی لاؤنج میں بیٹھے تھے سکندر بھی سفید کاٹن کے کرتا شلوار میں دل میں اتر جانے کی حد تک اچھا لگ رہا تھا۔ وہ مسکرا مسکرا کر اپنی ماں اور بھائی بہنوں سے باتوں میں مصروف تھا یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اور اس نے ایک معصوم لڑکی کے جذبات سہاگ رات کو اس بری طرح پامال نہ کیے ہوں۔''

''مسٹر سکندر میں نے بھی تمہاری یہ بہروپیے والی مسکراہٹ تمہارے لبوں سے نہ نوچ ڈالی ہو تو میرا نام بھی نور نہیں۔'' نور نے اسے نفرت سے دیکھ کر دل میں کہا اور خود بھی اپنے چہرے کو مصنوعی مسکراہٹ سے روشن کر کے سب کی جانب بڑھی۔

کچھ دیر بعد ناشتہ بڑے سے ڈائننگ ٹیبل پر لگ گیا اور وہ بھی اپنا ناشتہ لے کر جہاں جگہ ملی بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے سب کی کوشش تھی کہ نور اور سکندر دونوں اکٹھے بیٹھ کر ناشتہ کریں اس لیے ان کا ناشتہ لاؤنج میں ہی سینٹر ٹیبل پر لا کر رکھ دیا گیا اور دونوں بڑی خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے۔ نہ سکندر نے نور کی طرف دیکھا اور نہ ہی اسے مخاطب کیا اور بظاہر نور نے بھی اسے نظر انداز ہی کیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر نور اپنا ولیمے کا ڈریس اور زیورات لے کر عروہ کے ہمراہ پارلر چلی گئی۔ گاڑی عروہ کا شوہر ڈرائیو کر رہا تھا۔ راستے میں بھی نور سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے اور وہ یوں شرم سے چھوئی موئی بننے کی ایکٹنگ کر رہی تھی جیسے اس کو من چاہی بیوی کا درجہ دیا گیا ہو۔

بعض اوقات انسان کس قدر بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے اور اپنے اندر کے دکھ اور درد کو چھپا کر ہنسنا مسکرانا بھی پڑتا ہے اور ایکٹنگ بھی کرنی پڑتی ہے دل خون کے اشک بہا رہا ہوتا ہے اور آنکھیں اور ہونٹ مصنوعی خوشی کا تاثر دے رہے ہوتے ہیں۔

سرخ کام والی میکسی خوبصورت ہم رنگ زیورات اور نفاست سے کیے گئے میک اپ میں نور بے حد حسین لگ رہی تھی سکندر بھی سیاہ تھری پیس سوٹ میں اپنی تمام تر وجاہتوں کے ساتھ نور کے ساتھ اسٹیج پر ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں قریب قریب بیٹھے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے میلوں دور تھے۔ دونوں ہی تمام مہمانوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے رشتے دار دوست احباب انہیں تحائف پیش کر رہے تھے اور ان کے ساتھ تصاویر بنوا رہے تھے۔ عابدہ چوہدری اپنے بیٹوں بیٹی داماد بھائیوں ان کے بچوں اور دیگر عزیز و اقارب کے

ہمراہ مٹھائیوں اور فروٹ کے ٹوکروں سے لدی پھندی آئی تھیں۔ داماد اور بیٹی کے لیے قیمتی تحائف بھی لے کر آئی تھیں بیٹی سے والہانہ طور پر ملی تھیں سحرش اور واثق بھی بہت اچھے لگ رہے تھے۔ سبھی نے سکندر اور نور کو قیمتی تحائف پیش کیے تھے سکندر مسکرا کر سب سے مل رہا تھا یوں جیسے اپنی نام نہاد شادی سے بے حد خوش ہو۔

ولیمے کے فنکشن کے اختتام پر عابدہ چوہدری رسم کے مطابق بیٹی اور داماد کو اپنے ساتھ لاہور لے جانا چاہتی تھیں مگر سکندر نے یہ کہہ کر معذرت کر لی تھی کہ وہ کل کے ہی بے حد تھکے ہوئے ہیں اس لیے آج دوبارہ اتنا طویل سفر ممکن نہیں البتہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ امریکہ جانے سے پہلے ضرور نور کو ان سب سے ملوانے لے کر آئے گا۔ اس پر عابدہ چوہدری دل مسوس کر رہ گئی مگر داماد کی بات ٹال بھی نہیں سکتی تھی اس لیے چند لمحوں بعد دکی دل سے اپنے ساتھ آئے مہمانوں کے ہمراہ مصروف ہو گئی ان لوگوں نے اسپیشل کوچ کروائی تھی تاکہ تمام مہمان آرام سے پورے آسکیں۔

ولیمے سے واپس آکر فیروزہ جلیل نے سکندر سے کہا۔ ”سکندر بیٹا کیا تھا تم نور کے ساتھ ایک رات کے لیے لاہور چلے جاتے۔ بائی روڈ اگر تھکان محسوس ہوتی تو بائی ائیر چلے جاتے۔ یہ مواقع روز روز تو نہیں آتے تاکہ عابدہ بے چاری بہت دکھی ہو کر رہ گئی کچھ رسوم ایسی ہوتی ہیں کہ یہ نبھانی ہی پڑتی ہیں۔“

”پلیز پھپھو...... میں پہلے ہی عابدہ آنٹی سے خاصی بحث کر چکا ہوں۔ میری تو ابھی کل کی نیند بھی پوری نہیں ہوئی۔ سر چکرا رہا ہے عابدہ آنٹی اپنی بیٹی کو لے جانا چاہتی تھیں تو لے جاتیں میں نے کب روکا تھا اسے۔“ سکندر نے ایک اچٹتی سی نگاہ ماہ نور کے افسردہ چہرے پر ڈال کر تلخ لہجے میں کہا اور پھر تیز تیز قدموں سے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

انہیں علم نہ ہو سکا کہ نور اور سکندر کے درمیان کیا چل رہا ہے وہ تو یہی سمجھی بیٹھی تھیں کہ نور اور سکندر اپنی شادی شدہ زندگی میں بے حد خوش اور مطمئن ہیں۔ جب بھی فیروزہ جلیل نور سے سکندر کے رویے کے بارے میں کرید نے کی کوشش کرتیں تو وہ مسکرا کر یہ کہہ کر انہیں مطمئن کر دیتی کہ وہ اسے بے حد چاہتے ہیں اور یہ جھوٹ بولتے ہوئے اسے ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ اس کے چہرے پر طمانیت اور خوشی کے عکس رقصاں رہیں تاکہ چاہنے والی ہستی کو اس کے دکھ کا اندازہ نہ ہو سکے۔ کتنا مشکل ہوتا ہے اپنے آپ کو خوش ظاہر کرنے کی ایکٹنگ کرنا یہ صرف وہی جانتا ہے جس پر بیت رہی ہو۔ امریکہ روانہ ہونے سے دو ہفتے قبل سکندر نے نور کو بائی ائیر ایک ہفتے کے لیے لاہور بھجوا دیا تاکہ وہ اپنی ماں اور بہن بھائیوں کے ساتھ کچھ وقت گزارے خود اس نے اپنی مصروفیات کا بہانہ بنا کر جانے سے معذرت کر لی۔

ایک رات یونہی اسے نیند نہیں آرہی تھی اور وہ کئی دنوں بعد آن لائن ہوا تو یہ جان کر اسے خوشی ہوئی کہ بلومنگ فلاور بھی آن لائن تھی اس نے ڈاکٹر گروپ میں دو بڑی اچھی پوسٹیں شیئر کی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ دیگر پوسٹس کو بھی نہ صرف لائک کیا ہوا تھا بلکہ ان پر اپنے کمنٹس بھی دیے ہوئے تھے۔

سکندر نے اسے ان باکس میں مخاطب کیا تو اس نے بھی فوراً جواب دیا۔

”کہاں غائب تھیں؟“ سکندر نے پوچھا۔

”بس کچھ مصروفیت تھی۔“ بلومنگ فلاور نے جواب دیا۔

”ایسی کیا مصروفیت تھی؟“

”آپ بھی تو غائب تھے۔“

”آں...... ہاں میں۔ میں تو تم سے ناراض تھا اس لیے“

”کیوں ناراض تھے؟“

”تم اس دن آئی کیوں نہیں تھیں، میں پورا گھنٹہ تمہارا انتظار کرتا رہا تھا۔“

”بس مجھے اچھا نہیں لگا۔“

”کیوں؟“

”میں ایک شریف خاندان کی لڑکی ہوں اور مجھے یہ پسند نہیں کہ غیر مردوں سے پارکوں، ہوٹلوں میں ملا جائے۔“

”غیر مردوں کے ساتھ یہ چیٹنگ کرنا اچھا لگتا ہے؟“ سکندر کا انداز طنزیہ تھا۔

”ایکسیوزمی میں صرف نیٹ پر آپ کے ساتھ چیٹنگ کرلی ہوں وہ بھی اس لیے کہ آپ ایک ڈاکٹر ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی کوئی غلط بات آپ کی برداشت کی ہے نہ ہی خود ایسی بات کرلی ہوں ہم نے آج تک محض اپنے پروفیشن یا پھر لٹریچر کے حوالے ہی سے بات چیت کی ہے نہ میں نے اپنی کوئی تصویر کبھی آپ کو سینڈ کی ہے نہ ہی فون نمبر دیا ہے بلکہ آپ کے اصرار کے باوجود بھی Wahts app اور Skype بھی استعمال نہیں کیں پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں شریف نہیں ہوں ہم ہاسپٹل میں بھی تو کولیگز کے ساتھ باتیں کرتے ہیں نا تو اس کا تو کوئی غلط مطلب نہیں ہوتا نا مگر تنہا پارکوں میں ملاقاتیں کرنا تو بے حد معیوب ہے۔ آپ کے نزدیک نہ ہوگا مگر میں ایسا ہی سمجھتی ہوں ایسی ویز اگر آپ اس بات کو اچھا نہیں سمجھتے تو آئندہ آپ سے بات نہیں کروں گی۔“ اس قدر طویل میسج ٹائپ کر کے وہ آف لائن ہو گئی تو سکندر کو اپنی حماقت کا احساس ہوا جو اس نے سوچے سمجھے بغیر احمقانہ سوال کر کے اسے ناراض کر دیا تھا۔

اس کے بعد اس نے معذرت کے کئی میسجز ٹائپ کیے تو تب کہیں جا کر وہ اپنا غصہ تھوکنے پر آمادہ ہوئی۔

پھر روز ہی رات کو دونوں دو تین گھنٹوں تک چیٹنگ کرتے رہتے سکندر نے اسے بتایا تھا کہ اس نے اسے شادی کی غرض سے بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔

اس پر اس کا جواب آیا ”او...... اچھا تا کہ اچھی طرح مجھے دیکھ بھال لیں کہ کہیں کوئی عیب تو نہیں۔“

”اف...... تم...... ہر بات کو غلط طرف کیوں لے جاتی ہو۔ شادی سے پہلے تو مذہب میں بھی اجازت ہے کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں“ سکندر نے جھنجلا کر لکھا۔

”اگر میرے لیے کوئی ایسا ارادہ تھا تو آپ اپنے گھر کی خواتین کو میرے گھر بھیج دیتے۔ میں کالی، موٹی، ناٹی اور بھدی ہوتی تو وہ آپ کو ایک ایک تفصیل بتا دیتیں اور یوں آپ ان کی مرضی اور پسند سے کسی لڑکی سے شادی کر لیتے۔“

”شادی تو اب بھی ان کی مرضی ہی سے ہو گئی ہے۔“

”ارے واقعی؟ مبارک ہو کیسی ہے آپ کی بیوی؟“

”پتہ نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”ارے یار ایک کزن ہے میری بچپن ہی سے ایک ساتھ ایک ہی گھر میں پلے بڑھے ہیں میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا اس سے شادی کروں گا اس لیے کبھی اسے غور سے دیکھا نہ اس کے بارے میں سوچا بلکہ میں نے کبھی اپنی کسی گرل فرینڈ سے بھی

شادی کرنے کا نہیں سوچا تھا۔ وہ...... بس نیتا ہی ایسی لڑکی زندگی میں پہلی بار ملی تھی جس نے مجھے اس قدر متاثر کیا تھا کہ میں سیریسلی اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مگر جب پاکستان آیا تو ماں کے اصرار کے سامنے سر جھکانا پڑا اس شادی میں میری پسند شامل نہیں۔'' وہ بہت الجھا ہوا سا تھا۔

''چلیے اچھا ہوا' کہیں تو آپ نے شادی کرنی ہی تھی نا۔ کزن ہی سہی۔''

''ہاں...... مگر مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے اسے بیوی کی حیثیت سے ہی نہیں کیا اور شاید وہ بھی مجھے ناپسند کرتی ہے کیونکہ اس نے میری بے گانگی پر نہ تو مجھ سے کوئی گلہ شکوہ کیا ہے نہ ہی گھر میں کسی سے شکایت کی، تم یوں سمجھو کہ ہم دونوں شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی غیر شادی شدہ زندگی بسر کر رہے ہیں الگ الگ کمروں میں سوتے ہیں اور بہت کم آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔''

''چلیے یہ تو آپ کا پرسنل میٹر ہے میں کیا کہہ سکتی ہوں اس سلسلے میں۔'' یہ کہہ کر وہ آف لائن ہوگئی۔

پھر دونوں اکثر ہی رات کو کچھ دیر کے لیے چیٹنگ کر لیتے مگر سکندر کی شادی کے اشو پر دوبارہ ان کی کوئی بات نہیں ہوئی۔

نور جب سے لاہور آئی تھی بڑی چپ چاپ اور بجھی بجھی سی تھی۔ عابدہ چوہدری تشویش سے اس سے پوچھتی کہ وہ سکندر کے ساتھ شادی پر خوش تو ہے نا۔ تو وہ ایک پھیکی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر جواب دیتی کہ وہ خوش ہے اور اسے کوئی مسئلہ نہیں اس پر جب عابدہ چوہدری استفسار کرتی کہ پھر وہ اس قدر چپ چپ اور گم سم کیوں رہتی ہے تو وہ جواب دیتی ''امی کچھ دنوں تک میں امریکہ چلی جاؤں گی پھر جانے کب آنا نصیب ہو تو میں یہ سوچ کر پریشان

غزل

ظفر محمد خان ظفرؔ

دیس میں اُس کے نکلا چاند
دیکھ کے اُس کو چمکا چاند

عکس تھا اُس کا چاند کے بیچ
شب بھر مَیں نے دیکھا چاند

جاگ رہا ہے ساری رات
پیار میں اُس کے پگلا چاند

کب تک سہتا! ہجر کا غم
پڑ گیا آخر پیلا چاند

مجھ کو تڑپا دیکھ کے ، دوست!
شب بھر خود بھی تڑپا چاند

جانے دل پر کیا گزرے
ہجر کی شب اور تنہا چاند

پیار سے ماں نے تھپکی دی
پچھلی رات ہے سوجا چاند

کب تک دیکھوں دُور سے مَیں
گود میں میری آجا چاند

ساتھ ظفرؔ کے چاندؔ پہ چل
تیرا میرا سپنا چاند

ہوتی رہتی ہوں کہ اب پتہ نہیں کب آپ سے 'آپا' سے اور دونوں بھائیوں سے ملنا ہو مجھے آپ سب بہت یاد آئیں گے اور اپنی بات ختم کر کے وہ ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ یوں دل کی لگی آگ کو آنسوؤں سے بجھانے کی کوشش کرتی اور عابدہ چوہدری بھی اس کی بات کو سچ سمجھ کر خود اس کے ساتھ رونے لگ جاتی۔ اگرچہ اسے اپنوں سے دور جانے کا دکھ تو تھا مگر سکندر کی بے اعتنائی کا دکھ ہر جذبے سے بڑھ کر تھا جس نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ اپنی دلی کیفیت اور احساسات دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کی سعی میں نڈھال سی ہو کر رہ جاتی تھی۔

چند دن ماں کے ساتھ رہ کر نور واپس چلی آئی۔

ایک رات نور اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ پر اسٹڈی ٹیبل پر رکھے نیٹ پر مصروف تھی۔ اور دوسری طرف سکندر کے لیپ ٹاپ میں کوئی خرابی ہوگئی تو وہ اس غرض سے نور کے کمرے میں آیا کہ اس کا لیپ ٹاپ لے کر بلومنگ فلاور سے چیٹ کر سکے۔

نور لیپ ٹاپ آن چھوڑ کر باتھ روم میں گئی ہوئی تھی اور سامنے لیپ ٹاپ پر ان باکس میں سکندر اور بلومنگ فلاور کی چیٹ تھی۔ آخری میسج کو ادھورا چھوڑ کر وہ باتھ روم گئی ہوئی تھی۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں سکندر پہ عجیب سا انکشاف ہوا اور وہ دبے پاؤں جس طرح کمرے میں آیا تھا ویسے ہی نکل گیا اور پھر کچھ دیر بعد اس نے نور کے موبائل پر کال کر کے اسے اپنے کمرے میں آنے کا حکم دیا۔

اور نور رات کے اس پہر اس اچانک طلبی پر قدرے گھبرائی ہوئی اس کے کمرے کی جانب بڑھی اس نے بند دروازے پہ ہولے سے دستک دی۔

''آ جاؤ!''

سکندر کی بھاری آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی اور بے تحاشا دھڑکتے دل پر قابو پانے کی سعی کرتی ہوئی لرزتے قدموں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ سکندر اپنے اسمارٹ لمبے سراپے کے ساتھ دروازے کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔

''جی آپ نے بلایا ہے کیا بات ہے؟'' نور نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

سکندر رخ موڑ کر کڑے تیوروں سے کچھ دیر تک اس کے ہراساں چہرے کو گھورتا رہا۔ پھر نپے تلے قدموں سے اس کے قریب آیا اور اس کے نازک کاندھوں پر اپنے بھاری ہاتھ رکھ کر ایک ہاتھ سے اس کی پیشانی پر بے ترتیب زلفوں کو سمیٹتے ہوئے بولا ''تم نے مجھ سے یہ سب کیوں چھپایا کہ تم ہی بلومنگ فلاور ہو؟''

''آپ نے پوچھا کب تھا؟''

''تم نے خود بتا دیا تھا۔''

''میں کیوں بتاتی؟''

''مجھ سے نیٹ پر تو گھنٹوں کے حساب سے چیٹنگ کرنے پر اعتراض نہیں تھا مگر اپنے ہی شوہر کو اصل بات بتاتے ہوئے......''

اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

''اوہو تو بڑی جلدی احساس ہوگیا آپ کو شوہر اور بیوی کے رشتے کا؟'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''چلو...... مجھے تو احساس ہو ہی گیا مگر تم نے جانتے بوجھتے مجھے لاعلمی کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے لیے چھوڑ دیا۔'' سکندر نے اپنی خوبصورت براؤن آنکھیں اس کے حسین چہرے پر مرکوز کر کے کھردرے لہجے میں کہا ''اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں آپ کو یہ بتا دیتی کہ میں ہی بلومنگ

فلاور ہوں تو پھر میں آپ کے لیے قابل قبول تھی، ایک فرضی نام کی لڑکی کو آپ برسوں سے ساتھ رہنے والی جیتی جاگتی لڑکی کو جو اتفاق سے آپ کی بیوی بن چکی تھی پر ترجیح دیتے تو نور پھر کہاں جاتی جسے دلہن بنی چھوڑ کر آپ نہایت تکبر سے ٹھکرا کر چلے گئے آپ بتایئے..... اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟''

نور نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

اس کے اس سوال پر ایک لمحے کو سکندر گڑبڑا سا گیا اور پھر ٹھہرے لہجے میں بولا۔

''میں مانتا ہوں کیوں کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی مگر تم میری ذہنی کیفیت سے آگاہ نہیں ہو اور دو لڑکیوں کی بے وفائی کے بعد میری ذہنی کیفیت عجیب سی تھی۔ میں اندر سے بری طرح ٹوٹ کر بکھر چکا تھا تم سے شادی میں نے محض ماں کی خواہش پر کی تھی مجھ جیسے شخص جس پر لڑکیاں پروانہ وار نثار ہونے کو ہر لمحہ تیار رہتی ہوں وہ یوں ٹھکرایا جائے تو وہ تو پاگل ہی ہو جاتا ہے اور پھر تمہارے سرد مہری کے انداز نے مجھے احساس دلایا کہ شاید تم بھی مجھے ناپسند کرتی ہو اسی لیے میری بے رخی پر نہ تم نے کوئی احتجاج کیا نہ ہی میرے سامنے روئی چلائیں۔ اس لیے میں اور بھی تمہیں نظر انداز کرتا چلا گیا اور میں سمجھنے لگا کہ تم نے شادی محض پھپھو اور امی کے سمجھانے پر کی ہے ورنہ تمہیں مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں......''

''کون کہتا ہے؟'' نور نے ایک دم اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''اچھا..... تو تم پسند کرتی ہو مجھے؟'' سکندر نے ہنسی اپنے ہونٹوں میں دبا کر شوخ لہجے میں کہا۔

''یہ کب کہا میں نے؟'' نور گڑبڑا گئی۔

''عجیب لڑکی ہو کبھی کہتی ہو پسند کرتی ہو کبھی نہیں..... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔'' سکندر نے الجھے الجھے لہجے میں کہا۔

''آپ کو سمجھ آنی بھی نہیں اپنی ذات کے حصار میں مقید اور نرگسیت کے شکار لوگوں کو کبھی دوسروں کے جذبات و احساسات کا احساس نہیں ہو سکتا۔'' نور نے تلخ لہجے میں کہا۔

اور پھر واپس جانے کے لیے مڑی تو سکندر نے ہاتھ بڑھا کر اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا اور سرگوشی کی۔

''اتنی مشکل سے تو پایا ہے میں نے تمہیں اور تمہاری محبت کو..... اب تو میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔''

نور نے خوشی سے اچھل پچھل دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے آنکھیں موند کر اپنا سر سکندر کے مضبوط سینے پر ٹکا دیا۔

☆.....☆

زاریہ کی حج کی درخواست منظور ہو گئی تھی اور وہ خوشی خوشی اپنی زندگی کی اہم خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی تیاریوں میں معروف تھی۔ ویزہ لگوانا' اپنا میڈیکل چیک اپ' میڈیکل سرٹیفکیٹ وغیرہ بنوانا۔ یہ سارے کام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنا زیادہ تر وقت عبادت ہی میں گزار رہی تھی۔ حج پہ روانگی سے چند روز پہلے اس نے کالج سے واپسی پر گردن توڑ بخار کا انجکشن لگوایا پھر شرمین کی طرف چلی گئی۔

رات کو کافی زیادہ عزیز رشتے دار اس کو حج پر جانے کی مبارکباد دینے آ رہے تھے۔ شرمین نے اپنی بیٹوں کے ساتھ مل کر کھانا تیار کیا۔ اسی اثنا میں مہمان بھی آ گئے سب نے مل کر کھانا کھایا اور عشا کی نماز سے فارغ ہو کر سب لوگ رات کو دیر تک بیٹھ کر خوش گپیاں لگاتے رہے۔

بارہ بجے مہمانوں کو رخصت کر کے زاریہ نے گھر کے دروازے بند کیے وضو کر کے تسبیح لے کر اپنے بستر پر آ کر نیم دراز اور یونہی ذکر کرتے کرتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے بڑا عجیب سا خواب دیکھا بلکہ اسے تو سب حقیقی ہی محسوس ہو رہا تھا اس نے دیکھا کہ وہ انتہائی تیز مگر بے حد پرسکون اور روشنیوں سے بھرے میدان میں ہے اور پھر روشنیوں ہی میں اسے ایک نورانی ہستی کا وجود نظر آیا جس نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

''اے اللہ کی نیک بندی تم اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہو نا سب تمہیں چھوڑ گئے ہیں مگر تم فکر نہ کرو تمہارا اللہ موجود ہے وہ تمہیں تنہا نہیں چھوڑے گا تم فکر نہ کرو۔''

اور پھر ایک دم زاریہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا سارا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور پھر اسے عجیب سی بے چینی اور گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ پیٹ کے اوپر کے حصے میں شدید درد ہو رہی تھی اس نے جلدی سے پاس پڑے سائیڈ ٹیبل پر پڑی بوتل سے گلاس میں پانی انڈیلا اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گئی۔ مگر بے چینی اور گھبراہٹ ختم ہی نہیں ہو رہی تھی اس نے سامنے والا کلاک کو دیکھا۔ رات ڈیڑھ بجے تھے کئی لمحوں تک وہ اپنی گھبراہٹ اور بے چینی پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔

پھر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے بیڈ سے اتری اور باہر کا گیٹ کھول کر کچھ فاصلے پر اپنے کیبن میں بیٹھے چوکیدار کو پکارا ''گل خان' گل خان۔'' اس کی تکلیف کی شدت سے بہت ہلکی آواز نکل رہی تھی۔ گل خان تک اس کی آواز تو نہ پہنچ سکی مگر اس نے اسے گیٹ پر سہارا لیے کھڑے دیکھ لیا وہ جلدی سے آیا ''کیا بات ہے باجی تم ٹھیک تو ہو نا'' گل خان نے تشویش سے پوچھا۔

''نن..... نہیں گل خان میری طبیعت بہت خراب ہے۔ پلیز تم ذرا میرے بھائی کے گھر کی گھنٹی بجا کر اسے بلا دو۔'' زاریہ نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔

''اچھا..... اچھا..... باجی ام بلاتا ہے اسے تم اندر جاؤ۔'' گل خان نے کہا اور پھر اوپر جانے والی سیڑھیوں کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ زاریہ لاؤنج میں آ کر صوفے پر نڈھال سی گر پڑی۔ تھوڑی دیر بعد گھبرایا ہوا شہروز آ گیا۔ اس نے جلدی سے گاڑی نکالی اور زاریہ کو سہارا دے کر گاڑی میں پچھلی سیٹ پر گدیوں کے سہارے لٹایا اور گاڑی تیزی سے ہسپتال کی جانب دوڑا دی۔ ایمرجنسی میں پہنچتے ہی زاریہ نے زور سے ہچکی لی اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

شہروز اور راحیلہ ہکا بکا کھڑے رہ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ زاریہ یوں انہیں چھوڑ جائے گی... ساری زندگی جس نے دکھوں اور تنہائی کے ساتھ گزاری مگر اپنے تمام رشتوں کا خیال رکھا سب کی سرپرست بنی رہی یہی وجہ ہے کہ آج سب لوگ اپنی زندگیوں میں مگن اور خوش ہیں اور زاریہ بھی اب پُرسکون ہو گئی اور یوں اس کی زندگی کا تنہائی کا سفر تمام ہوا۔ زندگی کی اصل حقیقت بھی یہی ہے اور اگر انسان سمجھے تو موت بھی اللہ کا انعام ہے کہ ساری زندگی کی بھاگ دوڑ' دکھ' ناکامیاں سب موت سمیٹ لیتی ہے اور بندہ بشر پُرسکون ہو جاتا ہے...

(ختم شد)

افسانہ

زرافشاں فرحین

اپنے حصّے کا دیا

16 دسمبر... وہ سیاہ ترین دن ہے جو شاید اب کبھی ہماری یادداشتوں سے محو نہ ہو سکے......

سانحہ آرمی پبلک اسکول پر لکھی ایک خوبصورت تحریر

ہجر کی صبح کی اداسی مت پوچھ
جتنی کرنیں ہیں وہ اشکوں کی طرح پھوٹتی ہیں

تجھ سے پہلے بھی کئی زخم تھے سینے میں مگر
اب کے وہ درد ہے دل میں کہ رگیں ٹوٹتی ہیں

رات کو اشک رہے دامن مژگاں سے ادھر
کشتیاں شب کو کنارے سے کہاں چھوٹتی ہیں

دن گزرتے جاتے ہیں۔ شام کے سائے ڈھلتے جاتے ہیں اکثر دکھ رفتہ رفتہ افسانہ بن کر محض خلش بنے رہ جاتے ہیں مگر کچھ دکھ درد بڑے بے رحم اور ثابت قدم ہوتے ہیں اور دل کی سرزمین پر کبھی خشک نہیں ہوتے بلکہ ہر سال اس گھڑی اس لمحے اس طرح، زخم ہرے ہو کر رسنے لگتے ہیں جیسے کاری واردات آج کی ہی بات ہو۔ میرے دل کے نہاں خانوں میں بھی ایک ایسا ہی زخم ہے جو ہر سال دسمبر کی آمد پر رسنے لگتا ہے مگر گزشتہ سال اس درد نے مجھے ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا، آخر کب تک سوگ مناؤں گی کب تک محض آنسوؤں میں ڈوب کر نوحہ خوانی کرتی رہوں گی۔ مشتاق احمد یوسفی زرگشت میں رقم طراز ہیں" ہر دکھ، ہر عذاب کے بعد زندگی آدمی پر اپنا راز کھول دیتی ہے جیسا اور جتنا اور جس کارن آدمی کو دکھ بھگتنا ہے ویسا ہی بھید اس پر کھلتا ہے نروان ڈھونڈنے والے کو نروان مل جاتا ہے۔ اور جو دنیا کی خاطر کشٹ اٹھاتا ہے تو یہ دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔"

یہی زندگی کا راز ہے جو بڑی مشکل سے سمجھ آتا ہے اب جا کر زندگی کی ساٹھ بہاریں گزار کر لگتا ہے مجھے بھی سمجھ آنے لگی ہے مگر اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں کیا کر سکتی ہوں ...... میری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو میری خواہش ناتمام بن کر زمیں بوس ہو رہے ہیں اس سے قبل کہ سانس کی ڈوری ٹوٹ جائے میں آج سب کو بتا دینا چاہتی ہوں زندگی متاع قلیل ہے اس سے قبل کہ چھن جائے اپنے حصّے کا دیا جلا دیں......

شہناز! تمہارے ساتھ گزرے ماہ و سال کل کی بات لگتے ہیں یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں، کوئی پندرہ سال قبل کی بات ہے۔ ایجوکیشن ایکسپو سے واپسی پر میری فلائٹ میں میری ہم سفر شہناز بڑے باوقار انداز میں سیٹ پر براجمان تھیں۔ یہ سیٹ کھڑکی کی سمت تھی اور میرے لیے اسی کا نمبر الاٹ ہوا تھا مگر شاید وہ غلط فہمی کی بنا پر نادانستگی میں وہاں بیٹھ گئی تھیں مجھے قدرے ناگوار ہوا اور میں نے اجنبیت سے انہیں مخاطب کیا۔ محترمہ! یہ سیٹ میری ہے آپ ادھر تشریف لے آئیں۔ میں نے دوسری سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اوہ! ویری سوری...... وہ خوش دلی سے مسکرائیں اور فوراً اٹھ بھی گئیں ......

آیئے پلیز تشریف رکھیں۔ میں بے دھیانی میں یہاں بیٹھ گئی تھی۔ ان کے باوقار اور خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ ان کا جواب میری سناری کلفت دور کر گیا اور مجھے دل ہی دل میں افسوس ہوا ناحق میں نے انہیں اٹھایا۔ حسب عادت کچھ ہی دیر میں مجھے ان سے بات کرنے اور ان کے بارے میں جاننے کی جستجو ہوئی...... "مجھے مریم کہتے ہیں مقامی کالج میں پروفیسر ہوں آپ کا تعارف......؟" میں نے ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔

"جی مس مریم مجھے شہناز عاطف کہتے ہیں۔ ڈاکٹر شہناز عاطف وائس پرنسپل گورنمنٹ یونیورسٹی آف پشاور......" وہ گویا ہوئیں اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا تو بس وہیں سے ہماری دوستی کا آغاز ہو گیا۔ پروفیشن ہی یکساں نہیں ہماری باہمی دلچسپیوں اور مشغولیات میں بھی ہم آہنگی محسوس ہوئی اور دو گھنٹے کی مختصر مسافت دوستی کا ایسا سنگ میل ثابت ہوئی جو آج تک دل کے نہاں خانوں میں براجمان ہے۔ شہناز عاطف مجھ سے عمر میں پانچ چھ سال بڑی ہی ہوں گی مگر بہت خوش مزاج اور زندہ دل میرے ماضی کی تلخ یادوں نے میرے مزاج کو بہت حد تک ریزرو اور خشک کر دیا ہے، مجھے بہت کم لوگ پسند

آتے ہیں مگر شہناز کی گفتگو انداز نشست و برخاست نے بہت جلد مجھے ان کا گرویدہ کردیا اور پھر میرا ان سے اکثر فون پر فیس بک پر رابطہ رہنے لگا۔ شہناز یونیورسٹی میں پروفیسر تھیں مگر ان کی خواہش تھی انہیں کسی اسکول میں جاب مل جائے اور وہ بچوں کی تربیت اور کیریکٹر بلڈنگ میں بحیثیت استاد تدریس کے فرائض انجام دیں۔ ڈبل ماسٹرز ایم فل۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے بعد ان کی یہ خواہش مجھے عجیب ہی لگتی میں ان سے الجھ جاتی اور وہ مسکرا مسکرا کر اپنی ہی بات پر اصرار کرتیں۔ پھر ایک روز لاہور ان کی آمد پر بڑا خوشگوار دن تھا جب ہم مل کر بیٹھے اور ایک دوسرے کے ساتھ حال دل شیئر کررہے تھے۔ وہ بہت دلچسپی سے میری رام کہانی سن رہی تھیں اور میں زود رنجی کا شکار آنکھوں میں آنسو لیے دل کے زخم ڈھیرے ڈھیرے عیاں کررہی تھی۔ آپ سوچ ہی نہیں سکتیں کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اپنوں کا ہی بیگانہ اجنبی ہوجانا۔ یہ کرب میں نے سہا ہے میں بھول نہیں سکتی ۱۹۷۱ء کا سانحہ جب پاکستان دولخت ہوا۔ ابا جان ایک مضبوط اعصاب کے مالک انتہائی محب وطن اور مخلص انسان تھے۔ مغربی پاکستان ہو یا مشرقی پاکستان ہر جگہ اپنے فرائض بخوبی انجام دیتے رہے فوج میں شمولیت ان کی دیرینہ خواہش تھی جب وہ پوری ہوئی تو گویا انہیں ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ امی سادہ طبیعت گھریلو مگر بہت سلجھی ہوئی خاتون۔ ہم چار بہن بھائی ابا جان جب کبھی ہمیں ساتھ لے کر بیٹھتے جس کا موقع شاذ ہی نصیب ہوتا تھا کہ ان کی تعیناتی کبھی کہیں کبھی کہیں تو ہمیں بہت فخر سے بتاتے کہ ان کی زندگی کتنی بامقصد ہے اپنے وطن کی سرحدوں کی حفاظت ان کا فخر ہے اور یہی فخر وہ اپنی اولاد میں منتقل کرنا چاہتے ہیں ہم بھی بڑے مزے سے ان کی تائید کرتے۔ بھائی نیوی اور آرمی میں جانے کی دعا کرتے اور میں ائیر فورس میں خود کو کسی جانباز مجاہد خاتون کے روپ میں دیکھتی اور ابا جان ہمیشہ میرے خواب سن کر کندھا تھپتھپاتے تو جیسے میں جی اٹھتی۔ شہناز میری بات سننے میں اس قدر گم کہ چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہوجاتی مگر ان کی محویت میں فرق نہ آتا۔ تب مجھے آپ ہی ہوش آتا۔

''ارے میں بھی نا! بس اپنی یادوں میں ہی کھو جاتی ہوں۔ میں شرمندہ ہوئی اور چائے دوبارہ گرم کرکے لے آئی اسی اثنا میں میری بیٹی عبیرہ حسب عادت لاؤنج میں آئی تو ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی۔ شہناز ان دنوں چھٹیوں میں میرے پاس چند دن گزارنے آگئی تھیں لہٰذا ہم خوب فرصت سے باتیں کرتے اور ایک دوسرے کا دکھ بانٹتے۔

''عبیرہ بیٹی! کون سا ڈرامہ اس قدر دلچسپی سے دیکھ رہی ہیں۔'' شہناز نے عبیرہ کو چینل بدلتے دیکھا تو پوچھا ''آنٹی جان کوئی بھی نہیں سارے ڈرامے ایک جیسے ہی آتے ہیں مجھے تو کوئی بھی دلچسپ نہیں لگتا۔'' عبیرہ نے بیزاری سے چینلز بدلتے ہوئے منہ بنایا۔ جو ڈرامہ دیکھو عورت پر ظلم۔ مرد ظالم۔ ایسا لگتا ہے پاکستانی معاشرے میں صرف ظلم وستم ہی رہ گیا ہے اور کوئی موضوع ہی نہیں۔ پڑوسی ملک کے ڈراموں میں اپنی تہذیب اپنے کلچر کو اتنا فخریہ دکھاتے ہیں جبکہ ہمارے یہاں صرف اپنی معاشرت کے برے اور منفی پہلو ہی دکھائے جاتے ہیں۔ میرا دل بہت بدمزہ ہوتا ہے۔''

عبیرہ کی گفتگو نے شہناز کو بھی متوجہ کیا ہوا تھا اور وہ اس کی بے چینی محسوس کرکے حسب عادت اسے سمجھانے لگیں۔ بیٹا آپ کا یہ تنقیدی جائزہ تو اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ آپ ڈرامہ لکھنے اور اس کے معاشرتی اہم موضوعات کو سمجھنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ ماشاءاللہ آگے کیا ارادہ ہے بیٹی کا۔ مریم...... اسے بھی ڈاکٹر بنانے کی خواہش تو نہیں۔'' آخری جملہ شہناز نے مجھے مخاطب کرکے کہا کیونکہ میرے بڑے دونوں بیٹے ایم بی بی ایس کررہے ہیں مجھ سے پہلے عبیرہ نے لجاجت سے کہا ''آنٹی پلیز ممی کو سمجھائیں نا......'' میں ہنس پڑی۔

''میں نے نہیں پڑھنی سائنس میں کچھ اور پڑھنا چاہتی ہوں......'' شہناز کی نظریں اب میری طرف تھیں ''بھئی ابھی تو یہ صرف میٹرک میں ہے آگے فیصلہ کرسکتی ہے مگر آرٹس پڑھ کر کرنا کیا ہے مجھے سمجھ میں نہیں آتا!!'' میں نے کندھے اچکائے۔

''تمہاری اس سوچ پر تو مجھے حیرت ہورہی ہے مریم۔ کیا سائنس پڑھنے والے ہی کچھ بنتے ہیں اور کیا ڈاکٹر اور انجینئر ہی کوئی مقام رکھتے ہیں باقی سب غیر اہم ہیں دیکھو ہمارے انٹلیکچول جب سائنس کے ہی سبجیکٹ پڑھنے لگ جائیں گے تو معاشرے میں سیاست کرنے، صحافت کرنے والے معیشت سنبھالنے والے یا تدریس کا شعبہ سنبھالنے والے ایسے ہی لوگ رہ جائیں گے جو آج کثیر تعداد میں ملک کی باگ ڈور سنبھالے بیٹھے ہیں بھئی ان شعبہ جات میں بھی باصلاحیت افراد کو آگے آنا چاہیے۔ اگر عبیرہ میں صلاحیت اور ذوق ہے تو اسے ماس کمیونیکیشن یا صحافت میں ڈگری دلواؤ یہاں بھی باشعور لوگوں کی ضرورت ہے۔''

شہناز کی بات دل کو لگی اور ایسی لگی کہ آج عبیرہ ایک معروف اخبار میں معروف کالم نگار ہی نہیں الحمدللہ اپنی فیلڈ میں کامیاب اور محب وطن باحمیت صحافی بھی ہے۔

آہ...... کیا کیا یاد کروں شہناز کو جب علم ہوا کہ میرے ابا جان ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شہید ہوئے اور آخری وقت تک پاکستان کی تقسیم کے لیے راضی نہ تھے۔ تڑپتے تھے۔ روتے تھے۔ سیاسی و عسکری قیادتوں کی بے تدبیری اور کوتاہ نگاہی نے کئی ایسے معصوم گمنام سپاہیوں کے لہو کو رائیگاں کردیا جو صرف اور صرف پاکستان اور اسلام کی بقا چاہتے تھے۔ ہمارے لیے تو ابا جان کی شہادت اور پاکستان کا دولخت ہوجانا ایسا المناک واقعہ تھا جو ہماری روح کے اندر پیوست ہوکر رہ گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد ہی امی جان کی رحلت...... یہ ہم سب بہن بھائیوں کے لیے شدید جسمانی اور روحانی دھچکا تھا۔ اس وقت بڑے بھائی محض سترہ سال کے تھے اور میں محض سات سال کی تھی۔ ہمارے خواب بکھر گئے ایک گمنام سپاہی کی اولادیں کس کسمپرسی میں پاکستان یہاں لاہور آئیں اور کن حالات میں تعلیم حاصل کی روتے دھوتے کئی کئی فاقے کرتے بھائی بڑی مشکل سے وظیفے حاصل کرکے سول سروسز میں پہنچے اور مجھے کسی لائق بنانے میں کامیاب ہوئے یہ ایک ایسی تلخ داستان ہے جسے سناتے یاد کرتے میں بارہا ہچکیوں سے رو دیتی۔ میری اکلوتی بیٹی عبیرہ کو یہ سب ازبر تھا مگر شہناز نے جب میرے درد کو سنا اور سمجھا تو بڑے پیار اور مدبرانہ انداز میں سمجھایا کہ مریم سانحے زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں مگر یہ ہمیں توڑنے کے لیے نہیں رب سے جوڑنے کے لیے آتے ہیں۔ غم کی لکیر کو انگلی پھیرتے رہو تو زخم گہرے ہوجاتے ہیں کیوں نہ اس لکیر پر اپنی کسی نیکی کا پھایا رکھ دیا جائے کہ زخم مندمل ہی ہوجائے۔

شہناز نے مجھے رسان سے سمجھایا اور میں بھی گویا پھر سے جی اٹھی۔ اسی دوران مجھے اپنے ادارے میں چند ساتھیوں کی داخلی سیاست کی بنا پر شدید مخالفت اور ناخوشگوار ماحول کا سامنا کرنا پڑا میرا دل بہت برا ہوا میں نے گھر آتے ہی فون سنبھالا اور شہناز سے بات شروع کی...... سمجھ میں نہیں آتا لوگ چاہتے کیا ہیں نہ خود چین سے جیتے ہیں نہ جینے دیتے ہیں یہ

جاب میری ضرورت نہ ہوتی تو میں کب کی چھوڑ دیتی مگر مجبوری ہے تم تو جانتی ہو ضروریات زیادہ اور آمدنی محدود...... یہ جو جاب کی شوقین گھروں سے آنے والی خواتین ہیں آزادیٔ نسواں کی علمبردار انہوں نے ہم جیسی مجبور خواتین کی زندگی کو تماشا بنا دیا ہے۔ میری آواز گویا گلے میں پھنس گئی۔

ارے بھئی مریم یہ تو روٹین کی بات ہے ڈیئر اس پر اتنا ملال کیوں ہو رہا ہے تمہیں جو تمہاری ساتھی ٹیچرز نامناسب رویہ رکھتی ہیں ان سے محتاط رہو اور بس اپنے کام سے کام رکھو انہوں نے رسانیت سے سمجھایا۔

''یہ کیسے ممکن ہے بھلا...... اپنے کام سے کام رکھوں...... کہاں تک انسان برداشت کرے۔ میرا تو دل چاہتا ہے ان سب بددیانت لوگوں کو لائن میں کھڑا کر کے گولی سے اڑا دوں۔ بیڑہ غرق کر دیا جائے ان سب کا......'' میرا خون کھول رہا تھا۔ اصل میں کالج میں کچھ اساتذہ نے لابنگ کی اور ہماری ایک ساتھی ٹیچر کو جو بہت دیانت دار اور ڈیوٹی فل خاتون تھی ملازمت سے نکلوا دیا میں نے ان کی حمایت کی تو مجھے بھی اب اپنی سیاسی چالبازیوں، جھوٹ اور چاپلوسی کی سازشوں کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

میں سخت مایوس اور بدظن ہو گئی تھی اور شہناز سے اصرار کر رہی تھی اس قوم کا کچھ نہیں بننا، بددیانتی کرپشن، خودغرضی اور مفاد پرستی نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا اور بس اب ہمیں کسی عذاب کا ہی شکار ہونا ہے یا کسی فرشتے کا انتظار اور ایسی جادو کی چھڑی تلاش کرنی ہے جو یکلخت سب کچھ بدل دے۔ میری بات سن کر بھی شہناز نے اپنی خو نہ بدلی...... تم کچھ بھی کہو مریم ہم استقامت سے اپنا کام کیے جائیں نیکی اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے۔ اچھا ہاں سنو! میں نے یونیورسٹی کی جاب چھوڑ دی ہے بہت عرصے سے کوشش تھی آرمی پبلک اسکول میں ہیڈ مسٹریس کی جاب مل جائے مگر نہ جانے کیا کیا رکاوٹ تھی الحمدللہ اب تعینات کر لیا ہے انہوں نے...... وہ بڑی خوشی سے بتانے لگیں۔

''ارے اچھا مبارک ہو۔ آپ کی یہ منطق بھی سمجھ سے بالاتر ہے لوگ یونیورسٹی کی جاب کے لیے ترستے ہیں آپ اسکول میں خوش!'' میں نے قدرے اچنبھے سے کہا۔

''ہاں مریم! تم تو جانتی ہو مجھے بچوں سے کتنی انسیت ہے مجھے لگتا ہے براہ راست ان بچوں کو پڑھاؤں سکھاؤں یہ جنت کے پھول ہیں میں ان کی خوشبو سے اس ملک کو اس شہر کو معطر کرنا چاہتی ہوں انہیں اپنا صدقہ جاریہ بنانا چاہتی ہوں یہ کچی نوخیز کلیاں ہیں انہیں پھولوں کی طرح کھلنے تک میں ان کا ساتھ چاہتی ہوں...... شہناز کی یہ جذباتی گفتگو اس وقت مجھے محض ان کے شوق اور جنوں کی کہانی لگی مگر آج میں سوچتی ہوں یہ عزم و ارادے کی فصیلیں بڑے بڑے قلعے تعمیر کر دیتی ہیں۔ ایسے مضبوط قلعے جن کی دیواریں کبھی نہ ہلائی جا سکیں کبھی نہ گرائی جا سکیں۔

اور پھر یوں ہوا کہ شہناز ہمہ تن قائد ہمہ تن رہنما ایک بہترین استاد بن کر ہیڈ مسٹریس ہونے کے باوجود وہ طلبا و طالبات کے لیے ہر دلعزیز بن گئیں اسکول کی اساتذہ اور تمام طالب علم ان کے گرویدہ۔ یہ ان کی بصیرت، نگاہی تھی صلاحیتوں کے مطابق کچھ نوخیز کلی جیسے بچوں کو کسی تناور درخت بننے کے مرحلے تک ہاتھوں سے تراشنا ان کی زندگی کا مقصد بن گیا میں خاص ان سے ملنے ایک اسکول کی ہی تقریب میں پہنچی اور مجھے لگا وہاں ان کے اردگرد موجود لوگ بھی ان کی ہی طرح متحرک، پرجوش اور بامقصد زندگی گزارنے کے خواہاں ہیں اس ماحول میں میں نے اپنے اندر تک ایک تازگی محسوس کی۔ میں ان کے ساتھ صبح شام ہوتی اور دیکھتی کہ کس طرح وہ کبھی بچوں کو اپنے وطن سے محبت کا سبق دے رہی ہوتیں کھیل ہی کھیل میں ان کی صلاحیتوں کو نکھارتیں ان کی زندگی گویا ایک مشن تھی کہ کسی طرح وہ ایسے نوجوان تیار کر لیں جو بامقصد اور فعال زندگی گزاریں یہی نہیں ان کا بچوں کی ماؤں سے بھی بڑا خوبصورت دوستانہ تعلق تھا اکثر ان کے آفس میں اسٹوڈنٹس کی مائیں اپنے مسائل شیئر کرتی نظر آتیں ایسے ہی ایک دن ہم ایک بچے کے والدین کے ساتھ آفس میں موجود تھے اور شہناز بڑی دلسوزی سے گویا تھیں ''دیکھیے نئی نسل بہت باصلاحیت اور پرعزم ہے ان کی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے ہر وقت غصہ شکایات روک ٹوک بچوں کو والدین سے دور کر دیتا ہے سب سے قریب اور عزیز آپ ہی ہیں اگر آپ کے بچوں کی دوستی نہیں ہو گی تو وہ معاشرے میں کمزور سہارے تلاش کرتے پھریں گے...... میڈم آپ کو کیا بتائیں۔ اتنی ضدی ہیں میری بیٹیاں کہ بس بات تو سننا سمجھنا ہی نہیں صرف اپنی ہی منوانی ہیں میں تو بہت بیزار ہو گئی ہوں اب۔ لیک والدہ بہت برا سا منہ بنائے دکھ بیان کر رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی یہ الٹرا ماڈرن خاتون نہ جانے کہاں وقت گزارتی ہیں جو اپنے ہی بچے سے بیزار اور ناامید ہیں۔ دیکھیے بیزار مت ہوں حضرت عمر فاروقؓ کی Tips یاد رکھیں ایک عمر ہوتی ہے بچے کو سکھانے اور کھیل کھلانے کی مگر دوسری عمر اس کے ساتھ دوستی نبھانے کی آتی ہے کچھ اس کی سنیں کچھ اپنی کہیں، فیصلوں میں اسے مشورہ دیں مگر اس کے جذبے اس کے حساسات کو سمجھیں وہ کیا چاہتی ہیں انہیں کیا پسند ہے اور پھر ایک عمر بہرحال ایسی آتی ہے جب انہیں خود اپنے لیے پسند ناپسند کرنے کا اختیار دینا چاہیے مگر اس سے پہلے سکھانے کا عمل مکمل ہو تب ہی وہ درست فیصلہ کرتے ہیں......'' شہناز رسانیت سے سمجھا رہی تھیں اور میں اس ماں کو دیکھ رہی تھی جو آج ہمارے اردگرد لاکھوں کی تعداد میں ہے مگر اپنے منصب اور ذمے داری سے قطعی نابلد۔ وہ وقت جب بچوں کو ضرورت ہوتی ہے کہیں اور لگا دیتی ہیں اور پھر اوور ایج ہو کر تقاضا کرتی ہیں کہ اب بچے ان کی مانیں اور ان کے اشاروں پر چلیں...... یہ نشست تو یونہی بغیر نتیجے پر پہنچے ختم ہو گئی مگر بہت ساری نشستیں شہناز کے ہمراہ لگتا تھا کوئی نہ کوئی نتیجہ کبھی نہ کبھی ضرور دیں گی جیسے خوشبو کو بتانا نہیں پڑتا کہ وہ خوشبو ہے بلکہ اس کا ہونا ہی کافی ہوتا ہے ایسے ہی وہ جہاں ہوتیں احساس ہوتا کہ کوئی ہے دستِ شفقت و محبت جو اپنی قوم کی نسل نو کے لیے بہت حساس ہے خود اپنے بچے بھی ماں کے دیوانے۔ دو بیٹے عفان اور برہان...... لگتا ابھی کم عمری میں ہی دنیا کو فتح کر لیں گے۔ مجھے ان کی کمپنی میں گزرا وقت کبھی نہیں بھولے گا اور نہ ہی بات فراموش کر سکتی ہوں کہ عورت کے دم سے ہی گھر، مکان سے گھر بنتا ہے اور نوخیز کلی جیسے معصوم ذہن کی تعمیر جب عورت اور وہ بھی استاد کے ہاتھوں جس لگن اور اور شوق سے ہوتی ہے اس کی تصویر معاشرے کی خوبصورتی یا بدصورتی کا فیصلہ کر دیتی ہے۔

اس دن ۶ ستمبر یوم دفاع تھا۔ یادگار دن پاکستانی قوم کے لیے تجدید عہد کا دن...... اسکول میں خوب رونق تھی بچے اور اساتذہ جوش و خروش سے تقریب یوم دفاع کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ شہناز نے خود بچوں کو پرجوش تقاریر اور پرعزم ملی نغموں کی تیاری کروائی تھی میں جز بز ہوتی بھئی کچھ کام دیگر ٹیچرز کے لیے بھی چھوڑ دیں نا ضروری ہے ہیڈ مسٹریس صاحبہ سب کچھ خود دیکھیں سب کچھ خود کریں۔ میں بے زاری سے کہہ اٹھی اور وہ مسکرا مسکرا کر اپنا کام کیے جاتیں، کسی ریاضت کی طرح شوق سعادت کی طرح...... دیگر اساتذہ کی نااہلی بھی کبھی

خوب کھلتی اور میں شکایات کا دفتر کھول کر بیٹھ جاتی...... بچوں کی کبھی دانستہ نادانستہ غلطیاں یا بے وقوفیاں دل جلاتیں اور وہ آرام سے کہہ دیتیں...... مایوس نہ ہو پلیز مریم! زندگی کا مقصد طے کرلیا جائے اور اسے ضائع نہ ہونے دیا جائے تو اس کا اثر فرد کی تبدیلی کا ہی نہیں پورے ماحول کی تبدیلی کا سبب بنتا ہے ہمیں بحیثیت استاد اپنا کردار ایسے ہی نبھانا ہوگا۔“

شہناز کی یہ نصیحت گویا میں نے گرہ میں باندھی لی اور سمجھ لیا کہ ہر وقت رونا، سب کے عیبوں پر جلنا کڑھنا یا محض عیب جوئی کرنا مسائل کا حل نہیں بلکہ کچھ بڑھ کر خود اچھا کرلینا با مقصد زندگی کی دلیل ہے...... وہ شہناز کی دوستی کا ہی اثر تھا کہ میں نے مسائل کی پر پیچ گلیوں میں اونچے نیچے راستے میں بھٹکنے کے بجائے وقت کی انگلی تھامے مسکراتے چہرے کے ساتھ پار اترنے کا طریقہ سیکھا۔ سمندر میں اٹھنے والے جوار بھاٹے میں شناوری کا ہنر جان لیا اسی لیے...... اسی لیے جب وہ کربناک، اذیت ناک واقعہ رونما ہوا تو نہ میرا دل بند ہوا نہ سانس...... نہ زمیں پھٹی نہ آسمان گرا...... ہاں بس ایک تنہائی کا احساس تھا شدید ترین احساس جو رگ و پے میں اترتا چلا گیا۔

۱۶ر دسمبر کا ہولناک دن۔ سورج ہمیشہ کی طرح آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا۔ کیا معلوم تھا کہ آج یہ سورج بھی اپنی تابنا کی پر شرمسار ہوگا۔ کوئی بھول ہی نہیں سکتا اس لمحہ اذیت ناک کو جب ننھے ننھے نہ جانے کتنے معصوم فرشتے نوخیز کلیوں کی طرح تازگی اور ملاحت چہروں پر سجائے اس دن بھی روز کی طرح اپنے اسکول آئے تھے۔ سالانہ اسکول کی تقریب کی تیاری نے ان کے جوش اور عزم سے دمکتے چہروں کو مزید روشن کر دیا تھا۔ کیا خبر تھی یہ روشنی اب ظلمت کی سیاہی میں ڈھل جائے گی۔ شہناز اس اسکول کی ہیڈ مسٹریس دشمنانِ وطن کی بربریت اور دہشت گردی کا نشانہ اس وقت بنیں گے جب و اپنے لیے بننے والے صدقۂ جاریہ معماران وطن کے آگے ڈھال بن کر کھڑی ہوئیں۔“ وہ کچھ لوگ تھے جو اپنی نذر پوری کر چکے تھے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اپنے انجام سے خوش۔ فرشتوں کی سلامتی کے جھرمٹ میں ان کا شاہانہ استقبال اور جنت کے دروازوں کا بانہیں پھیلا دینا۔“

کہتے ہیں ”مرتے نہیں وہ لوگ، جیتی ہیں جن کی نیکیاں!“

وہ ننھے معصوم فرشتے خون میں نہائے وجود پھولوں کے جنازے اور ان کے درمیان مسجود ملائکہ وہ مشرف ہستی اس استاد کی جس نے جان دے کر حق ادا کیا اور اپنے لہو سے اپنے حصے کا دیا روشن کر دیا۔ ہر مرنے والے کی دنیا تعریف کرتی ہی ہے مگر کیا خوب ہوتے ہیں وہ جن کے مرنے کے بعد ایمان کی تازگی نصیب ہوتی ہے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی خواہش زندگی کی اولین خواہش بن جاتی ہے۔ کچھ لوگ ایسا تارۂ کامل ہوتے ہیں جن کے عروج سے نجم بھی سہم جاتے ہیں۔ وہ کچھ ایسی ہی ہستیاں تھیں جو ماہ دسمبر میں پوری قوم کو ہلا گئیں۔ میں بعد میں کئی بچوں کی ماؤں سے ملی جو شہید ہوگئے تھے۔ شہناز باجی سب کو خوبصورت لفظوں میں یاد رہیں اور میں آج یہ شدید خواہش رکھتی ہوں یہ دعا اکثر زیر لب دہراتی ہوں...... اے اللہ ظلمت شب کے شکوہ سے کہیں بہتر ہے اپنے حصے کا دیا جلائے رکھیں جیسے شہیدانِ وطن جلا گئے:

دل پہ اترے گا سکونِ بے مثال
اک دفعہ شمع جلا کر تو دیکھیے

مَیں جو مر جائے تو ہم مرتے نہیں
زندگی کو آزما کر دیکھیے

راستے سب آسان ہوتے جائیں گے
آسانیاں سب کو دلا کر دیکھیے ☆☆

افسانہ

حبیبہ عمیر

جیسے کو تیسا

جوائنٹ فیملی سسٹم بہت بڑی نعمت ہے اگر کوئی سمجھنا ہی نہ چاہے تو اس کا وہی انجام ہوتا ہے جو شازیہ کا ہوا....

مہرو تھکی ہوئی سی گھر میں داخل ہوئی اور سیدھا کچن میں گھسی۔ اسے شدید بھوک لگی تھی آج صبح کا ناشتہ منیر کے چکر میں گل ہو گیا تھا اور ہاسپٹل میں بھی ڈھنگ سے کچھ کھا نہیں پائی تھی اسی لیے بھوک گری

کے سورج کی مانند جوبن پر تھی۔ آگے سے خالی کچن منہ چڑا رہا تھا۔ اس کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ سیدھی کمرے میں آئی اور بیگ بیڈ پر پٹخ دیا۔

''کیا ہوا ہے مہرو؟'' اس کی امی جو کہ پاس پڑے تخت پر لیٹی تھیں اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔

''امی شدید بھوک لگی ہے اور آج کچھ نہیں پکایا ابھی تک آپ نے۔'' وہ ناراض سی بیڈ پر بیٹھ گئی اور اسکارف کھولنے لگی۔

''ہاں بیٹا میرے گھٹنوں میں شدید درد ہے آج اسی لیے اٹھا نہیں جا رہا ہے۔ بچہ سے تم رکو میں ابھی روٹی ڈالتی ہوں اور ساتھ ہی سالن چڑھا دیتی ہوں۔'' وہ شرمندہ سی بولیں تو مہرو تڑپ اٹھی اپنی ماں کی حالت دیکھ کر۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی امی کو کمر درد کا مسئلہ ہے اور ٹانگوں میں بھی شدید درد رہتا ہے۔ وہ شرمندہ سی ان کے پاس آ گئی۔

''امی طبیعت زیادہ خراب ہے کیا؟'' وہ دونوں ہاتھ ان کے زانوں پر دھر کر بولی۔

''ہاں آج نجانے کیوں درد زیادہ ہے معمول سے'' وہ بولیں۔

''وہ اس لیے کہ کل میرے منع کرنے کے باوجود مشین لگا کر کپڑے دھوئے تھے آپ نے'' وہ منہ پھلا کر بولی۔

''تو بیٹا کس نے کام کرنے ہیں یہ؟'' وہ اس کا چہرہ دیکھ کر مسکرا دیں جو پھولا ہوا بالکل کسی تربوز کی طرح لگ رہا تھا۔

''کیوں بھابی صاحبہ کس مرض کی دوا ہیں۔ سارا دن کمرے میں گھسی رہتی ہیں اور شام کو باہر نکلتی ہیں۔ اب وہ دلہن نہیں ہیں خیر سے چھ ماہ ہو گئے ہیں شادی کو مگر ان کا دلہنا پا ہے جو ختم ہونے کو ہی نہیں آ رہا۔''

اسے مزید غصہ چڑھ گیا۔

''تم چھوڑو اس کو وہ بس ذرا دوسرے مزاج کی ہے تم رکو میں لاتی کھانا۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھنے کو تھیں کہ وہ بول پڑی۔

''آپ رہنے دیں میں کر لیتی ہوں۔'' وہ کہتی ہوئی اٹھی۔

فریج سے اس نے میتھی نکالی جو اللہ کے فضل سے امی نے کل بیٹھی بیٹھی بنا دی تھی ورنہ یہ کار خیر بھی اسے خود انجام دینا پڑتا۔

اس نے میتھی ایک طرف رکھی اور ٹوکری میں سے آلو نکال کر چھیلنے لگی۔ اتنے میں بھابی صاحبہ نہائی دھوئی کمرے سے باہر آئی۔

''ارے مہرو تم آ بھی گئیں...... اچھا مجھے بھی ناشتہ دینا پلیز۔'' وہ چہک کر بولیں۔

مہرو کا دماغ دو چند ہو گیا۔

''آپ اب سو کر اٹھی ہیں بھابی؟'' اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

تین بج رہے ہیں دوپہر کے اور آپ اب اٹھی ہیں خیر سے۔ اس بار ذرا آواز تھوڑی کرخت تھی۔

''ہاں...... کیا کروں تمہارے بھائی ساری رات سونے کہاں دیتے ہیں مجھے......'' وہ مزے لے کر بولی تو مہرو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ٹماٹر کی طرح ہو گیا۔

''میرا مطلب ہے کہتے ہیں مجھ سے باتیں کرو...... تم کیا سونے کی کرتی ہو'' وہ شرمائی سی دوبارہ بولی۔

''میری ہیلپ کی ضرورت تو نہیں نا؟'' وہ پوچھ کم اور بتا زیادہ رہی تھیں۔

''کیوں نہیں۔ بالکل ہے'' مہرو نے موقع غنیمت جانا اور فوراً کہا۔

''یہ سالن چڑھا دیں میں تب تک آٹا گوندھ لیتی ہوں آپ سب کے لیے روٹیاں بنا دیجیے گا'' وہ آلو انہیں تھماتے ہوئے کنستر سے آٹا نکالنے لگی۔

بھابی کا منہ لٹک گیا۔ مرتے کیا نہ کرتے والی مثال پوری بیٹھی اور وہ بادل نخواستہ چھری لے کر کام کرنے لگی۔

مہرو نے پہلے آٹا گوندھا پھر رات کے برتنوں سے جو سنک ابھی تک لشکارے مار رہا تھا وہ صاف کرنے میں جت گئی۔

بھابھی روٹیاں بنانے لگیں تو ایک بھی روٹی گول نہ بنی کیونکہ اماں کے گھر میں سدا کی کام چور تھیں اور یہاں آ کر بھی ساس اور میاں سے نخرے ہی اٹھوا رہی تھیں اب تک۔

مہرو نے دوبارہ مڑ کر انہیں دیکھا اور وہ فوراً کچن سے نکل گئی۔

بادل نخواستہ وہ انہیں اپنی معصوم صورت جو کہ حسن کے چاند سے مزین تھی دکھا کر پگھلا نہ لے اور کمرے میں دوڑ آئی۔

ابھی وہ بیڈ پر لیٹی تھی کہ آپی کا فون آ گیا۔

''کیسی ہو تم اور امی کا سناؤ......'' وہ مہرو کی آواز سنتے ہی بولیں۔

''میں فٹ ہوں بس ذرا امی کی طبیعت تھوڑی خراب ہے وہی ٹانگوں کا درد ازلی دشمن بنا ہوا ہے ان کا'' وہ اپنی بے خبر ماں کو سوتے دیکھ کر بولی۔ آپی اور بھائی کی شادی اکٹھی ہی ہوئی تھی۔ اس کی شادی کو بھی چھ ماہ ہوئے تھے۔ ''تم سناؤ کیسی ہو اور تمہارے میاں کیسے ہیں؟'' وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے مزے سے انہیں ہلاتے ہوئے بولی۔

''سب ٹھیک ہے۔ میں بھی ابھی بس فارغ ہوئی ہوں سارے کاموں سے تو سوچا فون کر لوں۔'' وہ دوپٹے سے پسینہ پونچھ کر بولی۔

''ہائے میری بہن بچاری سارے گھر کی ذمہ داری اس کمزور بلکہ مظلوم کے کاندھوں پر دھری ہے۔'' وہ مذاق بناتے ہوئے بولی۔

''چل ہٹ ری......'' وہ ہنس دی اور فون بند کر دیا۔

اتنے میں منیر بھی اسکول اور اکیڈمی سے فارغ ہو کر آ گیا۔ ساتھ ہی عصر کی اذانیں قریب کی مسجد سے گونجنے لگیں۔

چلو تم ہاتھ منہ دھولو اور امی کو مت جگانا میں نماز پڑھ لوں پھر کھاتے ہیں کھانا۔ وہ منیر کو کہہ کر وضو کرنے چل دی۔

نماز سے فارغ ہو کر جب وہ کچن میں گئی تو شیلف پر اسی طرح بیلنا پڑا تھا جہاں روٹی پکی تھی اسی طرح خشکہ دھرا تھا اور اسے ڈھانپا بھی نہیں گیا تھا۔ مہربانی یہ تھی کہ چولہا بند تھا۔

''حد ہے پھوہڑ پن کی۔'' مہرو زیر لب بڑبڑائی اور کھانا نکالنے لگی۔

جیسے ہی ہنڈیا کا ڈھکن کھولا تو ہنس دی'' ارے دنیا کو کون سا پاگل آلو میتھی شوربے والا بناتا ہے۔'' وہ زور سے بولی

''اب کیا کریں کھانا تو کھانا ہی ہے ناں'' وہ نکالتے ہوئے بولی۔

منیر نے جیسے ہی روٹی کو دیکھا تو بولا ''یہ روٹی کو کیا ہوا ہے؟ ٹیڑھی میڑھی کیوں ہے اور اتنی موٹی اور کچی ہے یہ۔'' وہ روٹی واپس رکھ کر بولا۔

''چلو کھا لو تمہاری پیاری بھابی کے کارنامے ہیں'' وہ بولی۔

''اف توبہ ہے...... یہ کڑوا سالن مجھے نہیں کھانا یہ سڑا ہوا گندا سالن......'' منیر نے کٹوری پیچھے کھسکائی۔

''امی مجھے پیسے دیں میں خود باہر سے جا کر کچھ لے آؤں گا۔'' وہ غصے سے بولا۔

''امی دے ہی دیں اسے پیسے کیونکہ یہ کھانا

واقعی حلق سے اتارنے کے لائق نہیں ہے۔" مہرو کو بھی شدید غصہ تھا بھابی کی حرکتوں پر کچھ تو وہ پھوہڑ تھیں کچھ بے دلی سے کام سر سے اتارنے کو ہی کیا کرتی تھیں اور کچھ اپنے ناز اٹھوانے کا شوق تھا۔ جب سے آئی تھیں یہی چلن تھا۔

سارا دن کمرے میں رہنا نہ کسی سے سلام دعا نہ بات چیت عین بھائی کے آنے سے پہلے کبھی سنوری سی باہر آنا اور چائے دم پر رکھنا اور جتانا کہ دیکھو سارا دن کچن میں ہی گزرتا ہے میرا اور بھائی بھی بے دام کا غلام جسے نئی بیوی کے سامنے کچھ نظر نہ آتا تھا کہ ماں بہن کا کیا حال ہے۔ بھائی کیسے ہیں۔ آتے ہی بیوی کے گھٹنے سے لگ جانا در پھر کہیں گھومنے پھرنے نکل جانا رات کو دیر سے لوٹنا اور کمرے میں گھس جانا۔ اب مہرو ان حرکتوں سے عاجز آ گئی تھی جو پچھلے چھ ماہ سے ہو رہی تھیں۔

نصیر بھی دفتر سے آ کر تھکا ہوا بیڈ پر بیٹھا۔

"مہرو یار کھانا لا دو۔ بھوک لگی ہے" وہ جوتے اتارتے ہوئے بولا۔

مہرو نے ٹرے لا کر سامنے پٹخ دی۔

"یہ کیا ہے؟ اس کی بھی کھانے کو دیکھ کر ہنسی چھوٹ گئی۔"

لمبے شوربے والی آلو میتھی اور عجیب الخلقت روٹیاں۔

"تمہاری بھابی صاحبہ کے کارنامے ہیں۔" وہ غصے سے بولی۔

"تو یہ کارنامے بھائی کو ہی کھلاؤ میں تو چلا کچھ اور کھانے..." وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"جا ہی رہے ہو تو امی کے لیے لیتے آنا" وہ ٹرے واپس کچن میں رکھنے جاتے ہوئے بولی۔

آج سات بج گئے تھے اور بھابی صاحبہ ابھی تک کمرہ نشین تھیں اور انہیں بلانے کی غلطی بھی کسی نے نہیں کی تھی۔ بھائی حسب عادت ساڑھے سات بجے گھر آئے۔ اماں کو سلام کر کے فوراً کمرے میں گھسے اور دس منٹ بعد غصے میں باہر آئے۔

"یہ کیا مہرو تم نے اپنی بھابھی سے بدتمیزی کی؟" وہ بلا تمہید کے مہرو پر چڑھ دوڑے۔

مہرو ہکا بکا انہیں دیکھنے لگی۔ اچانک افتاد پر گھبرائی مگر فوراً معاملہ سمجھ میں آنے پر سنبھل گئی۔

"کون سی بدتمیزی" وہ بھی ڈھٹائی سے بولی

"تم نے اس سے اونچی آواز میں بات کی اور ساتھ ہی طعنہ دیا کہ کوئی کام نہیں کرتی اور بیچاری سے سارا کام کرایا۔" وہ غصے (جو کہ بیوی نے شوہر کی زبان پر چڑھا کر بھیجا تھا) میں بولے۔

مہرو بھابھی کی چالاکی پر عش عش کر اٹھی۔

"میں نے کچھ نہیں کیا سمجھے آپ...... مجھے کوئی شوق نہیں ان سے بدتمیزی کرنے کا' آپ کی مہارانی صاحبہ سے" وہ زور دے کر بولی" جو سارا دن آرام فرماتی ہیں اور ہمیں اپنی رعایا گردانتی ہیں انہیں آج تھوڑا کام کرنا پڑ گیا تو ہنگامہ کھڑا کر دیا انہوں نے۔"

مہرو کا غصہ بھائی کے رویے اور اپنی بیوی کی باتوں میں آ کر اس پر چڑھ دوڑنے سے دوچند ہو گیا

"آج آپ کی بیوی صاحبہ نے کھانا بنایا ہے صرف ......" وہ پھر زور دے کر بولی "اور باقی سارا کام میں نے کیا ہے۔" وہ اونچی آواز میں بولی۔ ضبط کا دامن آہستہ آہستہ سرک رہا تھا اس کا۔

نصیر بھی کھانا لے آیا۔ وہ پریشان ہو گیا سامنے منظر دیکھ کر۔

"ہاتھ جل گیا ہے اس کا...... اتنی تکلیف میں ہے وہ" بھائی کا لہجہ نرم پڑا۔

"اوہ...... تو یہ مسئلہ ہے۔"

"نصیر تم ذرا بھابی جان کو بلانا تو...... ہم بھی دیکھیں کتنی کے بانہیں جلا بیٹھی ہیں وہ" مہرو نے آنکھوں کے اشارے سے حکم دیا۔

امی بھی نماز پڑھ کر آ گئیں۔ "کس بات پر بحث ہو رہی ہے یہ۔" وہ پریشانی سے بولیں۔

"کچھ نہیں امی آج آپ کی چہیتی بہو پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے ہیں ان سے سارے گھر کا کام لیا گیا ہے انہیں جلایا گیا ہے۔" مہرو نے بھائی کو دیکھ کر کہا۔

وہ بھی زمانہ شناس عورت تھیں فوراً اپنے زن مرید بیٹے کو دیکھ کر سمجھ گئیں کہ بیوی کی زبان بول رہا ہے لہٰذا خاموشی سے بیٹھ گئیں۔

بھابھی بھی آ گئیں...... آنکھوں سے صاف لگ رہا تھا کہ کتنے مگرمچھ کے آنسو بہائے گئے ہیں۔

"بھابھی جان ذرا ہمیں بھی تو دکھائیں نا کتنا ہاتھ جلا ہے آپ کو جو آپ تکلیف سے تڑپ رہی ہیں اور بے سدھ ہوئے جا رہی ہیں کہ آپ کے شوہر ہماری کلاس لینے آ گئے ہیں یا پھر بھیجے گئے ہیں۔" مہرو نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

بھابھی نے بھی ہاتھ آگے کر دیا۔ مہرو کو بہت ڈھونڈنے پر بھی کچھ نہ ملا۔

"کہاں ہے وہ داغ عظیم بھابھی جان؟"

مہرو نے صریحاً مذاق بنایا۔ بادل نخواستہ بھابھی کو دوسرے ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے دکھانا پڑا......"

"اُفوہ یہ ہے وہ داغ عظیم مجھے لگا کہ کوئی دانہ نکلا تھا یہاں جواب جگہ بھر رہا ہے۔" وہ بھورے داغ کو دیکھ کر طنزاً بولی۔ ساتھ ہی بھابی کے کلیجے پر چھرا چل پڑا۔ مہرو ان کی توقع سے زیادہ ہوشیار تھی۔

"نصیر ذرا ٹرے لانا جو کچن میں رکھی ہے اب بھائی جان کو وہ قیمت بھی دکھائیں جو اس داغ نے چکائی ہے۔ کیوں امی جان؟" وہ اپنا رخ ماں کی طرف کر کے بولی۔

نصیر زیر لب ہنسا "کیوں نہیں؟"

جبکہ بھائی بھونڈے بنے کھڑے تھے انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا جبکہ بھابی کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا ان کی بچھی بچھائی بساط مہرو الٹنے والی تھی جتنی معصوم وہ لگتی تھیں اتنی وہ نہیں یہ بات مہرو بخوبی سمجھ گئی تھی لہٰذا بڑے طریقے سے یہ معاملہ نبٹا رہی تھی۔

نصیر نے ٹرے بھائی کے آگے رکھ دی۔

"بھائی لیجیے کھائیے...... زندگی میں پہلی بار پیش خدمت ہے شوربے والی آلو میتھی اور جاپان کا نقشہ اور ایک شاید کوریا کا ہے۔ نصیر نے بھرپور انداز میں پیش کیا کھانا نتیجتاً بھائی شرمندہ ہو گئے اور بھابی الگ پریشان۔

"ہاں تو بنائی تو ہاں...... میں نے اتنی محنت سے" وہ رونے کو تیار تھیں۔

"دیکھیں شہیر اپنے گھر والوں کو انہیں میری ذرا برابر بھی جو قدر ہو کیسے طعنے دیتے ہیں مجھے۔" وہ باقاعدہ رونے لگیں۔

"لو جی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔" مہرو نے افسردگی سے گردن ہلائی۔

اپنی نازک اندام بیوی کا ایک ایک آنسو ایک ایک من کا ہو کر انہیں اپنے دل پر گرتا ہوا محسوس ہوا۔

"بس بہت ہو گیا جیسا بھی بنایا اس بیچاری نے بنایا تو نا...... آپ سب کے لیے اگر میری بیوی کی محنت پر اسے یونہی رلانا ہے تو مجھے لگتا ہے مجھے الگ ہو جانا چاہیے" وہ اٹھتے ہوئے بولے اتنی بڑی بات کی توقع کسی کو نہیں تھی وہاں موجود لوگوں میں سے۔

مہرو نے ماں کو دیکھا۔

انہوں نے گہرا سانس لیا یہ تو ہونا ہی تھا...... ان کے چہرے پر اطمینان تھا۔

"بیٹے نیکی اور پوچھ پوچھ...... بسم اللہ کرو۔" وہ کہہ کر اٹھ گئیں۔

شازیہ فاتحانہ مسکرائی جبکہ مہرو کے چہرے پر

افسردگی تھی۔

گھر کا بٹوارہ آخر کو ہو گیا...... مہرو نے زیر لب کہا۔

شازیہ اب خود کو آزاد محسوس کر رہی تھی آرام سے جب دل کرتا اٹھتی اپنے لیے جو دل کرتا بناتی اور سب جھنجھٹوں سے آزاد محسوس کر رہی تھی۔ مگر فطرت تو نہیں بدلتی نا...... وہ تو انسان کو اپنی راہ سے ہٹنے نہیں دیتی اور وہ چونکہ فطرتاً نکھٹو کام چور اور پھوہڑ تھی لہٰذا کچن بھی ویسا ہی تھا۔

کئی کئی دن اس کی صفائی نہیں ہوتی تھی جو چیز جہاں ہو وہ وہیں ہوتی کئی کئی دن...... صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کسی کا گزر نہیں ہے جبکہ مہرو نے پورے طریقے سے سب سیٹ کر لیا تھا۔

وہ اپنی جاب سے آ کر فریج میں موجود کٹی ہوئی سبزی وغیرہ کو بنا دیتی جو امی دھو کر کاٹ کر رکھ دیتی تھیں تا کہ اس کا کام بٹ جائے۔ کچن ہمیشہ صاف ستھرا ملتا تھا۔ جب مرضی چلے جاؤ اور مزے مزے کی خوشبوؤں سے سارا گھر مہکتا رہتا خصوصاً جب دونوں ماں بیٹی کچن میں ہوتے تھے۔

شازیہ کا دل بھی للچاتا کہ وہ بھی کھائے مگر بنائے کون لہٰذا وہ شہیر سے فرمائش کر کے باہر کی چیزیں خصوصاً بیکری کی چیزیں منگوا کر رکھ لیتی۔ جس کا نتیجہ اس کا تیزی سے بڑھتا ہوا وزن تھا۔ کھانا اور آرام کرنا یہ دو ہی اس کے شوق تھے جو اب پورے ہو رہے تھے۔

☆......☆

مہرو آفس سے گھر آئی تو گھر میں شور شرابہ تھا
''امی کون آیا ہے......؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''بیٹا تمہاری بھابی کے عزیز آئے ہیں سیالکوٹ سے ملنے ان کے بچے کھیل رہے ہیں باہر''

''اچھا......'' وہ بیگ اور عبایا لٹکا کر بولی۔

''تم بھی دعا سلام کر لو۔'' وہ کہہ کر نماز پڑھنے کو اٹھیں۔

مہرو فریش ہو کر بھابی کے کمرے میں گئی شاید یہ دوسری بار تھا جب وہ ان کے روم میں آئی تھی شادی کے بعد...... پہلی بار اسے خود کو یاد نہیں تھا کہ کب آئی تھی۔

اس نے سلام کیا۔ جواباً وہاں موجود بھابی کی خالہ ان کی دو بیٹیاں اور ان کے بچے پھر ان کی دو بہنیں ان کے بچے سب نے جواب دیا۔ وہ حال چال پوچھ کر اٹھ گئی۔

''بیٹی میں تو تمہیں الگ ہونے پر مبارکباد دینے آئی ہوں خصوصاً'' خالہ ٹانگیں بستر پر پھیلا کر بولیں۔

''بس خالہ اللہ کا کرم ہے کہ سارے ٹبر سے جان چھوٹی۔'' وہ بوتلیں سرو کرتی ہوئی بولی۔

''بس اب اپنے ہاتھ کا کھانا کھلا دو بھوک لگی ہے صبح سے نکلے ہوئے ہیں ہم۔'' بھابی کی کزن صائمہ نے جو سدا کی بھوکی تھی کہا تو شازیہ کے ہاتھ سے ٹرے گرتے گرتے بچی۔

''اتنے لوگوں کا کھانا...... اف توبہ کیسے کروں گی'' وہ ڈگمگا گئی۔

''سنبھل کر شازیہ ابھی گرتیں......'' بہن ثمن نے کہا۔

''گرے گی ہی یہ موٹی جو اتنی ہو گئی ہے۔ اللہ توبہ نو ماہ میں تم نے کتنا وزن بڑھا لیا ہے۔'' کزن نسرین ہنسی۔

''بس ایسے ہی......'' وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

کچن میں جانے لگی تو خالہ نے کہا میرے لیے تو روٹیاں ہی ڈال دینا مجھے چاولوں سے پرہیز ہے''
''جی......'' وہ بمشکل بول پائی۔

کچن میں آ کر اس نے شہیر کو فون ملایا تو اس نے کہا کہ آج آفس سے بالکل نہیں نکل سکتا بڑے باس انسپکشن پر آئے ہوئے ہیں۔'' ساتھ ہی کھٹاک سے فون بند کر دیا۔

مہرو کچن میں کھڑی سالن بنا رہی تھی اسے اندازہ تھا کہ بھابی کا کیا حال ہو گا مہمانوں کو کھانا دینے کے لیے انہیں بھی عقل آ جائے گی۔ وہ مزے لے رہی تھی ساتھ ہی گنگنا بھی رہی تھی۔

نصیر اور منیر کے آنے کا وقت بھی نہیں تھا ورنہ ان سے کچھ منگوا لیتی۔ چاروناچار اب خود ہی کچھ کرنا تھا فریج کھولا تو وہ خالی منہ چڑا رہا تھا۔ پہلے چکن فریزر سے نکالا اور پانی میں رکھا پھر چاول بھگوئے ایک تو خالہ کو بھی روٹی ہی کھانی ہے۔ پیٹو چٹوری...... سب جانتی ہوں اسے جو پرہیز چل رہا ہے اس کا ...... وہ بڑبڑائی۔

وہ کنستر سے آٹا نکالنے لگی تو اس میں سسری لگ گئی تھی۔ تین ماہ سے آٹا پڑا تھا مگر اس نے ایک بار بھی روٹی نہیں بنائی تھی۔ ناشتے میں ڈبل روٹی۔ کھا لیتی اور رات کا کھانا اکثر باہر کھاتی یا پھر بازار سے ہی روٹی منگوا لیتی۔ جیسے تیسے کر کے کھانا بنانا شروع کیا۔

مہرو فارغ ہو کر کمرے کی طرف جاتے ہوئے بھابی کی طرف دیکھ کر مسکرائی ''بھئی آج تو انتہا کی گرمی ہے اوپر سے نازک بندوں کو کھانا پکانا پڑ گیا۔ اف'' وہ کہہ کر چلتی بنی اور اس کا کلیجہ مزید جلنے لگا۔ اس نے بڑے قرینے سے کھانا لگایا۔ جیسے ہی پہلا نوالہ خالہ نے کھایا تو تھوک دیا۔

''یہ کیا بنایا ہے تو نے سالن میں زہر جتنا نمک توبہ...... وہ کہاں کسی کا لحاظ رکھتی تھیں۔ شازیہ نے آس پاس دیکھا کہ ساس یا مہرو تو نہیں مگر شومئی قسمت کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور سامنے ہی دونوں چارپائی پر بیٹھی مزے سے شلجم گوشت کے ساتھ چاول تناول فرما رہی تھیں اب خدا جانے یہ کھانا مزے کا تھا یا شازیہ کی بے عزتی زیادہ مزہ دے رہی تھی مگر دونوں کے چہروں پر بلا کا اطمینان تھا...... اور چونکہ بے عزتی اس کے اپنے ہی کر رہے تھے تو شازیہ بولنے کی اور دھال ڈالنے کی مجاز بھی نہ ٹھہری۔ لہٰذا چپ کر کے سنتی گئی۔

''اور یہ روٹی دیکھو...... حد ہوتی ہے پھوہڑ پن کی۔'' انہوں نے روٹی واپس رکھ دی...... اپنی طرف سے اس نے روٹی اچھی گول بنائی تھی مگر موٹی اور کچی رہ گئی تھی۔

''مما مجھے یہ چاول نہیں کھانے کچے ہیں اور مما یہ لیگ پیس کی بوٹی نہیں ٹوٹ رہی مجھ سے۔'' سارہ اور عمرا پنی اپنی ماؤں کو اپنی پلیٹیں تھما کر بولے۔

''اللہ جانے کیسا بدھو بندہ ملا ہے اسے جواب تک برداشت کر رہا ہے ہمارے والے تو پلیٹ منہ پر مار دیتے ہیں۔'' صائمہ نے ثمن کے کان میں تقریباً گھس کر کہا۔

''ٹھیک کہتی ہو یہ نہیں بدلی ہڈ حرام اور پھوہڑ کی پھوہڑ ہی رہی۔'' ثمن نے بھی دکھ سے کہا۔

''چلو بچو...... ہم واپسی پر برگر وغیرہ لے لیں گے'' نسرین نے بچوں کو بہلایا۔

''معاف کرنا شازیہ بس بچے ذرا ایسا کھاتے نہیں اسی لیے'' وہ شرمندہ سی بولی۔

''ارے رہنے دو بی بی ایسا کوئی بھی نہیں کھاتا'' خالہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا

شازیہ ڈھیروں شرم کے باعث کچھ نہ بول سکی اور وہ لوگ رخصت ہو گئے۔

مہرو کو اس کی توقع نہیں تھی مگر یہ بھی سچ تھا کہ جب تک انسان ٹھوکر نہ کھائے کچھ سیکھنے کو تیار نہیں ہوتا بلکہ آرام طلبی کی لت میں پڑا رہتا ہے۔

مہرو نے سچے دل سے بھابی کے سنبھلنے کی دعا کی اور واپس کچن میں برتن رکھنے چل دی۔

☆☆

مکمل ناول

ہاجرہ ریحان

دیوار کا پھول

وہ کمزور تھی، سہمی ہوئی تھی مگر ایک مکمل عورت تھی...... یہ بات مضبوط اور طاقت ور مرد کو ذرا دیر سے سمجھ آئی......

کچھ لوگ اپنی حساس طبیعت... خاموش مزاجی اور تنہائی پسندی کے باعث محفل میں الگ تھلگ بلکہ چھپے ہوئے سے رہتے ہیں... یہ اس قدر شرمیلے ہوتے ہیں کہ کہیں اگر اندازہ کرلیں کہ ان کی بات کو سُنا... ان سُنا کر دیا جائے گا... وہاں یہ زبان ہی نہیں کھولتے... ان سے بات کرنے کے لئے ایک خاص قسم کا ماحول بنانا پڑتا ہے... یہ اپنی کسی خواہش کا برملا اظہار کر سکتے ہیں اور نہ ہی یہ سمجھ پاتے ہیں کہ سامنے والا ان سے کیا چاہ رہا ہے... جس کی وجہ سے ان کے دوست بہت گنے چُنے ہوتے ہیں... یہ بظاہر بہت خاموشی سے دستبردار ہو جانے والے لوگ ہیں. ..حقیقت میں دوست... محبوب یا پھر... معشوق سب کا زندگی بھر بہت دل جمعی اور تحمل مزاجی سے انتظار کر سکتے ہیں... ان کو دنیا اکثر ناکام... ناکارہ... نااہل کہہ کر سائیڈ پر لگا دیتی ہے مگر اپنے مطلب کے لئے ان سے بڑے دھڑلے سے رجوع بھی کر سکتی ہے... کیونکہ ان کو شکایت بھی کرنا نہیں آتی... یہ بدلہ نہیں لے سکتے... یہ کسی کو نہیں ٹوکتے... کسی کی راہ نہیں روکتے... اور اگر کبھی غلطی سے ایسا کر بھی بیٹھیں تو احساس ہوتے ہی خود کو راستہ سے ہٹا کر... دوسرے کو آگے نکل جانے کی راہ دے سکتے ہیں... تو اکثر یہ دوڑ میں بھاگتے دوڑتے... ایک دوسرے کو ٹکر مارتے ہوؤں سے بچنے کے لئے ایسا راستہ بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں جس میں کوئی بھی ان کے مقابلے پر نہیں آتا... اور یہ ساری زندگی تنہا... خاموش... اداس رہ کر گزارا کر لیتے ہیں... ان کے دل گہرے پانیوں کی مانند ہوتے ہیں جو بظاہر بڑے کثیف... بارعب... منجمد لگتے ہیں مگر ان کی اندھی... اندھیری... ان دیکھی گہرائیوں میں چاہ کر بھی اُترا نہیں جا سکتا... یہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے دل کی گہرائی میں اُترنے والا ڈوب نہ جائے اس لئے بھی یہ کنارہ کئے... الگ تھلگ رہتے ہیں... یہ سارے Wall Flower یعنی دیوار کا پھول کہلاتے ہیں... ہمیں ہر جگہ یہ دیوار کے پھول نظر آتے ہیں جو ہماری نظروں میں ایک لمحہ بھی ٹھہر نہیں پاتے... ہم ان کو نظر انداز کر کے آگے

بڑھتے جاتے ہیں... حالانکہ یہ وال فلاور بہت انسان دوست لوگ ہوتے ہیں... ان کے دل میں صرف محبت ہوتی ہے... یہ لوگوں کو معاف کرنا جانتے ہیں.. صبر کر سکتے ہیں اور رشتوں میں دوسروں کو آسانی دیتے ہیں... یہ چُپ رو کر ساتھ نبھانے والے لوگ.. اکثر ہی گنوا دیئے جاتے ہیں... کیونکہ یہ خود کو بیچنا نہیں جانتے... یہ اپنے دام پہلے سے طے نہیں کرتے... اور نہ ہی ضرورت کو دیکھتے ہوئے دام میں اضافہ کرتے ہیں... یہ اپنی تعریف کے پُل باندھ کر خریدار کو متوجہ نہیں کرتے... بس ایسے ہوتے ہیں یہ وال فلاور... دیوار کے پھول!

☆......☆

آٹھ سال سے کم عمر بچوں کو لانے کی اجازت تو نہیں تھی مگر میں نے ہسپتال وارڈن سے مل کر صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس قدم کو مریضہ کے لئے خوش آئند سمجھ کر فیصلہ میرے حق میں ہی کر دیا گیا... ویسے تو ابھی تک تیمور یا سدرہ کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی تھی شاید وہ دونوں مجھ سے ناراضگی کا اظہار اس طرح کر رہے تھے مگر مٹھو کسی بھی طرح سے سنبھلتا نہیں تھا... اور جب اُس نے کل دوپہر سے کھانا بھی چھوڑ دیا تو مجھے جھکنا ہی پڑا... شاید اتنا تو وہ اپنی ماں کے لئے بھی نہیں مچلا... جب یہ خبر میں نے تینوں کو دی کہ کل میں اُن کو... اُس سے ملانے لے جاؤں گا تو تیمور اپنی ازلی اکڑ کو بھول کر مسکرا اُٹھا اور سدرہ چہکنے لگی... تینوں بچے کچھ ایسی تیاریوں میں لگ گئے کہ شاید رات بھر ہی جاگے رہے... جاگتا تو میں بھی رہا ہوں... شرمندگی... شرمساری یا بزدلی... کچھ بھی تھا... میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا تھا اور پوری رات یہی سوچتے گزار دی تھی کہ اب کیا... معافی تلافی کی کوئی گنجائش موجود رہی ہے... بڑی حیرت ہوتی ہے کہ کچھ لوگوں کے لئے تو ہم واپسی کا کوئی راستہ کبھی بھی کھلا نہیں چھوڑتے مگر خود اگر پلٹنا چاہیں تو بڑے دھڑلے سے اپنا منہ لے کر پہنچ جاتے ہیں وہ بھی اس یقین کے ساتھ کہ... جیسے سامنے والا تو بس ہمارے ہی انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھا ہوگا... اگر کبھی ہمیں شرمندگی ہو بھی جائے تو؟

ہم چاروں ہسپتال میں جنرل وارڈ میں داخل ہوئے تو وہ دور سے ہی مجھے نظر آ گئی... آخری سرے پہ اُس کا بستر تھا... لمبے سے وارڈ میں دونوں طرف بستر... کچھ بھرے ہوئے کچھ خالی تھے... مریضوں سے ملاقات کا وقت تھا... تیمار دار اور ملنے آنے والے اِدھر اُدھر آزادی سے چہل قدمی کر رہے تھے.. .کچھ ٹولیوں میں کھڑے آپس میں دھیمے دھیمے باتیں کر رہے تھے... وہ... تنہا سی بستر پر نیم دراز... چادر گردن تک اوڑھے... ہاتھوں کو پیٹ پر باندھے... وارڈ میں بکھرے چلتے پھرتے باتیں کرتے لوگوں سے منہ پھیرے دوسری جانب ادھ کھلی جنرل وارڈ کی واحد کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی... ایک ہاتھ میں کینولا لگا تھا جبکہ خالی ڈرپ کی بوتل ہینگر سے لٹکی ہوئی کھڑکی سے آتی ہلکی ہوا سے جھول رہی تھی... وہ ہمیں داخل ہوتا نہ دیکھ سکی... مٹھو کا ہاتھ میں نے سختی سے پکڑا ہوا تھا مگر جیسے ہی وہ واضح ہو کر مٹھو کو نظر آئی.

..'اماں' چلاتا مجھ سے ہاتھ چھڑاتا بھاگ کھڑا ہوا... اُس کو مٹھو کی آواز آئی تو اُس نے گڑبڑا کر اس طرف نظر کی... مٹھو اُس وقت تک اُس کے بہت پاس پہنچ چکا تھا اور پھر لمحوں میں مٹھو چھلانگ لگا کر بستر پر چڑھ کر اُس کے گلے سے لپٹ گیا تھا... وارڈ میں موجود مریضوں کے ساتھ ساتھ دوسرے چہروں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی... جیسے وہ سب بھی گو کہ اُس سے انجان تھے مگر اندر سے اُس کی اداس تنہائی میں برابر کے شریک تھے... اور اب مٹھو کو اُس کے گلے سے چمٹے دیکھ کر جیسے سب سکھ کا سانس بحال کر رہے تھے.

.. چند قدم رہ جانے پر سدرہ بھی بھاگ کھڑی ہوئی اور اب مٹھو کے اوپر سدرہ بھی اُس کے سینے سے چمٹی کھڑی تھی... وہ دیوانہ وار کبھی مٹھو تو کبھی سدرہ کو چوم رہی تھی... اُس کی آنکھیں بند تھیں مگر آنسو بہتے نکلتے چلے جا رہے تھے... میں اور تیمور قریب پہنچ کر بستر کی دوسری جانب کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے... میں متوجہ نظروں سے شرمندگی محسوس کر رہا تھا... یہ کیا فلموں والا سین چل رہا ہے... ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ سب برسوں سے جدا ہیں... ابھی کوئی ایک ہفتہ ہی تو ہوا ہوگا ان لوگوں کو جدا ہوئے... مجھے تیمور کا رویہ ٹھیک لگا... ہاں ٹھیک ہے ناں ہم ملنے آ گئے... حال احوال لے لیں گے اب یہ کیا کے بچوں کی طرح چمٹنے لگیں... رونے لگیں... میں نے دل ہی دل میں تیمور کی ازلی اکڑ پر پہلی بار شاباشی دی... آخر کو میرا بیٹا بڑا ہو گیا ہے... جذبات نہیں عقل سے کام لیتا ہے...

اُس نے آنکھیں کھولیں... ہمیں ڈھونڈا... مٹھو اور سدرہ کی بانہوں میں جکڑے سر کو بڑی مشکل سے گھما کر ہماری طرف دیکھا... اور پھر ہلکی ہی افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کپکپاتا ایک ہاتھ تیمور کی طرف بڑھا دیا... تیمور نے بڑی متانت سے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے پہلے تو ہلکے سے اُس کی انگلیوں کو چھوا... پھر جب نقاہت سے اُس کا ہاتھ گرنے کو تھا تو تیمور نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اُس کا ہاتھ مصافحے کے انداز میں پکڑ لیا تھا اور پھر... اور پھر جیسے مقناطیس سے لوہا ہلکے ہلکے ہچکولے کھاتا چمٹ جاتا ہے تیمور بھی اُن تینوں سے چمٹ چکا تھا... میں دنگ رہ گیا...!

☆......☆

میں اب تک اپنے بچوں کی اُس کے لئے محبت کو ناپ نہیں سکا تھا... سوتیلی ماں... وہ بھی صرف ایک ڈیڑھ سال پرانی... اُس سے میرے بچوں کو کس قدر اُنسیت ہو سکتی ہے؟

ہم جیسے مردوں کا المیہ یہی ہے کہ ہمیں نہ تو اپنی زبان پر بروقت قابو کرنا آتا ہے اور نہ اپنی زبان کے غلط استعمال پر معافی ہی مانگ سکتے ہیں... وہ بھی ایک عورت سے... ناممکن!

گو کہ بات کچھ اتنی بڑی بھی نہیں تھی... رشتوں میں غلط فہمیاں تو ہوتی ہی ہیں... مسئلہ صرف یہ ہے کہ قصور میرا تھا... مجھے ہی معافی بھی مانگنی چاہیئے مگر... میں معافی مانگتا کیا اچھا لگوں گا؟

اور ہم جو سر اُٹھا کر چلتے ہیں... لوگوں کے سامنے سینہ تان کر رکھتے ہیں کہ ہم نے آج تک خداوند کے سوا کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا... خداوند کے سوا کسی سے مدد نہیں لی... خود کو فخر سے سیلف میڈ کہتے ہیں تو سیلف میڈ شخص جس قدر بھی چاہے مغرور ہو جائے... لوگوں کو جدوجہد کی کہانیاں سُنا سُنا کر اپنی بڑائی جتاتا جائے... یا پھر نخوت سے صرف چند مخصوص لوگوں سے راہ و رسم بڑھائے... کچھ بھی کرے مگر اُسے بدزبان نہیں ہونا چاہیئے... کچھ بھی ہو... انسان کی کامیابی یہی ہے کہ وہ اپنی زبان پر قابو رکھنا سیکھ لے... مجھے قدرت نے اچھا سبق دیا... اس سے پہلے قدرت نے میرے کردار.. .وقار اور انا پر کئی بار وار کیا تھا... میں جانتا تھا کہ یہ سب ہوگا... مجھے ایک عام آدمی کی طرح گر پڑ کر زندگی نہیں گزارنی... مجھے سینہ تان کر... سر اُٹھا کر جینا ہے تو ہمت سے برداشت کرنا ہے... اور جب قدرت مجھ سے امتحان لیتے تھک گئی تو اچانک جیسے میں غوطہ کھا کر پرسکون اور خاموش سطح پر اُبھر آیا... اور اپنی دُھن میں مزے لے کر تیرنے لگا... یہ سمندر میرا ہے... میں نے ہی اسے فتح کیا ہے... یہ ابھی چند لمحوں پہلے مجھے ڈبونے کو تھا... میں نے ہمت سے

مقابلہ کیا اور اب اس کی لگام میرے ہاتھ میں ہے... مگر یہ کیا ہوا... ابھی لگام ہاتھ آئی ہی تھی کہ... میرے دل پر وار ہو گیا... اور پہلی بار زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے دل کے دھڑکنے کی آوازیں محسوس ہونے لگیں. ..اوہ... تو میں بھی ایک جیتا جاگتا... سانس لیتا انسان ہوں... میں حیران ہو گیا... مجھے شدت سے احساس ہوا کہ اگر وہ میری زندگی میں نہ آتی تو میں اسی طرح بغیر دل کے زندگی گزار دیتا... سیلف میڈ مگر ہارٹ لیس...

تو میں آخرکار یہ مانتا ہوں کہ اُس نے میری ذات کو کاملیت بخشی ہے... میں اُس کے بغیر بہت اچھا تھا مگر پھر بھی ادھورا تھا اُس نے مجھے اپنی زبان.. اپنے بے جا اکڑ ہونے... بلاوجہ کا غصہ کرنے کی عادت پر نظرثانی کرنے پر مجبور کر دیا ہے... بلکہ اُس نے مجھے اعتبار کرنا سکھایا ہے... کبھی کبھی ہمارا کسی پر اعتبار کرنا ہمارے اپنے لئے ہی ضروری ہوتا ہے... انسان اتنے بُرے بھی نہیں کہ ہر دم بس دھوکا ہی دیتے جائیں... اور میں مانتا ہوں کے وہ محض ایک عورت ہو کر میرے لئے... میرے گھر... میرے بچوں کے لئے بہت اہم بلکہ بہت ضروری ہو گئی ہے...!

☆...☆

جبکہ آج سے صرف دو تین دن پہلے تک میں اُس کی محبت کو اُس کا دکھاوا سمجھنے پر تلا بیٹھا تھا.. کیا مشکل ہے میرے آفس سے آنے سے چند لمحوں پہلے... مٹھو اور سدرہ کو پڑھائی کے لئے میز پر بٹھا دینا ...تیمور کے ہاتھ سے موبائل فون لے کر اُن پر نگران بنا کر خود باورچی خانے میں جا کر میرے اور بچوں کے لئے شام کی چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ بنا لینا... اکثر ہی مجھے دفتر فون کر کے بتاتا کہ وہ بچوں کو لے کر اُن کے اسکول کے لئے یا پھر کوئی گھر پر اُن کے استعمال کا سامان لینے جا رہی ہے... ایسا بھی ہوتا کہ

کبھی رات میں لاؤنج میں ٹی وی پر خبریں دیکھتے میں بچوں کے کمرے سے آتی مٹھو کی اُس کے ساتھ خوش گپیوں کی آواز پر کان دھرتا... کبھی کسی محفل میں سدرہ کے کپڑوں کی تعریف پر... سدرہ کو فخریہ اُس کے بارے میں بات کرتا سُنتا... پھر تیمور بھی تو کافی بدل گیا تھا... گو ابھی بھی تھوڑا اکڑ اکڑ کر بات کرتا تھا مگر اُس کے اندر جو مٹھو اور سدرہ پر ہاتھ اُٹھانے کی عادت تھی وہ یکسر ختم ہو گئی تھی بلکہ اب تو وہ طعنے اور تشنے کی زبان ہی بھول چکا تھا...

ایک زمانہ تھا.. سکینہ کے انتقال کے یہی کوئی ایک سال میں ہی تینوں بچوں نے جس طرح کی عادتیں اپنانی شروع کر دیں تھیں مجھے وہم ہونے لگا تھا کہ بہت جلد میں گھر میں ان تینوں کو چھوڑ کر خود شفٹ کر کے کسی ہوٹل میں جا کر رہنے لگوں گا... مٹھو ہر وقت روتا رہتا تھا... ضد کرتا زمین پر لیٹ لیٹ جاتا... اُس کے ساتھ کہیں بھی جانا ناممکن ہو گیا تھا... وہ ہر جگہ پہنچ کر بے عزتی کروانے سے باز نہ آتا... سدرہ اتنی گندی رہنے لگی تھی کہ کھچڑی بال اور بدبودار کپڑوں میں ہی ہر جگہ پہنچ جاتی اور تیمور... ہر وقت فون ہاتھ میں پکڑے... پوچھے بنا ہر کسی کی تصاویر اُتارتا رہتا... مووی بناتا رہتا... کوئی منع کر دیتا تو کچھ اس قدر بدتمیزی سے پیش آتا کہ اکثر لوگوں نے مجھ سے باقاعدہ کہہ کر ملنا بند کر دیا تھا کہ جب تک میں اپنے بچوں کو تمیز نہیں سکھا لوں اُن کے گھر نہ آؤں اور نہ ہی اُن کے آنے کی کوئی اُمید ہی رکھوں... گو کہ آپا تو سکینہ کے انتقال سے جو میرے گھر دوسرے شہر سے آ کر رُکی تھیں تو اب تک میرے ساتھ تھیں.. مگر یہ بچے اُن کو بھی خوب ستاتے... سدرہ کچھ اس طرح آپا کی ہدایات کو نظرانداز کرتی کہ آپا مجھے آفس میں ہی دس بار فون کر دیتیں... تیمور... اکڑا رہتا... آپا کے ساتھ زبان چلاتا اور آپا کے ڈانٹنے پر جب بہت

غصے میں آتا تو جا کر دھڑا دھڑ سدرہ اور مٹھو کو مارنا شروع کر دیتا... دونوں مار کھا کر جب چیختے چلاتے تو آپا کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے... مٹھو کے پاس رونے کا ہتھیار تھا جو وہ گاہے بگاہے استعمال کرتا کچھ اس قدر اونچی آواز میں روتا کہ آپا اُس کو اُس کے حال پر چھوڑ چھاڑ بھاگ کھڑی ہوتیں...

میں تھکا ہارا گھر پہنچتا تو آپا اپنی روداد سُناتیں... اکثر روہانسی ہو جاتیں کہ وہ تو بچوں کو کس قدر چاہتی ہیں کہ اپنا گھر چھوڑ کر اُن کی خاطر یہاں بیٹھی ہیں مگر یہ بچے اُن کی قدر نہیں کرتے... آخرکار میں بچوں کو بلا کر ڈانٹ پلاتا... کبھی تو بچے طنزیہ مسکراتے اور کبھی مجھ پر برس پڑتے... آپا سے اُن تینوں کو تو جیسے دشمنی سی تھی... اُن کے الزامات کی ایک لمبی فہرست تھی کچھ یہی کہ آپا اُن پر بلاوجہ سختی کرتی ہیں... ماں اور باپ کی گالیاں دیتی ہیں... ہاتھ اُٹھاتی ہیں... مٹھو کو مارتی ہیں سدرہ کو بالوں سے کھینچتی ہیں... تیمور کو کچھ کر نہیں سکتیں تو اُسے عجیب عجیب سے لقب سے پکارتی ہیں... اس کے علاوہ وہ کھانے میں ان لوگوں کو کئی کئی گھنٹے بھوکا رکھتی ہیں... پانی پر بھی پہرہ بٹھا کر رکھتی ہیں... نہ ٹی وی دیکھ سکیں نہ ہی کمرے میں سو سکیں... اور نہ ہی اسکول سے آ کر واش روم جا سکیں... روزانہ ہی وہ کوئی نئی شکایت لئے میرے سامنے حاضر ہو جاتے... مجھے آپا نے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ بچوں کو کوئی جیب خرچ نہ دوں اُن کا خیال تھا کہ تینوں کو چوری کی عادت پڑی ہوئی ہے اور اکثر ہی آپا مجھے دکھ سے بتاتیں کہ سدرہ یا تیمور نے اُن کے پرس سے پورے ہفتے کے خرچ کے پیسے اُڑا لئے ہیں... میں بچوں کو بلا کر ڈانٹتا تو وہ اُلٹا آپا پر الزام لگا دیتے کہ آپا یہ سارے پیسے اپنے بچوں کو منی آرڈر کر آئیں ہیں... شکایتوں کی فہرست دونوں طرف شیطان کی آنت بن جاتی... میں گھبرا جاتا اور

جان چھڑا کر کمرے میں جا کر جیسے تیسے سو جاتا... مگر سونا بھی کہاں نصیب ہوتا رات بھر مٹھو کچھ اس قدر زار و قطار روتا کے سدرہ اُسے میرے پاس چھوڑ جاتی ...وہ شاید دن بھر نیند پوری کر چکا ہوتا کہ خوب تنگ کرتا... کبھی پانی پیوں گا... کبھی کچھ کھاؤں گا... ایسا لگتا کہ جیسے رات نہیں دن اُس کا ابھی شروع ہوا ہے... آپا کو بھی کچھ کہتے شرم آتی کہ وہ بچاری دن بھر کی تھکی اب رات کو بھی بچے کو دیکھیں... اور سب سے بڑی گھمسان کی جنگ تو کھانے کی میز پر ہوتی جب آپا مسلسل بچوں کو بہت بہت کھانے پر ٹوکتیں... مجھے بھی یہی لگتا کہ جیسے بچے پورے دن کا کھانا بس ایک اُسی وقت کھا لیں گے... سمجھ نہیں آتا تھا کہ کس کا ساتھ دوں کہ آپا کی بات پر ہامی بھرتا تو بچے شور ہنگامہ مچا دیتے اگر بچوں کی سُن لیتا تو آپا روتی ہوئی کھانے کی میز سے ہی اُٹھ جاتیں... لہذا میں نے کسی کا بھی ساتھ نہ دینے کی قسم کھالی تھی... سب کی شکائتیں سُنتا تو تھا مگر کچھ بھی کرنے کی جُرات نہ پاتا.. .ایک ڈیڑھ سال میں ہی میری زندگی بھر کی محنت سے جمایا ہوا کاروبار کا حرج ہونے لگا... میں نہ گھر پر دل لگا رہا تھا اور نہ ہی کاروبار میں دل لگ رہا تھا... مجھے اپنی ہی کہی ہوئی بات پر شرمندگی ہونے لگی... میں اب تک کتنی آسانی سے کہہ دیتا تھا بلکہ کئی جگہ شیخی بگھارتا تھا کہ میں سیلف میڈ ہوں یعنی میں نے اب تک جو کچھ بھی حاصل کیا ہے سب اپنے بل بوتے پر حاصل کیا ہے... میں نے اپنی زندگی... اپنی دنیا صرف اپنے بل بوتے پر بنائی ہے... کس قدر بودی بات ہے... نہ ہی میں اپنی زندگی بنا سکا ہوں اور نہ ہی کامیاب ہوں... زندگی میں مختلف مراحل کے ساتھ ساتھ اس کے مختلف زاویے بھی ہوتے ہیں... جیسے کوئی matrix... مختلف سانچے لئے زندگی کے صرف ایک حصے پر نظر رکھ کر باقی تمام سانچوں کو بھلا

دینا کوئی کامیابی نہیں... کاروبار پر لگے ہیں تو سارا دن ساری رات بس دفتر کے کام ہی کرتے چلے جا رہے ہیں... نہ کھانے کا ہوش... نہ رشتوں کی پرواہ... ایسے میں کاروبار میں ترقی تو ہونا ہی تھی... میں نے اس سے پہلے کبھی خود پر نظرِ ثانی کی ہوتی تو اندازہ ہوتا ناں کہ مجھے تو بچوں... گھر اور ہر قسم کے گھریلو معاملات کا کچھ معلوم ہی نہیں... وجہ وہی... کچھ بچپن سے دو بہنوں کا لاڈ پیار اور امی کی پُرانی سوچ کہ مردوں کو گھر سے باہر کے معاملات میں مصروف رہنا چاہیئے... گھر کے اندر کا کام صرف عورتوں کا ہے... یہ بھی کیا بات ہوئی بھلا؟

ایک زمانہ تھا کہ عورتوں کو تعلیم دلوانے پر گھر والے تیار نہ ہوتے مگر حکومت زور دیتی تھی کہ عورت کا پڑھا لکھا ہونا یوں ضروری ہے کہ کبھی کسی مجبوری میں دال روٹی کمانے کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑ جائے تو مشکل نہ ہو... ایسا کچھ مردوں کے لئے بھی سوچ لیا جاتا؟... کہ اگر کبھی اُن کو گھر چلانا پڑ جائے تو وہ کیا کیا گل کھلائیں گے؟... بلکہ ابھی بھی سوچ لیا جائے تو کیا حرج ہے کہ ایک مرد کو گھر کے اندر کے معاملات کی تعلیم دینا ضروری قرار پائے... جہاں لڑکیاں اسکول کالج میں آزادی سے پروفیشنل یعنی کہ پیشہ ور تعلیم حاصل کریں وہیں لڑکوں کو بھی ہوم اکنامکس یعنی گھریلو اقتصادیات پڑھائی جائیں... ایسے میں آپا نے جب مجھ سے کہا کہ اُن کے لحاظ سے مجھے دوسری شادی کر لینی چاہیئے... تو بھلا میں انکار کہاں کر سکتا تھا...!

☆......☆

سکینہ میری مرحوم بیوی ایک اچھی انسان تھی... میری کلاس فیلو بھی تھی مگر ہماری شادی بہت دنیاوی انداز میں دونوں کے والدین کی پسند سے ہوئی تھی... اُس وقت امی ابو حیات تھے... آپا کی شادی کو کوئی چار برس ہوئے تھے اور پانچویں برس ہم نے چھوٹی بہن کو بھی بیاہ دیا تھا... اُس کے بعد میرے اوپر شادی کر لینے کے حملے زور و شور سے ہونے لگے تھے... آخر کار مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے کہ امی ابو بہت بوڑھے ہو گئے تھے اور میں سارا دن گھر سے کاروبار کے سلسلے میں باہر رہتا تھا... میری چھوٹی بہن ایک رشتہ والی کے بتھانے پر سکینہ کے گھر گئی تھی اور پھر تصاویر کے تبادلے پر کھلا کہ سکینہ میری یونیورسٹی کلاس فیلو تھی... میں نے اُسے بہت سوچا مگر مجھے اپنی یادداشت میں کہیں نہیں ملی... خیر میں پڑھائی کے معاملے میں کافی سنجیدہ تھا اور کم ہی کلاس میں کسی سے راہ و رسم بڑھاتا تھا... مجھے بہت جلد بہت کچھ حاصل کرنا تھا اور میرے پاس اُس زمانے میں گھومنے پھرنے اور پیسہ خرچ کرنے کا وقت ہی کب تھا... لہٰذا وہ میرے لئے اجنبی ہی تھی... سکینہ میرے گھر آئی تو بس اتنا ہوا کہ میں اب اُس کو ساتھ دینے کے لئے اپنی مصروفیت سے کچھ وقت نکالنے پر مجبور ہو گیا... سکینہ مجھے کبھی تنگ نہیں کرتی تھی مگر امی ابو سے کہہ کر مجھ پر اپنی بات تھوپ دیا کرتی تھی... مجھے کبھی بُرا لگتا کبھی پی جاتا اور کبھی امی ابو کی بات کو بھی رد کر دیتا... یوں کرتے کرتے ہم نے چودہ سال گزار لئے ایک ایک کر کے امی اور ابو ہم سے جدا ہوئے تو... تیمور... دو سال بعد سدرہ اور پھر تقریباً چار سال بعد منٹو ہماری زندگی میں شامل ہوتے گئے... منٹو کی پیدائش پر ہی سکینہ کو پیٹ کی بیماریوں نے جکڑ لیا تھا... اُس کو ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی پیٹ کی تکلیف ہو جاتی... ہم نے اس کے علاج کے لئے ہر جگہ چکر کاٹے... بہت سے ڈاکٹروں سے ملے مگر بے سود... اور آخر کار وہ آنتوں کے انفکشن میں مبتلا دو سال تکلیف میں گزار کر اپنی جان ہار گئی... سکینہ کے ساتھ وقت بس گزر گیا مجھے اُس کا دکھ تو ہے

مگر مجھے اب تک لگتا تھا کہ میں اپنے آپ میں اس قدر مکمل ہوں کہ مجھے اپنی تکمیل کے لئے عورت جیسی نازک اور ناپائیدار شئے کی کوئی ضرورت نہیں... سکینہ کو بھی میں صرف اپنے بچوں کی ماں کے طور پر مان دیتا تھا... اُس کے جانے کے بعد بھی مجھے صرف اپنے بچوں کے لئے پریشانی ہوئی ورنہ میں خود میں مگن تھا... سکینہ کے انتقال کے وقت منٹو صرف ڈھائی سال کا تھا... اگر آپا ساتھ نہ دیتیں تو میں بھلا کس طرح منٹو کو پال سکتا تھا مگر پھر دو سال گزرتے گزرتے گھر کے حالات کچھ یوں بگڑ گئے کہ آپا نے بھی کھلم کھلا مجھے دوسری شادی کرنے کا کہنا شروع کر دیا تھا... آپا کے بچے اب یونیورسٹی کالج والے ہو گئے تھے مگر پھر بھی اُن کو بھی اپنا گھر یاد آتا تھا... پھر میرے تینوں بچوں نے وہ اودھم مچایا تھا کہ کوئی بھی اُن کی دن بھر کی ذمہ داری لینے پر بھی تیار نہ ہوتا تھا... اور ایک بار پھر تھک ہار کر میں نے شادی کر لینے کی ہامی بھر لی...!

☆......☆

اس بار آپا نے آگے بڑھ کر تلاش شروع کی... میں نے اُن کو سمجھا دیا تھا کہ مجھے ایک عمر کی سمجھدار عورت چاہیئے جو کہ میرے بچوں کو ڈھنگ سے سنبھالے... اپنے چونچلے نہ دکھائے... میں اپنے لئے نہیں بچوں کے لئے شادی کر رہا ہوں... مگر آپا جس طرح کی کم عمر لڑکیوں کی تصاویر میرے آگے رکھتیں میں جھنجلا جاتا... ایسا کرتے کرتے آخر کار آپا نے مجھے اُس کے کوائف بتائے... عمر میں کم ہے مگر... طلاق یافتہ ہے... شادی دو سال چلی... لڑکی اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے... باقی تمام بھائی بہن ملک سے باہر ہیں... ماں بہت بیمار ہیں اور چاہتی ہیں کہ جلد از جلد لڑکی کو اُس کے گھر کا کر دیں... کوئی ڈیمانڈ نہیں... بچوں والا... بوڑھا کوئی بھی... بس اپنا گھر رکھتا ہو... 'میری مانو یہ لڑکی بالکل ٹھیک رہے گی... شکل اور قد بھی مناسب ہے... مجھے تو یہی بہتر لگ رہی ہے... اب تو میں بھی ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی ہوں... دیکھو ناں اس کی ماں اس کو بلاوجہ نہیں جڑھائے گی اور پھر بار بار کوئی طلاق کا داغ تھوڑی لگوا سکتا ہے...'

آپا نے مجھے سمجھایا... ہم سب ایک دوسرے میں ہمیشہ داغ ڈھونڈتے رہتے ہیں... جب تک ہمیں کسی بھی انسان کے داغ دار ہونے کا ثبوت نہ مل جائے ہم اُس کو اپنے سے اونچا... ہاتھ نہ آنے والا... ماورائے رسائی خیال کر کے اپنے آپ کو تکلیف دیتے رہتے ہیں... ہم ایسے لوگوں کو زیادہ اطمینان سے قبول کر لیتے ہیں جو داغ دار ہوں کیونکہ ہمارے خیال میں داغ دار لوگوں کو کام میں لانا زیادہ آسان ہوتا ہے... کیونکہ داغ دار لوگوں کے سر پہلے سے ہی جھکے ہوتے ہیں... ان کو دنیا اس قدر ذلیل کر چکی ہوتی ہے کہ ان میں اکڑ... غصہ... ضد جیسی تمام عادتیں ناپید ہو چکی ہوتی ہیں... جیسے سدھائے ہوئے گھوڑے... جس کے ہاتھ میں بھی لگام دے دو اُسی کو خود پر سوار کر لیں گے... سوار کے پیروں کی ٹھوکر چاہے اُن کے جسموں میں نت نئے زخم ہی کیوں نہ ڈال دے... اُس کے اشارے پر تیز... ہلکے... ہر طرف دوڑتے پھریں گے... آپا نے بالکل ٹھیک سوچا... سدھایا ہوا... داغ دار ہی درکار تھا... میں نے بے دلی سے تصویر دیکھی اور ایک دو دن سوچ کر ہاں میں جواب دے کر جان چھڑا لی... آپا کو کہہ دیا کہ سختی سے ہدایات دلوا دیں کہ خاتون کو میرا گھر اور بچے بہت جانفشانی سے پالنے ہیں ورنہ... آپا نے مجھے دلاسہ دیا اور چند ایک ہفتوں میں ہی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں... بہت دنوں بعد میری چھوٹی بہن اپنے خاندان اور آپا کا خاندان ایک ساتھ ہوئے تھے تو گھر میں الگ ہی ہلچل محسوس

ہوئی... پرانے زمانے کا بنا ہوا ہمارا گھر ہنسی قہقہوں میں ڈوب گیا اور مجھے بھی کچھ ذہنی سکون ملا... تینوں بچے میری چھوٹی بہن سے کافی ہلے ہوئے تھے تو اُس کے ساتھ نے اُن کو بھی خوش کر دیا تھا...

ساس صاحبہ سیدھی سادھی سی خاتون تھیں... بیماری کے باعث اکثر ہی بہت سی باتیں کرنا بھول جاتیں اور بعد میں مجھے فون کر کے بتاتیں... ایک دن انہوں نے مجھے فون کر کے بتایا کے جو مہندی کی رسم کا کہا جا رہا ہے تو لڑکی کو پریشانی ہے... اُس کی دوسری شادی ہے اور ایسے میں اس قدر دھوم دھام اُسے اچھی نہیں لگ رہی... وہ صرف اتنا چاہتی ہے کہ ان رسموں کو اگر ضروری ہی انجام دینا ہے تو بس اپنے گھر تک محدود رکھیں... میں خوش دلی سے پیش آیا اور خود بھی اُن کی بات پر ہامی بھری اور اُن کو دلاسہ دے دیا کہ ایسا ہی کرنا چاہیے... گھر گیا تو دیکھا آپا کا موڈ بہت خراب تھا... پوچھنے پر معلوم چلا کہ اُن کو یہ بات بہت بُری لگی کہ مہندی اور مایوں کی رسم کو صرف گھر والوں تک محدود کرنے کی ہدایات دی گئی ہیں اور بات مجھ سے براہِ راست کر لی گئی کے انکار کی کوئی گنجائش نہ رہے... میں جان گیا تھا کہ آپا کو رسموں کو محدود کرنے سے زیادہ ایک داغ دار انسان کا اپنی پسند ناپسند پر آواز بلند کرنا بُرا لگ گیا تھا... بھلا ایک طلاق یافتہ بھی اس قسم کی کوئی ڈیمانڈ رکھ سکتی ہے؟ یعنی کیا ابھی تک اُس کا دماغ... اُس کی انا... شرم باقی ہے؟ میں نے آپا کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا اور دل میں ساس صاحبہ کے دھیمے مزاج کا قائل ہونے لگا...

مجھے بھی شادی میں بلاوجہ کے خرچے اور دھوم دھام سے کوفت ہو رہی تھی کہ میرے تو بچے بھی تھے اور وہ بھی اچھی خاصی بڑی عمر کے تھے...

نکاح دلہن کے گھر پر رکھا گیا تھا جبکہ رخصتی شام میں شادی ہال سے ہونا قرار پائی تھی لہٰذا ہم ظہر کی نماز پڑھ کر پہنچ گئے تھے... نکاح نامہ پر لڑکی کے دستخط اور قبولیت کے لئے مولوی صاحب اور دونوں وکیل جا چکے تھے... زیادہ تر خواتین بھی دوسرے کمرے میں لڑکی کے پاس جا چکی تھیں... باقی لوگوں میں کچھ میرے قریبی اور کچھ لڑکی کی رشتہ دار تھے کہ ایک صاحب جنہوں نے لڑکی کے ماموں کہہ کر تعارف کرایا تھا میرے پاس آ کر بیٹھ گئے... مجھ سے بچوں... سکینہ اور پھر کاروبار کی تمام معلومات لینے کے بعد گویا ہوئے...

'آپ کے بچے تو کافی چھوٹے ہیں... اُن کو تو ابھی ماں کی ضرورت ہے... اور آپ یہاں... میرا مطلب کہ...'

ماموں یہ کہتے خاموش ہو گئے تو میں تھوڑا اگڑ بڑا گیا اور جو ایسے لوگوں کا طریقہ ہے کہ پہلے کان میں پھونک کر وسوسے ڈالتے ہیں پھر یوں جتاتے ہیں کہ جیسے وہ تو بہت معصوم ہیں ہم ہی اُن سے کچھ نہ کچھ پوچھے جا رہے ہیں... میرے اصرار پر وہ پہلے تو مسمساتے رہے پھر گویا ہوئے...

'دیکھیں نا... بھانجی نے تو اپنا بچہ طلاق کے بعد شوہر کو ہی دے دیا اور خود آزادی حاصل کر لی تو بھلا دوسرے کے بچے کو کیا اہمیت دے گی؟ ایسا تھا تو اپنا ہی پال لیتی؟'

میں حیران رہ گیا اور میرا دل خراب ہونے لگا... یعنی ان لوگوں نے بہت کچھ چھپایا... میں اور کچھ پوچھتا کہ مولوی صاحب واپس آ گئے اور میں دل پہ پتھر لئے پوری شادی عجیب سی کشمکش میں مبتلا رہا... آپا سے بھی بات کرنے کا وقت نہیں ملا اور آخر کار شادی ہال سے دلہن میرے گھر آ گئی...

پہلے ہی میں اس قدر سج دھج کے ساتھ دلہا دلہن کے ملاپ پر جھنجلایا ہوا تھا کہ رہی سہی کسر اس انکشاف نے پوری کر دی تھی... میں کافی دیر باہر ہی

بہنوں اور اپنے بچوں میں بیٹھا رہا... بچوں کے سو جانے کے بعد کمرے میں نہ جانے کا جواز نہ رہا... میں بے دلی سے کمرے میں داخل ہوا... وہ بستر پر حسبِ روایات سجی بیٹھی تھی... شیروانی سے چھٹکارہ پا کر... میں بستر کی دوسری طرف رکھے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا... اور اُسے بغور دیکھنے لگا... وہ سر جھکائے کسی بت کی طرح بیٹھی تھی...

'میں نے رشتہ منظور کرتے وقت اچھی طرح بتا دیا تھا کہ میں یہ شادی صرف اپنے بچوں کی خاطر کر رہا ہوں... اور تمھاری والدہ سے بھی دوٹوک میں نے یہی دہرایا تھا...'

میں کہہ کر خاموش ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کہوں... پہلی بار بستر پر سجے... بیٹھے... معطر بت میں حرکت ہوئی... اُس نے جیسے پہلو بدلا مگر پھر جامد ہو گئی...

'حد ہے کہ تم ماں بیٹی نے مجھ سے اتنی بڑی بات چھپائی؟ تم لوگوں کو اپنا نہیں تو میرے بچوں کا خیال کرنا چاہیئے تھا... مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ جب میں نے مکمل طور پر خود کو واضح کر دیا تھا تو پھر تم لوگوں کی طرف سے یہ جھوٹ کیوں؟'

میری آواز تو نیچی تھی مگر تلخی اس قدر زیادہ تھی کہ بت نے گھبرا کر سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا... مگر اب میری زبان کھل چکی تھی...

'تم جب اپنے دو سال کے بچے کو نہ رکھ سکیں اور ماں ہوتے ہوئے بھی اُسے شوہر کو سونپ کر خود آزادی سے بیٹھ گئیں تو بھئی میرے بچوں کے ساتھ کیا کرو گی؟ اس طرح کا دھوکا دے کر کیا سمجھیں تم کہ میں مجبوراً تم کو برداشت کر لوں گا...؟'

میں اچانک ہی دکھی ہو گیا تھا... جیسے کوئی بہت اُمید سے کسی سواری کا انتخاب کرے اور وہ اُسے بیچ راستے میں دغا دے جائے... میں ابھی اپنی سوچ میں تھا کہ اچانک اُس نے تیزی سے اپنا گھونگھٹ اُتار بستر کی سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ پر ہاتھ مارا... صاف چمکتے نئے گلاس میں پانی بھر کر... دراز کھولا اور اُسی عجلت سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال لی... ڈھکن شاید ایئر ٹائٹ تھا یا پھر وہ گھبراہٹ میں طاقت نہیں لگا پا رہی تھی مگر ایک دو لمحوں کی تگ و دو کے بعد شیشی کھول کر اُس نے اپنے ہاتھ میں چند گولیاں اُنڈیلی اور گلاس منہ سے لگا لیا... اور پانی پیتے اُسی لمحے میں نے اُس کے چہرے کو حیرت سے دیکھا... گو اُس کی شکل و صورت سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ میں نے اُس کی تصویر کو غور سے نہ دیکھا ہو... شادی کی تیاریوں میں مصروف دن گزارنے کے بعد... رات کی تنہائی میں ایک دو بار ایسا ہوا تھا کہ مجھے ایک دم اُس کا خیال آیا تھا اور میں نے اپنی لکھنے کی میز کے خفیہ دراز سے اُس کی تصویر نکال کر کئی لمحے اُس کو بغور دیکھتے گزارے تھے... اور تصویر کی شکل اور اب کی شکل میں کافی فرق تھا... مطلب چہرہ تو وہی تھا مگر جیسے کسی نے کھینچ کر ربڑ کی طرح لمبا کر دیا تھا... اور پھر مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ دم سادھے میرے سامنے بیٹھی تھی مگر اُس کا چہرہ لمبا... اور لمبا... پھر اور بھی لمبا ہوتا چلا جا رہا تھا... ابھی میں سنبھلا نہیں تھا کہ اُس کی سانس اٹکنے لگی اور اُس کے لمبے ہوتے چہرے کا دہانہ اچانک سے ٹیڑھا ہو گیا... جیسے کوئی ربڑ کو کھینچ کر پہلے لمبا کرے اور پھر اُس کے آدھے حصے پر انگلی رکھ کر موڑ دے... میں واقعی گھبرا گیا تھا یا پھر ڈر گیا تھا... یہ کوئی انسان نہیں... یہ تو کوئی عفریت لگ رہی ہے... بھلا ایک انسان اپنے چہرے سے ایسا کیسے کھیل سکتا ہے... میں صوفے سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا... اُس کا ایک ہاتھ میری جانب بڑھا جیسے مجھ سے مدد طلب کر رہی ہو مگر میں ہمت ہار چکا تھا اور تیزی سے کمرے

سے باہر نکل آیا تھا... باہر نکلتے ہی دیکھا کہ تمام لوگ جن میں کچھ دور دراز کی رشتہ دار جو کہ شادی کی خوشی میں ایک دو دن رُکنے آ گئے تھے سب ہی سونے کے لئے جگہیں ڈھونڈ رہیں ہیں... تھکن کے باوجود ایک خوشی سی تھی سب کے چہروں پر... مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں... کیا ڈاکٹر کو بلاؤں... ساس صاحبہ کو فون کروں یا سب گھر والوں کو اکٹھا کر کے میرے ساتھ دلہن کے کمرے میں چل کر اُسے ملاحظہ کرنے کا کہوں... میں خاموشی سے سب سے بچتا بچاتا سیڑھیاں چڑھتا چھت پر آ گیا... سردیوں کی شروعات تھی لہٰذا چھت پر کوئی بھی سونے کے لئے نہ تھا اور میں سکون سے ایک خالی کرسی پر بیٹھ کر ایک بار پھر سے سوچنے لگا کہ کیا واقعی میں نے جو دیکھا وہی ہوا ہے یا پھر یہ میرے دماغ کا کوئی فتور ہے... کہیں میں صوفے پر بیٹھتے ہی سو تو نہیں گیا تھا کے نیند میں بے ہودہ خواب دیکھ کر ڈر کر یہاں چلا آیا مگر میں نے تو کوئی آج کل میں ڈراؤنی فلم بھی نہیں دیکھی کہ ایسا خواب آئے... اسی طرح کی باتیں سوچتے میں کرسی پر ہی بے آرامی سے سو گیا اور صبح ہونے پر نیچے لان میں جا کر حسبِ عادت پودوں اور گھانس میں پانی دینے لگا... میں کچھ ایسا ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اُٹھنے والوں کو لگے میں اپنے کمرے سے ہی نکل کر عادت کے مطابق صبح کی سیر کے لئے نکلا ہوں... سب سے پہلے چھوٹی بہن کچن میں گئی تو میں بھی لپک کر پہنچ گیا... وہ بڑی حیران ہوئی پھر ہنس کر مجھ سے دو چار مذاق کر کے ناشتہ کی تیاری کرنے لگی... میں چائے کا کپ لئے واپس لان میں آ بیٹھا... اور چھوٹی بہن سے کہہ دیا کے میرے کمرے میں ناشتہ پہنچا دے میں تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا... میں سوچ رہا تھا کہ بہن جائے گی اور اُسے دیکھے گی تو خود ہی چیختی چلاتی سب کو اکٹھا کر لے گی... مگر چھوٹی بہن اندر گئی تو واپس بھاگی بھاگی میرے پاس آئی...

'بھائی جان... آپ یہاں بیٹھے ہیں اور بھابھی اتنا سادی سی ہو کر اندر بیٹھی ہیں کہ بس کیا کہوں... آپ پلیز اُن کو جا کر کہیں کے ناشتہ کر کے تھوڑا میک اپ وغیرہ کر لیں اور کوئی شوخ رنگ کے کپڑے پہن لیں... ابھی سب اُٹھ کر اُن کے کمرے کی طرف دوڑ لگائیں گے... جائیے ناں...' بہن مجھے چند ایک اور ہدایات دے کر چلی گئی... میں بڑا حیران ہوا... یہ کیا کہ میری بہن کو اُس کا لمبا ٹیڑھا چہرہ نظر نہیں آیا جو بھی تھا اب مجھے ہی ہمت سے کام لینا ہوگا... عجیب بات تو ہے مگر اس کی تہہ تک جانا ہے... میں خود کو سمجھاتا بجھاتا کمرے میں داخل ہوا تو وہ کسی سے بات کر رہی تھی... کیونکہ صوفے کمرے میں دروازے سے ہٹ کر رکھے ہوئے تھے تو اُسے میرے آنے کی خبر نہ ہو سکی تھی... وہ کپکپاتی آواز میں کسی سے فون پر کہہ رہی تھی...

'میں نے تو منع کیا تھا کہ اب میں اس قابل نہیں رہی ہوں... نہ کرائیں شادی... مگر آپ کو ہی بس یہ سب کرنے کا جنون سوار تھا... کیا فائدہ ہوا... پہلے کیا کم ذلت اُٹھائی ہے... میں نے؟ بات بھی کروں تو کیا کہوں... وہ مجھ پر یقین کیوں کرنے لگے...؟'

میں ڈٹ کر اُس کے سامنے پہنچ گیا تو اُس نے ابتری میں فون بند کر دیا... ہلکے فروزی کپڑوں میں... دھلے ہوئے منہ... پھیلا ہوا کاجل اور آبدیدہ آنکھیں دیکھ کر مجھے اُس پر ایک لمحے کو یقین نہیں آیا... یہ اس قدر خوبصورت کیسے لگ رہی ہے جبکہ یہی چہرہ رات میں کیسا ڈراؤنا ہو رہا تھا... میز پر ناشتہ رکھا جا چکا تھا اُس کے آگے رکھی چائے ٹھنڈی ہوئی پڑی تھی... مجھے دیکھ کر وہ اُٹھنے کو ہوئی مگر ایک کراہ کے ساتھ واپس بیٹھ گئی... اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی نہیں بلکہ نیم دراز تھی... میز پر اُس کی دوائی کی شیشی بھی رکھی تھی اور مجھے ایک بار پھر سب یاد آ گیا... میں کمر پر دونوں ہاتھ لگائے اب اُسے بغور دیکھ رہا تھا... سوچ رہا تھا کہ آخر بات بھی کروں تو کیا کہوں...؟

'آپ پلیز کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے... برائے مہربانی میری بات سُن لیجئے گا... پلیز آپ میری بات سن لیں... بس ایک بار... میں آپ سے پھر کوئی سوال نہیں کروں گی... پلیز...'

اُس کے لہجے میں جہاں نقاہت تھی وہیں حد درجے کی التجا بھی تھی... میں لمبی سانس بھر کر اُس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا...

'امی جان نے آپ کی بڑی بہن کو سب بتایا تھا... میری شادی پھر بچے کا میرے شوہر کو مل جانا سب بتایا تھا... ہم نے کچھ نہیں چھپایا... آپ یقین کریں... بس اتنی غلطی ہوئی کہ امی جان نے آپ سے منہ در منہ بات نہیں کی... اگر آپ کہیں تو میں آپا سے بھی پچھوا سکتی ہوں... ہم نے آپ لوگوں سے کوئی جھوٹ نہیں کہا... کوئی دھوکا نہیں دیا...'

میں نے نفی میں سر ہلاتے تیز لہجے میں پوچھا۔

'اور جو رات میں تماشہ ہوا... کیا اس کے بارے میں بھی بتایا تھا آپا کو... کہ ایسا بھی ہوتا ہے؟'

وہ صوفے پر نیم دراز اپنی کنپٹی کو ہلکے ہلکے سہلا رہی تھی جیسے تڑپ کر سیدھی ہوگئی...

'وہ... دراصل مجھے جو بیماری ہے اُس میں... اُس میں کسی بھی ایسے لمحے کو جو میرے لئے سہنا مشکل ہو جائے تو ایسا یا اس جیسا دورہ پڑ جاتا ہے... مگر یہ کوئی روز نہیں ہوتا... میں دوائی باقاعدگی سے لیتی ہوں اور آپ یقین کریں میں شادی کی رات کے لئے اپنا بہت خیال کرتی رہی تھی مگر آپ نے آتے کے ساتھ ہی جس طرح مجھ سے جھوٹ اور دھوکے کی بات کی تو میں برداشت نہیں کر سکی... آپ یقین کریں... پلیز...!'

وہ ابھی تک کھکھیائے جا رہی تھی... ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی لمحہ ہوگا کہ وہ میرے پیر ہی پکڑ کر بیٹھ جائے گی... میں چڑ گیا...

'یہ کیا مذاق کر رہی ہو تم میرے ساتھ... تمہاری اس بیماری کی وجہ سے ہی بچہ تمہارا شوہر لے گیا کہ تم اس قابل ہی کہاں ہو کہ بچہ پال سکو اور تمھاری ماں نے تمھیں میرے سر منڈھ دیا... میرے بچوں کا کیا ہوگا اب...؟'

میرے تیز لہجے سے وہ خائف ہوگئی... اُس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزرنے لگا اور مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں پھر سے اُس کا چہرہ نہ بگڑ جائے... وہ جلدی سے بولی...

'آپ میرا یقین کریں... یہ سب دنیا نے سوچا ہے کیونکہ دنیا جانتی نہیں... میں بہت اچھے طریقے سے گھر بار اور بچوں کا خیال کر سکتی ہوں... آپ کسی بھی ڈاکٹر سے پوچھ لیں میں ہر قسم کی ذمہ داری اُٹھانے کے قابل ہوں... جب میرے سابق شوہر نے میرے بچے کے لئے مقدمہ کیا تو ہم صرف اکیلے ہونے سے مات کھا گئے... ہمارا وکیل بھی اُن سے جا ملا... آپ میرا یقین کریں میں آپ کو بالکل سچ بتا رہی ہوں میں آپ کو اپنے ڈاکٹر سے بھی بات کروا سکتی ہوں...'

میں نخوت سے سر ہلانے لگا تو وہ بے چین ہو کر اور بھی التجاؤں پر اُتر آئی...

'آپ پلیز مجھے ایک موقعہ دے دیں... بس ایک چانس... پلیز... بس مجھ پر ایک بار بھروسہ کر لیں... آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی... آہ یقین کریں میں آپ کے بچوں اور گھر کا پورا پورا خیال رکھوں گی... پلیز بس ایک بار... پلیز...'

وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی اور مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس مشکل کا کیا حل نکالا جائے.. پہلی بار مجھے کسی پر رحم بھی آ گیا تھا...مگر میں اس بات پر بہت فکر مند تھا کہ پتہ نہیں اس کو کون سی موذی بیماری ہے اور کیا میرے بچے اس کے چھوئے جانے سے اسی بیماری میں تو مبتلا نہیں ہو جائیں گے...سوال اس قدر زیادہ تھے اور جواب ندارد... میں اس طرح اچانک شادی کے دوسرے ہی دن تو اُسے چھوڑ بھی نہیں سکتا...کیا جواز دوں گا...آپا کو تو پہلے سے سب کچھ بتایا جا چکا تھا...اچانک مجھے آپا پر غصہ آنے لگا... آپا نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ کس بات کی دشمنی نکالی آپا نے مجھ سے میرے معصوم بچوں سے؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا پھر میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ دماغ ویسے ہی سویا ہوا تھا...ابھی تو چند دن سکون سے کٹ ہی جائیں گے کہ گھر میں لوگ ہیں مگر بعد میں کیا ہوگا...میں اس کے ساتھ بھلا کس طرح اپنے بچوں کو اکیلا چھوڑ سکتا ہوں...یہ تو عجیب کٹھن چکر میں پھنس گیا...میں سوچتا سوچتا بستر پر جا گرا اور لیٹتے ہی سو گیا...!

☆......☆

میں سویا نہیں تھا بلکہ شاید بے ہوش ہو گیا تھا کہ جب آنکھ کھلی تو رات کا کوئی پہر تھا اور وہ میرے سرہانے بیٹھی میرا سر دبا رہی تھی... مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ ہونٹ بھینچ کر پیچھے ہٹ گئی جیسے خود کو میری نظروں سے بچا رہی ہو...میں کہنیوں کے سہارے اُٹھ کر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا...

'سوپ بنا کر رکھا ہے میں ابھی لے کر آتی ہوں...'

وہ میری نظروں سے دور رہنا چاہ رہی تھی اور جیسے ہی میری نظر دوبارہ اُس پر پڑی تو وہ جلدی سے اُٹھ کر کمرے سے جانے کا کرنے لگی...

'ٹھہرو...اِدھر آؤ...' میں نے تحکمانہ انداز میں اُسے پاس بلایا...

'میں پہلے تمہارے ڈاکٹر سے ملوں گا...پھر تمہاری رپورٹس دوائیوں کی پرچیاں سب کچھ اپنے کسی جان پہچان والے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا اور پھر اگر مجھے اطمینان ہوا تو ہی...'

میں نے رُک کر اُس کا جائزہ لیا وہ چھوٹی بچی کی طرح سر جھکائے بستر پر میرے پیروں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی...اُس کی نظریں ایک دم اُٹھیں اور آنکھیں پھر سے آبدیدہ ہو گئیں...اُن بڑی بڑی آنکھوں کے نیچے حلقے صاف نظر آ رہے تھے جو مجھے یقین ہے کہ صبح نہیں تھے...وہ سارا وقت روتی رہی تھی...مگر ابھی رحم کھانے کا وقت نہیں تھا...میں اپنی بات بہت واضح طور پر دوٹوک کرنے کا عادی ہوں کہ...ہر بات پہلے سے طے ہو جائے تو بعد میں اگر مگر کی گنجائش نہیں رہتی...

'دیکھو صاف صاف بتا رہا ہوں...کہ اگر مجھے اطمینان ہوا تو ہی یہ رشتہ چل سکے گا کیونکہ میں اپنے بچوں کے لئے کوئی مشکل کھڑی نہیں کروں گا اور پھر...یہ بھی یاد رکھو کہ زندگی میں کبھی بھی...تم پر کوئی اس طرح کا دورہ پڑا کہ تم نے میرے کسی بچے پر ہاتھ اُٹھایا یا مارا پیٹا یا دھکا دیا یا گھر کی کسی چیز کو نقصان پہنچایا تو میں دوٹوک کہہ رہا ہوں وہ دن تمہارا اس گھر میں آخری دن ہوگا...سمجھ گئیں تم...میں کسی پاگل کو...'

وہ ایک دم سسکی بھر کر رہ گئی تھی اور مجھے شرم آ گئی...کم از کم مجھے پاگل جیسا سنگین لفظ اُس کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہیئے...وہ پاگل تو نہیں لگتی...میں نے فوراً بات پلٹ دی...

'اچھا جاؤ...میرے لئے سوپ کے ساتھ بریڈ بھی لے آنا...بھوک لگ گئی ہے...'

میری اجازت پا کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور

جلدی سے کمرے سے نکل گئی...اس سے پہلے بھی کئی مشکلیں آئیں ہیں اور ہر مشکل سے میں نے نبرد آزما ہو کر دنیا کو جیت کر دکھایا ہے میری انا نہیں مان رہی تھی کہ میں ڈر کر یا انجانے میں کوئی بھی فیصلہ کر ڈالوں...بہتر یہی ہے کہ میں سب کچھ سمجھ بوجھ لوں...ابھی تو وقت ہے...بچے بھی محفوظ ہیں...

اگلے دو ہفتوں میں...میں اُس کے ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ کئی اور ڈاکٹروں سے ملا...اُس کی دوائیوں...احتیاط اور علاج کے بارے میں پوچھتا رہا...یہاں تک کہ رات گئے تک انٹرنیٹ پر اُس کی بیماری کے بارے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا رہا...ہر جگہ سے مجھے ایک ہی بات پتہ چل رہی تھی کہ اگر ایسے مریض بروقت دوائیاں لیتے رہیں تو یہ بالکل نارمل زندگی گزار سکتے ہیں...ہاں ان کے لئے بہت جذباتی ہونا ٹھیک نہیں ہوتا...جس کے لئے احتیاطی طور پر پہلے سے اقدامات کر لئے جائیں تو ایسے مریض مشکل لمحوں کو بھی سہہ جاتے ہیں...جس ڈاکٹر سے وہ باقاعدہ علاج کروا رہی تھی اُسے شادی کے بارے میں معلوم تھا وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملا مجھے سراہا کہ میں نے ایک ایسے انسان پر بھروسہ کر کے دنیا کو نئی راہ دکھائی ہے اور خود ہی تمام معلومات مجھے فراہم کر دیں...ساتھ میں ایسے مریضوں کی ازدواجی مشکلات پر کتابچے بھی دے دیئے...جو میں نے پڑھے تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہم سب جو خود کو نارمل تصور کرتے ہیں کہیں کہیں ایسی کسی قسم کی کچھ اُلجھنوں میں مبتلا ساری عمر گزار دیتے ہیں اور ہمارے ساتھی...ساری عمر ہمیں برداشت کرتے گزار دیتے ہیں...خیر یہ سب محض باتیں بھی ہو سکتی تھیں مگر دوسرے چند ڈاکٹروں کے اطمینان دلانے سے مجھے تھوڑا سکون ملا...

آہستہ آہستہ سب لوگ جانے لگے اور پھر آخر میں آپا بھی جانے کی تیاری پکڑ کر بیٹھ گئیں...میں دل ہی دل میں آپا سے ناراض تھا...میں نے اکیلے میں اُن سے پوچھا تھا تو انہوں نے یہ کہہ کر جان چھڑا لی تھی کہ مجھے تو کوئی پسند ہی نہیں آ رہا تھا اس وجہ سے انہوں نے یہ کیا...بہرحال اُن کے چلے جانے کا مطلب یہ تھا کے میرے بچے اب اُس کے ساتھ اکیلے رہیں گے...مجھے فکر تو ہوئی مگر اب کیا ہو سکتا تھا ویسے بھی اب تک میں نے دیکھا کہ بچے اُس سے کافی مانوس ہو گئے تھے...جبکہ مٹھو تو اکثر رات میں ہمارے کمرے میں ہی چلا آتا کہ 'اماں' کے ساتھ سوؤں گا...مٹھو کو کسی نے سکھا دیا تھا کہ امی کو پیار سے اماں کہتے ہیں تو بس اب وہ مسلسل ہی اُسے اماں کہہ کر پکارتا تھا...میں نے چند دن تو مسلسل نظر رکھی...اکثر آفس سے بغیر بتائے جلدی آ جاتا...گھر پر کسی بھی وقت فون کر دیتا اور اگر فون نہ اٹھایا جاتا تو جھٹ سے گھر پہنچ جاتا...میں نے گھر میں آنے والی ملازمہ کو بھی کہہ دیا تھا کہ سوتیلی ماں ہے کہیں بچوں پر زیادتی نہ کرے تو نظر رکھنا...اکثر اس قسم کی چھاپے مار حرکت میں کچھ غلطیاں بھی ہو جاتیں جن پر مجھے شرمندگی تو ہوتی مگر آج تک میں نے اُس سے معافی نہیں مانگی تھی...اب سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ میں کتنی چالاکی سے محض گھر پر رکھنے کے عوض اُس سے ڈھیروں کام لیتا رہا اور پر سے احسان بھی جتاتا رہا...یہاں تک کہ ہر دم اُس کے سر پر غلطی کی صورت میں گھر سے نکال دینے کی تلوار بھی لٹکائے رکھتا تھا...وہ ایک ایک بات کے لئے مجھ سے رابطہ کرنے پر مجبور تھی...بچے تو چند ہی مہینوں میں اُس سے گھل مل گئے تھے اور اُس کے ساتھ خود کو محفوظ سمجھتے تھے...مگر میں ہر دم اُس کو جتاتا رہتا کہ بچوں کو کہیں بھی اکیلے لے جانے کی وہ مجاز نہیں اگر کبھی اسکول کی میٹنگ یا بچوں کے کپڑوں وغیرہ کے لئے وہ جاتی بھی تو ہر

آدھا ایک گھنٹے میں اُس کو فون کر کے پوچھتا رہتا... وہ ہر کال پر گھبرا گھبرا کر تمام روداد سُنائی... کبھی فون نہ اُٹھا پاتی تو دوسری بار اُٹھانے پر میں کھری کھری سُنا دیتا... میں جس طرح کبھی کبھار اُس کی کسی تجویز یا بچوں کی بھلائی میں اٹھائے جانے والے کسی قدم کو بُری طرح رد کرتا تو اُس کی آنکھیں ڈبڈبا تو جاتی تھیں مگر زبان سے کچھ نہ کہتی... کچھ ہی دنوں بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جو کہتی ہے ٹھیک ہی ہوتا ہے میں بلاوجہ اُس کو روک دیتا ہوں پھر بعد میں بات ٹھیک ثابت ہو جاتی ہے تو اکڑ میں اور اُلٹا چلتا جاتا ہوں... چلو میں تو اپنی خود غرضی میں سر اُٹھاتا چلا جا رہا تھا مگر وہ کیوں اس قدر جھکتی چلی جاتی تھی...؟ اس بات کا تو اندازہ آپا نے ہی لگا لیا تھا کہ وہ پھر سے داغ دار ہونے کی اہل نہیں ہے... کچھ سزائیں گو ہوتی تو چند لمحوں کی ہیں مگر جسم نہیں دل ادھیڑ کر رکھ دیتی ہیں... یہ چند دنوں... مہینوں یا شاید سال دو سال بھر کی سزائیں کچھ اس قدر شدت سے دل و دماغ... پر حملہ آور ہوتی ہیں کہ رہائی چاہے دوسری قسم کی قید و بند کی صورت ہی کیوں نہ ملے... فوراً قبول کر لی جاتی ہے.. وہ بھی اپنی قید سے نکل کر اس قید کو جانفشانی سے برداشت کرنے کی پوری کوشش میں لگی ہوئی تھی... ایسے میں کبھی کبھی مجھے اُس پر بہت رحم آ جاتا... جب کبھی میں اُس کو کچھ سُنا دیتا اور بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوتا تو دل چاہتا ابھی جا کر اُس سے معافی مانگ لوں... وعدہ کر لوں کہ اب اُس پر مکمل بھروسہ کروں گا... اس کی جگہ اگر کوئی ایسی ہی خوبصورت... کم عمر اور پڑھی لکھی لڑکی مجھ سے شادی کرتی تو کیا میں اُسے بھی اس طرح مسلسل ذہنی دباؤ میں رکھ سکتا تھا؟ ٹھیک ہے بار بار کی ہدایات پر وہ میرے مطابق بچوں اور گھر کا خیال کرتی بھی تو کیا وہ اس کی طرح بہت خاموشی اور صبر سے اپنے حقوق سے بھی

دستبردار ہو سکتی تھی؟ شادی کی شرائط میں... جہاں میں نے یہ واضح کیا تھا کہ آنے والی میرے گھر اور بچوں کا بھرپور خیال رکھے گی تو کچھ حقوق آنے والی کے بھی تو تھے... جن کو واضح نہیں کیا جاتا مگر وہ اپنی جگہ ہوتے ہیں اور جن کا پورا کرنا شوہر پر فرض ہوتا ہے...!

میں سہاگ رات سے جو اُس سے دور ہوا تھا تو اب تک ایسے ہی رہ رہا تھا... صوفے پر تکیہ چادر لے کر سو جاتا... پہلے کے چند دن تو مجھے اُس کے دورے میں بگڑ جانے والے چہرے کی یاد ہی ڈرانے کو کافی تھی... بعد میں دوسری فکریں بھی دامن گیر ہو گئیں... کہیں میں سویا ہوا ہوں اور وہ اچانک مجھ پر حملہ کر دے... میرا گلا بھی تو دبا سکتی ہے... چہرہ نوچ سکتی ہے... کچھ بھی ممکن ہے... وہ بھی جیسے صبر اور تحمل سے مجھے سنبھلنے کا وقت دے رہی تھی... ایک بار بھی اُس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا... نہ ہی کوئی وضاحت دی مگر مہمانوں کے چلے جانے کے بعد تنہائی نصیب ہونے پر جیسے ہی میں نے عملی قدم اُٹھایا اُس کی پریشانی صاف ظاہر ہو گئی... جس رات میں کمرے میں لکھنے کی میز کو باہر نکال کر اپنا بستر لگا رہا تھا وہ ایک دم سے گھبرا گئی تھی... اُس نے بے چینی سے کبھی ہاتھ ملے تھے اور کبھی کمرے میں ہی تیزی سے چکر کاٹے تھے... کبھی باہر نکل جاتی... مگر میری سرد مہری کے آگے اُس کی زبان کھلتی ہی نہ تھی... یہ بھی بڑی مضحکہ خیز بات تھی کہ سکینہ کو اگر میری کسی بات پہ اعتراض ہوتا تو وہ لحہ بھی نہ لیتی اور بدلا اُتار دیتی... کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا کہ اُس کی زبان پر کوئی ناپنے کا آلہ لگا ہوا تھا یہاں میں نے کچھ کہا اگر اُسے ناگوار ہوا تو پٹ سے اُسی جتنا اور زیادہ تر اُس سے بڑا... وزن میں دگنا... جواب حاضر... میں نظر انداز کر کے اپنی توجہ کسی اور طرف کرنے کی کوشش کرتا تو وہ ایک

اور حملہ کر دیتی... اور جب تک میں کھسیا کر ہنس نہیں دیتا یا اُس کو منانے کے لئے کوئی میٹھی بات نہ کر لیتا وہ چین نہیں لیتی تھی... کبھی کبھی تو رات میں کی گئی بات کو پورا دن چلاتی... کچھ لوگ اندر سے تو خالی ہوتے ہیں مگر باہر سے ہر وقت لبالب بھرے رہتے ہیں... جہاں ہم نے اُن کے مزاج کے خلاف کچھ کیا ...انہوں نے اُلٹ دیا... ویسے تو اس میں کوئی بُرائی نہیں مگر رشتوں میں انسان لبالب بھرا نہیں رہنا چاہئے... اپنے اندر جذب کر لینے... خندہ پیشانی سے برداشت کر لینے کی تھوڑی سی عادت ضروری ہوتی ہے... میں یہی سمجھا تھا کہ اب میری خواب گاہ کی باتیں ساس صاحبہ تک پہنچے گی اور پھر میری بہنوں تک... مگر ایسا کچھ نہ ہوا... ساس صاحبہ کو اگر معلوم چلا بھی تو انہوں نے کسی اور سے کوئی تذکرہ نہیں کیا... میں نے چند دن انتظار تو کیا مگر پھر سمجھ گیا کے اس بات کو بھی دوسری بہت سی باتوں کی طرح جذب کر لیا گیا ہے..

پہلے دن کی بے چینی کے بعد جیسے وہ سکوت میں آ گئی اُس نے کبھی کوئی شکایت کی اور نہ ہی مجھے کبھی ایسا ظاہر کیا کہ وہ میرے الگ سونے پر ناراض ہے... بستر پر ہر روز چادر بھی بدل دی جاتی... اور موسم کے حساب سے اوڑھنے کے لئے چادر یا کمبل بھی میرے کمرے میں جانے سے پہلے رکھ دیا جاتا... مجھے ایک دو بار خود پر غصہ آیا... یہ تو ایک قسم کی سزاؤں میں شمار کیا جاتا ہے کے بیوی سے قطع تعلق کر کے اُس کو الگ کر دیا جائے... میں اُس کو کس قصور کی سزا دے رہا ہوں... کس بات پر اکڑا ہوا ہوں... مگر اب تو جو کر چکا تھا اُس کو کرتے چلے جانا بھی مجبوری تھی... گو کہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ مجھ سے اس قدر سہمی ہوئی ہے کہ آگے بڑھ کر شاید زندگی بھر اس قسم کا کوئی مطالبہ نہ کر سکے... تو پھر کیا میں ساری زندگی ایسے ہی گزار دوں گا؟

☆......☆

ایک دن اُس کے ماموں مجھ سے ملنے میرے دفتر آ گئے... انہوں نے نکاح کے دن مجھ سے میرا کارڈ لے لیا تھا... میں نے یہ اصول اپنایا ہوا تھا کہ کچھ بھی ہو... اُس کے گھر والوں کو عزت و احترام دوں ساس صاحبہ بھی اسی بات پر مجھ سے کافی خوش رہتی تھیں... ماموں اچانک دفتر آئے تھے مگر اتفاق سے میں دوپہر کے کھانے کے لئے فارغ ہوا تھا... کھانے کے لئے اُن کو بھی ساتھ لے گیا... مجھے اُن کی شخصیت میں لگائی بجھائی کرنے والی ایک بوڑھی مائی جیسا شک ہوا تھا مگر پھر بھی حتی الامکان اُن سے خوشدلی سے ملا... اور وہی ہوا... انہوں نے ایک بار پھر سے میرے دماغ میں ہزار قسم کے وسوسے ڈال دیئے تھے... میرا دل بجھ گیا... بڑی مشکل سے دفتر کا وقت پورا کر کے گھر پہنچ گیا اور بچوں سے دل بہلانے کی کوشش کرنے لگا... اُس نے میرے چہرے کو پڑھنا شروع کر دیا... مجھ سے کئی بار طبیعت کا پوچھا... کچھ کھانے پینے میں بے احتیاطی پر استفسار کیا... میں جھنجھلایا تو وہ حسب عادت خاموش ہو گئی...

'جب تمہارا ماموں زاد تم میں دلچسپی لے رہا تھا اور شادی کرنا چاہتا تھا تو تم نے انکار کیوں کیا؟'

رات میں کمرے کی تنہائی میں... جب وہ اپنے معمول کے مطابق دوائی وغیرہ کھا رہی تھی تو میرے اس اچانک سوال سے گڑبڑا گئی... اور جو پانی گلاس میں دوائی کھانے کے لئے اُنڈیلا تھا... غٹاغٹ پی گئی... میں نے اُس کے ماموں کے مجھ سے ملنے کی اطلاع دی اور کچھ وسوسوں پر بھی بات چیت کر لی اور یہ بھی کہ ماموں نے بتایا کہ اُن کے بیٹے کا اُس کے لئے رشتہ بھیجا گیا تھا مگر ذلیل کر کے

انکار کر دیا گیا جبکہ ماموں کا لڑکا اُس کے سابقہ شوہر سے کہیں زیادہ خوبصورت اور پڑھا لکھا تھا... وہ پلکیں جھکائے بغیر مجھے سُنتی رہی... میرے چپ ہونے پر گلا کھنکھار کر بڑی احتیاط سے گویا ہوئی...

'ذلت اور عزت تو خداوند کے ہاتھ میں ہوتی ہے... امی نے اُن کو ذلیل تو نہیں کیا بس 'لڑکا لڑکی کا مزاج بہت مختلف ہے' یہ کہہ کر رشتے کو لوٹا دیا تھا... میں کیا کہوں وہ اب تک اس بات کو دل سے لگائے بیٹھے ہیں...'

'ہاں... وہ تو ابھی تک بہت ناراض ہیں... کہہ رہے تھے کہ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے اللہ نے سب کو دکھا دیا...'

میں ایک بار پھر اپنی دُھن میں ایسا کچھ کہہ گیا تھا کہ اُس کا سر ندامت سے جھک گیا... اور یہ بات میں کرنا نہیں چاہتا تھا... آگ پر کسی کا نام نہیں لکھا ہوتا... یہ کسی کی ملکیت نہیں ہوتی... جو جس طرح چاہئے اُسے استعمال کر لے... کچھ لوگ اپنے دل کو گرماتے ہیں تو کچھ لوگ اسی آگ کو دوسروں کو جلانے کے لئے استعمال کرتے ہیں... جلایا مجھے کسی اور نے تھا اور بھڑک میں اُس پر گیا تھا... میں نے لہجے کو نرم اور غیر جانبدار کر لیا اور دو چار باتیں اور بھی بتا دیں... مگر کچھ اس طرح کہ جیسے بس بتا رہا ہوں کہ یہ باتیں ہوئیں... اُس کی آنکھیں پھر نہیں اُٹھی تھیں اور میرا دل اور بھی اُداس ہو گیا تھا... میں اپنے بستر پر منہ دوسری طرف کر کے لیٹ گیا... مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ابھی بھی اُسی طرح ہاتھ میں خالی گلاس لئے بستر کے کونے پر جمی بیٹھی ہے... اچانک مجھے پڑھے ہوئے کتابچوں کی ہدایات اور پہلی رات کا خیال آ گیا... میں چونک کر اُٹھ بیٹھا...

'سنو... دوائی کھالی تم نے؟'

میں نے نرمی سے پوچھا اور اُس کی طرف سے جواب نہ پا کر اُس کے پاس پہنچ گیا...

'ادھر دیکھو... ادھر دیکھو میری طرف...؟'

اب کی بار میں نے بات کرتے ہوئے اُسے کندھے سے پکڑ کر ہلکے سے ہلا بھی دیا... وہ چونک کر حیران نظروں سے مجھے دیکھنے لگی... میں نے گلاس اُس کے ہاتھ سے لے کر دوائی کی شیشی پکڑا دی اور گلاس میں دوبارہ پانی بھر کر اُس کے برابر... بہت ہی قریب بیٹھ گیا... اُس نے میکانکی انداز میں گولیاں کھا کر پانی پی کر گلاس میری طرف بڑھا دیا...

'چلو لیٹ جاؤ... آرام سے... اور کوئی فضول بات مت سوچو... سب ٹھیک ہے...'

میں نے اب اُسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا تھا...

'کہاں ٹھیک ہے؟ میں کتنی ہی کوشش کرتی ہوں... مگر ہر روز ناکامی کا سامنا ہو رہا ہے... آپ تو روز ہی میرے بارے میں کچھ نیا سُن لیتے ہیں... میں کہاں تک آپ کو...'

وہ روہانسی ہونے لگی...

'ایسی بھی اب کوئی بات نہیں... ہم سب کا ماضی تو ہوتا ہی ہے اور ماضی کی غلطیوں پر ایک دوسرے کو معاف کر دینے میں ہی رشتے مضبوط ہوتے ہیں... اب جو تمھارے ساتھ ہوا... اُس میں تمہارا اپنا ہاتھ تھا یا نہیں مجھے کیا غرض... بس تھوڑا سا تجسس تو ہوتا ہی ہے اس لئے میں نے ماموں کو بولنے دیا...'

شاید اتنے سلیقے کی بات کی اُس کو مجھ سے اُمید نہیں تھی وہ پھر حیران رہ گئی... میں نے اُسے بستر پر لٹا دیا اور پھر... پتہ نہیں مجھے کیا ہوا... ایسا کبھی کبھار مجھے محسوس ہوتا تھا کہ لمس بھی جادو کرتا ہے... خاص طور سے ہم مردوں کے تو سر چڑھ کر بولتا ہے... اُس کے بازو کو پکڑتے ہوئے مجھے جو گرمائش ملی تھی میری ضد کو لمحوں میں پگھلا گئی... کبھی کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ہم دکھ دینا نہیں چاہتے مگر انجانے میں ہماری زبان نشتر چلا بیٹھتی ہے... اور جب زخمی ہونے والا بڑے تحمل سے جوابی حملے کے بجائے... اپنی آنکھیں چھلکا لے... ندامت سے سر جھکا لے... خاموشی سے وار سہہ جائے تو خود پر ہی شرمسار ہو کر دلاسہ دینے کی خاطر آگے بڑھ کر اُس کا مزاج بحال کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں... شاید یہ میرے اندر کا احساس جرم تھا یا لمس کا جادو تھا... جو کچھ بھی تھا میں اُس کے لیٹتے ہی... جھٹ سے بتی بند کر کے... اپنے بستر سے اوڑھنے کی چادر گھسیٹ اُس کے برابر میں جا لیٹا... اندھیرے میں بھی اُس کی بیگانگی عیاں تھی... مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ اس وقت اُس کو بہت سی باتیں سمجھ نہیں آ رہیں... وہ پھر سے خالی نظروں سے چھت کو تکنے لگی... مجھے لمس کا چسکا لگ چکا تھا میں نے چادر کے اندر سے ہی ٹٹول کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا تو وہ تڑپ کر میری طرف کروٹ بدلتے ہوئے معصومیت سے گویا ہوئی...

'میں تو چاہ رہی تھی کے آج رات آپ مٹھو کے پاس سو جاتے...؟ میں اب تک پہلی رات... آپ کی دہشت اور خوف سے پھیلتی آنکھیں بھولی نہیں ہوں... اکثر یاد کرتی ہوں کہ آپ کیسے گھبرا گئے تھے... خوامخواہ مجھے ایسا ویسا دیکھ کر آپ کا دل پھر سے خراب ہو گا... اُس وقت بہت تکلیف میں تھی ورنہ آپ کے لئے صوفے پر چادر بچھا کر سونے کا انتظام خود ہی کر دیتی... اگر پھر سے ایسا ہی کچھ ہوا تو...؟'

کہنے کو تو اُس نے بھی کہہ دیا تھا مگر پھر اُمید بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی...

اور خداوند تو فرماتے ہی ہیں کہ انسان خود پر خدا کی نعمت کو بند نہ کریں... تو اب میں کیا جواز دیتا... کہاں تو الگ سو کر اُس کو... خود کو نجانے کون سے قصور کی سزا دیتا رہا ہوں... آج سے پہلے تک میں بھلا کس زعم اور کس بات پر اس نعمت کو ٹھکرا تا رہا تھا؟

میرے پاس جواب نہیں تھا کیونکہ اب میں خود ہی اپنے چسکے کی تسکین چاہتا تھا تو اُس کی بات کو ہلکا لیتے ہوئے جلدی سے بول گیا...

'اچھا اچھا ابھی تو نہیں ہو رہا ناں کچھ... ابھی سو جاؤ... بعد میں بھی کچھ نہیں ہو گا... بس تھوڑی ہمت کرو... برداشت کرو...'

اور ہوا بھی تو بس اتنا ہی کہ کئی صدیوں بعد میری آنکھ خوب دیر سے... مٹھو کے چہکنے کی آوازوں سے کھلی... شاید بچے اسکول کے لئے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر بیٹھ چکے تھے... زور و شور سے سدرہ اُسے رٹا ہوا سبق سُنا رہی تھی... اور تیمور بیچ بیچ میں ٹوک کر برابر شرارت کر رہا تھا... اُس نے ہمیشہ کی طرح دھیمے سے تیمور کو سرزنش بھی کی... سدرہ کو شاباشی دے رہی تھی کہ بچے بھاگ کھڑے ہوئے... وین آ گئی تھی... اس سے پہلے میں ہر صبح بچوں کے اُٹھنے سے پہلے اُٹھ کر لاؤنج میں بیٹھ جاتا تھا کہ اُس پر نظر رکھ سکوں... وہ اسکول کے لئے تیاری کرانے میں کوئی کوتاہی نہ کرے... مٹھو کا دیر سے اسکول میں داخلہ ہوا تھا اُسے پیار سے بہلانے کہ بجائے ڈانٹ پھٹکار نہ کرے... کہیں سدرہ پھر گندے یونیفارم میں نہ چلی جائے... اور تیمور... وہ تو بس کسی طرح چلا جائے کہیں پھر سے چھٹی نہ کر کے بیٹھ جائے... بس یہی سب دیکھنے... پہرہ دیتا رہتا... میرے پہرے پر حاضر نہ ہونے پر بھی کوئی فرق تو نہیں پڑا... بچوں کی چہکتی... ہنستی کھیلتی آوازیں ہی گواہ تھیں کہ اُس نے سب کو ہمیشہ کی طرح بہت سلیقے سے اسکول بھیج دیا ہے... میں زیرِ لب مسکراتا انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھا... آج کئی سالوں بعد مجھے لگ رہا تھا کہ میں جنت میں واپس بُلا لیا گیا ہوں... میں اپنی سزا مکمل کر چکا ہوں... دن بھی خوشگوار لگ رہا تھا اور مسحور کُن خوشبو ابھی تک بغلگیر

تھی... اُسی رات... میں اپنا بستر لپیٹ کر اسٹور میں ڈال آیا تھا...!

☆......☆

ہم ایک دوسرے سے قریب ہونے لگے تو پھر جیسے قریب ترین ہونے لگے... اور شاید میرے دل میں بھی یہی تھا کہ میں اُس کے قریب ہو جاؤں... ہمیں جب کوئی اچھا لگنے لگتا ہے تو اُس سے قریب ہونے کے جواز بھی ڈھونڈ لیتے ہیں... وہ اپنے بارے میں کم ہی بات کرتی تھی مگر کبھی ساس صاحبہ کے ساتھ بیٹھ کر تو کبھی اُس کے کسی رشتہ دار کی محفل میں... مجھے اُس کے ماضی کے بارے میں کچھ نہ کچھ حصوں... قسطوں میں معلومات ملتی ہی رہتی تھیں... جو میں سکون سے بیٹھ کر اکثر جوڑ سے جوڑ ملا کر اپنے لئے کہانی کو مکمل کر لینے کی کوششوں میں لگا رہتا... کبھی کوئی بات یا حصہ جو اُس کے خلاف جاتا تو اُس کو بھول جانے کی کوشش کرتا... اور اُس حصے کو یکسر ہی کہانی سے نکال دیتا... جیسے کوئی بچہ کہانی بُننا شروع کرے... سب کچھ اچھا... سب کچھ اچھا... مگر ایسا بھی ہوتا کہ کچھ حصے اس قدر ناگریز ہوتے کہ مجھے اُن کو شامل کرنا ہی پڑتا... دل میں کرواہٹ تو بھرلی تھی مگر برداشت کر لیتا... ویسے بھی... میں نے خود اپنی مرضی سے داغ دار اور سدھائے ہوئے کو پسند کیا تھا... اب کس بات پر اکڑتا... وہ بچپن سے گم صم... بڑے بھائیوں اور بہنوں سے الگ تھلگ رہنے والی انسان تھی... پڑھائی مکمل کر کے جیسے عموماً شادیاں ہوتی ہیں اُس کی بھی شادی کر دی گئی... شوہر نے تنگ کرنا شروع کر دیا... کچھ لوگ ہمارے اردگرد بڑی عجیب سی شخصیت رکھتے ہیں... اُن کو کبھی کوئی بات پسند نہیں آتی... کوئی اچھا نہیں لگتا... ہر موسم پریشان کرتا ہے... ہر ملنے والے میں کئی عیب... ہر وقت خود پر مظلومیت کا پرچار... اور کچھ لوگ اُن سے بھی زیادہ عجیب ہوتے ہیں... وہ نہ کسی سے اپنی ناپسندگی کا اظہار کر سکتے ہیں نہ ہی خود کو ممتاز کرنے کے لئے کوئی تگ و دو کرتے ہیں... شرمیلے... گھبرائے... لڑکھڑاتی زبان... جو چاہے جب چاہے اُن کی بے عزتی کر دے... اُن کے اوپر بڑے سے بڑا الزام دھر دے... وہ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ جواب کیا دینا ہے... خود کو نہ تو خود ہی سمجھ پاتے ہیں اور نہ ہی اپنے بارے میں ٹھیک سے کسی کو کچھ سمجھا سکتے ہیں... خود تو اپنے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتے اگر کوئی دوسرا کچھ سوچ بھی لے تو شرما کر سات پردے میں چلے جاتے ہیں... میں یہ نہیں مان سکتا کہ وہ گھر کے کاموں سے لاپروہ ہوگی... کیونکہ جس مہارت سے وہ میرا گھر چلا رہی تھی... کوئی ایک دو دن کا سیکھا ہوا نہیں... کاروبار کے لئے شوہر کو پیسوں کی ضرورت پڑی تو زیور بیچ دیئے... اُس پر بھی بس نہ ہوا تو میکے سے لا کر دو کی رٹ لگا دی... رٹ کچھ یوں کہ دن بھر اپنی مشکلوں کے پرچار اور کسی سے ذرا بھر مدد نہ ملنے پر غم و غصے کا اظہار... جو لوگ صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں جن کو آئینے میں صرف اپنا عکس دیکھنے کی عادت ہوتی ہے جن کو محفل میں صرف اپنے اچھے لگنے اور لوگوں میں اچھا نظر آنے کی فکر ہوتی ہے اُن کے لئے دوسرے ایسی ہی ثانوی حیثیت رکھتے ہیں... وہ صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں... اپنا بھلا دیکھتے ہیں... اپنے فائدے کا سودا کرتے ہیں... وہ ایسے خود غرض ہوتے ہیں جو کسی کے بھی دل کو... ارمان کو... مان کو ٹھوکر لگا کر آگے بڑھ سکتے ہیں... اُن کو روکے رکھنے کے لئے اُن کے آگے اُن کے فائدے ڈالتے چلے جاؤ... ایک کے بعد ایک فائدہ دیتے چلے جاؤ... وہ ایک حلق میں ڈالتے نہیں کہ دوسرا نوالہ منہ میں ٹھونس لینے کی کوشش کرتے ہیں... اُن کی بھوک کبھی بھی نہیں مرتی... اُن کی پیاس کبھی نہیں بجھتی... اُن کی نظر بھی

نہیں تھکتی... اُن کو صرف اپنے آپ سے پیار ہوتا ہے... اُن کو دنیا اپنے گرد گھومتی محسوس ہوتی ہے... اُن کے لئے اُن کی زندگی... خوشی... سب سے عزیز ہوتی ہے... وہ کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے اگر کبھی غلطی سے کر لیں تو جلد از جلد اُس سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں وہ ہر وقت ہر نئے موڑ پر جال پھینکتے اور سمیٹتے رہتے ہیں اُن کو ہارنا نہیں آتا... وہ جیت کے لئے پیدا ہوئے ہیں... وہ صرف چھیننا جانتے ہیں... وہ صرف جیتنا جانتے ہیں... وہ خواہش کرنا جانتے ہیں... وہ ہر اچھی چیز پر اپنا حق سمجھتے ہیں... وہ ہر وقت صرف اور صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں... سو وہ بھی کچھ ایسا ہی تھا... شادی کے بعد اُس کی بیجا ضد اور اکڑ اپنی جگہ مگر جب سسرال والوں نے مدد کرنے سے انکار کر دیا تو اُس نے ہتھیار کے طور پر بیوی کو نکال باہر کرنے کی دھمکی دینی شروع کر دی... شیر آیا... شیر آیا... اور ایک دن شیر آ ہی گیا... دوسرے تمام بچوں کے باہر ہونے کے سبب ساس صاحبہ بھی کمزور پڑتی چلی گئیں... شوہر نے ضد میں بچے کو ہتھیا لیا... وکیلوں مقدموں پر پیسہ تو بے دریغ خرچ کیا گیا مگر بات نہ بن سکی... اُسی دوران بچے کی دوری نے اُس پر گہرا اثر کیا اور وہ مرض جو بچپن سے چھپا ہوا تھا کھل کر سامنے آ گیا... اب الگ پریشانی کے علاج کے لئے ڈاکٹروں کے چکر لگنے لگے... علاج چلتا رہا اور ڈاکٹروں نے تنہائی سے چھٹکارے کو علاج کے لئے ضروری قرار دے دیا...

کہانی نے کروٹ لی اور میں اپنے بچوں سمیت آن دھمکا... واقعی میرے گھر میں اُس کو تنہائی نصیب نہ ہوتی... دن بھر بچوں اور گھر کو دیکھتے... کہیں نہ کہیں مصروف رہنے میں گزار لی...

میں اکثر دل میں سوچتا کہ چلو ابھی تک تو ٹھیک ہے... کیا یہ سب ایسے ہی چلتا رہے گا؟

کیا وہ اسی طرح ایک فعال انسان کے طور پر ہم سب کے درمیان ہمیشہ رہ سکے گی؟

ڈاکٹر کو اپنی الجھن بتاتا تو وہ مسکرا کر کہہ دیتا کے کسی بھی بات کی ضمانت تو ہم کیا کوئی بھی نہیں دے سکتا... ایسے میں خداوند پر بھروسہ کیوں نہ کر لیا جائے...؟

☆......☆

بہرحال وہ اپنی دُھن میں مگن نکلی... اُس نے ان ڈیڑھ سال میں ہی میرے گھر کو ایسا سنبھالا تھا جیسے صدیوں سے یہیں رہتی آئی ہو... پڑھی لکھی تھی لہٰذا بچوں کو بھی ڈھنگ سے چلا رہی تھی یوں بچے بھی چند ہی دنوں میں اُس کے دیوانے ہو گئے تھے اور پھر جب میں ان چاروں کو خوب گھل مل کر بیٹھا دیکھتا تو مجھے اُس پر پیار آ جاتا... اب تو ملنا ملانا بھی بحال ہو چکا تھا... رشتہ دار ہمارے گھر آنے لگے اور ہم بھی محفلوں میں بچوں کے ساتھ جانے لگے... ہاں کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ وہ اچانک سے سپاٹ سی ہو جاتی... مہمانوں کا کھانا پینا... چائے پانی کا انتظام ایک دم میکانکی انداز میں کرنے لگتی... ایسے میں... میں اُس کے قریب پہنچ جاتا... کبھی کوئی جملہ... کبھی آنکھوں کا اشارہ... یا پھر بہت ہوا تو اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ہلکا سا سہلا دیتا... وہ چونک کر سنبھل جاتی مسکراتی... بچوں کو اُس کی بیماری کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا مگر حیرت انگیز طور پر بچے اُس کی اچانک گم ہو جانے کی عادت کو کچھ اس طرح سمجھنے لگے تھے کہ جب وہ کبھی خود میں گم ہوتی تو سنھو فوراً اُس کی گود میں جا چڑھتا... تیمور... یا سدرہ اُس کے کندھے سے لٹک جاتے... یہ بھی کافی ہوتا... مجھے اُس کو اپنے ساتھ کھڑا کرتا... اُس کے ساتھ بیٹھنا اچھا لگنے لگا... کسی محفل میں اُس کے حُسن پر کوئی تعریفی جملہ یا ہم میاں بیوی کے ہر وقت جڑے

رہنے پر کوئی مذاق اُچھل جاتا تو اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگتیں... اُس کی نظریں مجھ سے سوال کرنے لگتیں... جب تک میں مسکرا کر اُس کو دلاسہ نہ دے دیتا وہ اُسی طرح بدحواس رہتی... اس لئے بھی میں اُسے کہیں لے کر جاتا تو اپنے قریب ہی رکھتا... پھر بھی اکثر کہیں بھول چوک ہو ہی جاتی تھی... ایک دن ایسا ہوا کہ اُس کے میکے کی طرف کی کسی محفل میں جانے کے لئے میرا موڈ بالکل نہیں تھا مگر ساس صاحبہ کا فون آ گیا کہ ضرور آؤں کہ کچھ باہر سے آئے ہوئے رشتہ دار بھی ہوں گے... مگر بچی کے نا ہونے اور کچھ اُس کی طبیعت کے ناساز ہونے کی وجہ سے وہ بچوں کو تیار کر کے جب تک خود تیار ہو کر لاؤنج میں آئی... میرا پارہ آسمان پر چڑھ چکا تھا... مگر خاموش رہا کہ بچے نانی اماں سے ملنے پر بڑے خوش ہو جاتے تھے... پورا راستہ خاموشی سے گزرا... اُس نے بھی شاید محسوس کر لیا تھا کہ میں ناراض ہوں... اور پھر محفل میں اُس کے ماموں اور ماموں زاد ٹکرا گئے... تو میں بدلہ لینے پر تُل گیا...

'ارے بھائی جان... آپ سے ملنے کا کتنا اشتیاق تھا قسم سے...'

یہ کہتا اُس کا ماموں زاد مجھے دیکھتے ہی بڑے تپاک سے میرے گلے لگ گیا... اور مجھے اپنے ساتھ لے کر دوسری جانب بڑھ گیا کیونکہ ہم بچوں کے ساتھ تھے لہٰذا مجھے اُس کے اکیلے ہونے کی اتنی فکر نہ ہوئی... اُس کا ماموں زاد جیسا کہ میرا اندازہ تھا فضول قسم کا چیپکو اور بلاوجہ شیخی مارنے والا انسان ہی لگ رہا تھا... ہر دو چار جملے کے بعد کچھ اس طرح کہتا کہ جیسے اُس پر تو پوری دنیاداری صدقے جا رہی ہے... اور ملنے والی ہر لڑکی بس اُن کے انتظار میں ہی آہیں بھر رہی ہے... اُس نے مجھ سے ایک دو بھونڈے مذاق کئے تو میری حد ہو گئی... مگر جب میں نے دیکھا کہ وہ بار بار ہماری طرف دیکھ رہی تھی... جیسے اُسے چین نہیں آ رہا تھا... الگ ہی قسم کی رنگت میں وہ بوکھلائی ہوئی نظر آنے لگی... تو مجھے سکون ملنے لگا... ماموں زاد کو بڑی مشکلوں سے برداشت کرتا میں اُس کی بدحواسی اور بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوتا رہا... اور کافی دیر ماموں زاد کے ساتھ اکیلے گپیں لگا کر واپس اپنے خاندان میں لوٹ آیا... وہ پورا وقت اُسی طرح بجھی بجھی رہی... اور ہلکی پھلکی موسمی بیماری جس کو وہ پال پوس کر بڑا کر رہی تھی... اچانک بہت بڑی ہو گئی... کچھ لوگوں میں عادت ہوتی ہے وہ موسمی نزلہ زکام ہو... یا گلا خراب... موچ آ جائے یا چھری سے انگلی کٹ جائے... ایسی معمول کی تکالیف کو بھی دل و جان سے لگا کر رکھتے ہیں اور ہرگز کوشش نہیں کرتے کے علاج کروا کر جلدی سے چھٹکارہ حاصل کر کے سکون میں آ جائیں... دوسرے پریشان ہو کر کچھ کہیں گے تو مسکرا کر اندازِ بے نیازی سے کہہ دیں گے کہ یہ تو اپنا وقت پورا کرے گی... بلاوجہ اس کا پیچھا کیوں کریں... کوئی ڈھنگ کا کام ہی کیوں نہ نمٹا لیں... وہ بھی چند دنوں سے موسمی بخار کو گلے سے چپٹائے... تھکی تھکی سی نظر آ رہی تھی... محفل کی الجھن نے بخار کو ایک دم بڑھا کر کچھ کا کچھ کر دیا... واپسی پر مجھے خوب اندازہ ہونے لگا کہ اب تو طبیعت کچھ زیادہ ہی ناساز ہو رہی ہے... میں نے بچوں کو آئسکریم کھلانے کی دعوت دی تو تینوں چہکنے لگے... وہ آگے کھڑکی کے بند شیشے سے سر ٹکائے بے سدھ سی بیٹھی تھی... آئسکریم میں نے پارسل کروا کر بچوں کو تھما دی اور محلے کے ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا... جب گاڑی سے نکل کر اُس کی طرف کا دروازہ کھولا تو وہ چونک گئی... اُس نے مجھے حیران نظروں سے دیکھا...

'کیا ہوا آپ کو؟ خدانخواستہ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'

پچھلی سیٹ پر آئسکریم سے شغف لیتے بچے کھلکھلا کر ہنسنے لگے... بچوں کو میں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اماں کی دوائی بھی لیں گے لہٰذا اب صبر کرنا... موسمی بخار کے ہر طرف پھیلے ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس کافی رش تھا خیر ہماری باری بھی آ گئی... دوائی لے کر گھر اُترے تو اُسے چلنا بھی مشکل لگ رہا تھا... بچے سمجھ کر خاموشی سے کمرے میں چلے گئے اور جلد ہی بتی بند کر کے سونے لیٹ گئے... اُس کو دوائی دے کر میں اپنے دفتر میں آ بیٹھا... اچانک سے میرا دل اداس ہو گیا تھا... میں چاہتا تو ماموں زاد کو نظر انداز بھی کر سکتا تھا... صرف اُس کو ذرا سی بات پر سزا دینے کے لئے بلاوجہ اپنا موڈ اور اُس کی طبیعت بگاڑ بیٹھا... دفتر میں آ کر بیٹھا تو کام کرنے کے لئے تھا مگر اب دل اچاٹ ہو چکا تھا... نظریں بار بار کھڑکی سے باہر باغ کی ہلکی روشنی میں چمکتے... درخت پودوں پر جا تھمیں...

یہ کمرہ اُسی نے میرے دفتر کے کام کے لئے مخصوص کیا تھا... گول مگر چھوٹا سا یہ کمرہ جو کہ گھر کے دائیں طرف... باہر کو نکلا ہوا... باغ سے متصل تھا... اس کی دو کھڑکیاں ایک باغ میں کھلتی تھی اور ایک پیش گاہ میں... اس سے پہلے میں خواب گاہ میں صوفوں کے درمیان رکھی گئی میز پر جھکے جھکے کام نمٹایا کرتا تھا... سکینہ بستر پر اپنی طرف کی بتی بند کر کے سو جاتی میں سردی گرمی اسی طرح گزارا کرتا... جبکہ میرے لکھنے کی میز محض دکھاوے یا جگہ گھیرنے کے لئے خوابگاہ کے کونے میں پڑی رہتی تھی... مجھے دفتر سے آ کر بھی کافی دیر تک کاروباری کاغذات یا پھر حساب کتاب... کام کرنے والوں کی مختلف قسم کی عرضیاں... بہت کچھ دیکھنا ہوتا تھا... ایک دو دن میں ہی مجھے گھر پر دفتری کام کے لئے مخصوص کیا گیا یہ کمرہ بھانے لگا... کیونکہ کاغذات محفوظ لگتے تھے... گھر کے اس حصے میں سکون بھی تھا... ٹی وی اور بچوں کے شور ہنگامے کی آواز نہیں آتی تھی... خاص طور سے رات میں باغ کی کھڑکی کھلی ہوتی تو ٹھنڈی ہوائیں بھی مل جاتیں... مجھے حیرت بھی ہوئی... ایسی بات نہیں کہ سکینہ میرا خیال نہیں رکھتی تھی... اور مجھے بھی اپنی قدر و اہمیت جتانے کا کبھی کوئی شوق نہیں تھا پھر بھی اگر کوئی آپ کے آرام و ذہنی سکون کے لئے بغیر جتائے... سہولتیں فراہم کرتا جائے تو خود بخود جیسے وہ شخص اچھا لگنے لگتا ہے... کچھ ہی دنوں میں ہمارا معمول بن گیا کہ میں رات میں دیر تک گھر میں اپنے چھوٹے سے دفتر میں کام کر رہا ہوتا تو وہ تھوڑی دیر کے لئے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتی... دن بھر کی پوری تفصیل بتا کر وہ مجھ سے آنے والے دن کے لئے اگر کوئی ہدایات ہوتیں تو لیتی ورنہ اُٹھ جاتی... میں نجانے کب سے بیٹھا بہت سے کاغذات سامنے کھولے اپنی ہی سوچ میں گم تھا... احساس جرم... شرمندگی... ندامت... گڈمڈ ہو کر دماغ پلپلا رہا تھا... کاش کے سکینہ کی طرح وہ بھی ترازو سے ناپ کر حساب بے باق کرنے کی عادی ہوتی... ایسا ہوتا تو اچھا تھا کہ پھر وہ اب تک مجھے اس قدر زچ کر چکی ہوتی کہ میں بھی اپنے کئے پر نادم ہونے کے بجائے 'اچھا کیا' کہہ کر دل کو خوش کر لیتا... پتہ نہیں وہ اس طرح میری بدتمیزیوں پر خاموش کیوں ہو جاتی ہے... پھٹکار دے... ڈانٹے یا پھر... صلواتیں سُنا دے اور کچھ نہیں تو میرا خیال نہ کرے... چند دن مجھے کھانے کو نہ پوچھے... نہ ہی میرے کپڑوں کا خیال رکھے... مجھے آفس کے لئے لنچ بھی نہ دے... کچھ بھی کرے اس احساس جرم سے آزاد کر دے... بس اتنا ہی تو کرنا ہے... یا پھر میں نے ہی اُس کو اس قدر دبا کر رکھا ہوا ہے کہ وہ چاہ کر بھی غصہ نہیں کر پاتی تھی... مگر اُس کے اندر غصہ تھا ہی کہاں... شروع میں بچوں نے اُس کے صبر کو کس قدر آزمایا ہے مگر وہ تحمل

مزاجی پرکار بند رہی...

میں اپنی دُھن میں کہاں کہاں کی سیر کر رہا تھا کہ دیکھا دوست قدموں دفتر میں داخل ہوئی... ہو سکتا ہے کہ کوئی بات کرنا چاہ رہی ہو... میں جلدی سے سر کاغذات میں جھکا کر ایسے بن گیا جیسے بہت مصروف ہوں... وہ چند لمحے باغ والی کھڑکی پر کھڑی ہوئی... پھر ہلکے ہلکے چلتے وہ میز کی دوسری جانب میری کرسی کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی... اور پھر... پھر اُس نے جھک کر بہت آہستگی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں میرے چہرے کو تھام کر ماتھے کو چوم لیا... دو چار لمحے میری آنکھوں میں دیکھا... اور پھر... پھر اُسی خاموشی سے ہی واپس لوٹ گئی... میں زیرِ لب مسکرا اُٹھا... وہ میرے دل کا بوجھ ہلکا کر گئی تھی مگر سکینہ کے نہیں اپنے طریقہ کار سے... وہ مجھے نفرت سے نہیں محبت سے معاف کر گئی تھی... مجھے خود پر... اپنی خوشی پر حیرت ہونے لگی... ایسا ہوتا ہے اکثر... ہم جہاں خود کو بااختیار... سمجھ رہے ہوں... اچانک کسی کے اشاروں پر چلنے لگتے ہیں... اپنی خوشی کو اہمیت اور فوقیت دیتے اچانک سامنے والے کی خوشی میں خوش رہنے لگتے ہیں... اور ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہم حاکم سے محکوم بن چکے ہیں... شاید محبت ایسے ہی گل کھلاتی ہے... مطلوب کو طالب بنا دیتی ہے اور طالب ایک وقت کے بعد مطلوب... تو کیا واقعی مجھے اُس سے محبت ہونے لگی تھی یا بس یہ میرا وہم و گمان تھا ... جو کچھ بھی تھا بہرحال مجھ پر بڑی تیزی سے اثر انداز ہو رہا تھا... وہ میرے سامنے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کرتی... شروع دن سے میری چیزوں کپڑوں کا مجھے جتائے دکھائے بغیر خیال رکھنے لگی تھی ... اور پھر اُس کی یہ عادت کے پیسوں کے معاملے میں کبھی مجھ سے استفسار نہیں کرتی یا یہ نہ کہتی کہ اتنے پیسوں میں گزارا کیسے ممکن ہوگا... جو سکینہ اکثر ہی کرتی تھی... میں بھی اُس کی شرافت دیکھ کر تھوڑا مطمئن ہو کر اُس سے پیسوں کے بارے میں کبھی پوچھتا کہ کہاں اور کتنے خرچ کیے... میرا کاروبار بھی پھر سے زور پکڑ گیا تھا... میں مصروف ہوتا تو وہ پیچھے میں بچوں کو بہلائے رکھتی... اور ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں تھا کہ اُس نے میرے ساتھ اکیلے کہیں جانے اشارہ ہی دیا ہو... اب تو یہ بھی ہونے لگا کہ جب میکے جاتی تو بچوں کو بھی لے جاتی اور بچوں کی واپسی پر اُن کی مسرت سے مجھے اندازہ ہوتا کہ ساس صاحبہ بھی بچوں کو محبت اور پیار دیتی ہیں... تو ایسا پُرسکون گھر... خوش و خرم بچے اور خوبصورت بیوی مل جائے تو محبت ہونی لازمی ہے... محبت میں سب کچھ تو ٹھیک ہی چل رہا تھا... سال گزرا اور پھر آگے بھی کچھ مہینے اسی سلامتی سے گزر گئے اور پھر... پھر اچانک نظر لگ گئی...!

☆......☆

آپا مجھ سے اکثر ہی فون پر رابطہ کر کے حال احوال پوچھتی رہتی تھیں... اکثر مجھے آپا کا اُسے پگلی کہہ کر اُس کے بارے میں پوچھنا اچھا نہیں لگتا تھا. آپا قدرے تمسخرانہ انداز میں اُس کے بارے میں پوچھتی تھیں اور یہ بھی جتاتی جاتی تھیں کہ انہوں نے اُس کی ماں پر بہت بڑا احسان کر دیا ہے ورنہ پگلی سے کون شادی کرتا... میں کوشش کر کے آپا کو دوسری باتوں میں لگا لیتا... بہرحال ایک بات پر میں نے اُن کو سختی سے کہہ دیا تھا کہ اب جو ہوا سو ہوا جب تک کوئی ٹھوس غلطی نہ ہو میں اس رشتے کو چلاتا جاؤں گا... لہٰذا آپا بھی اب اُس کی بیماری کے بارے میں کسی سے کوئی بھی بات نہ کریں... آپا نے ڈیڑھ سال بعد پھر سے ہمارے گھر آنے کا عندیہ دیا تو بچے چڑ گئے. اُس کے گلے سے لٹک لٹک کر اُسے آپا کی تمام سختیوں کا بتانے لگے وہ سب کچھ ایسے اپنی مظلومیت کا پرچار کر رہے تھے کہ جیسے چاہ رہے ہوں کے آپا آئیں تو اُن سے... بچوں کی تکلیف کا باقاعدہ بدلہ لیا جائے... وہ مجھے... بچوں کا رویہ بتانے لگی تو مجھے ہنسی آگئی...

آپا کی آمد پر میں نے اُسے یہی ہدایت دی کہ بچوں نے اُس کے آنے سے پہلے آپا کے ساتھ بہت بدسلوکی کی ہے لہٰذا اب وہ آئیں تو وہ پوری کوشش کرے کے آپا سب سے خوش ہو کر جائیں... اُس نے مجھے یقین دلایا کہ ایسا ہی کچھ کرے گی کہ بچے تو اب اُس کی ہر بات مان لیتے ہیں... یہ بھی مان جائیں گے...

آپا آگئیں تو بھی سب کچھ اچھا ہی رہا... بچے بہت سلیقے سے آپا سے پیش آ رہے تھے اور آپا خوش خوش تھیں... دوسرے دن مجھے کچھ ایسی مصروفیت تھی کہ میں نے سب کو کہہ دیا تھا کہ مجھے کوئی رابطہ کر کے پریشان نہ کرے... میں آفس میں ایک میٹنگ میں بیٹھا ہی تھا کہ سدرہ فون کرنے لگی ایک دو بار نظر انداز کیا تو مسلسل اُس کی کال آنا شروع ہوگئی... میں گھبرا گیا... اور جھنجھلاہٹ بھی طاری ہوگئی... میں چند منٹ لے کر دوسرے کمرے میں آیا اور فون لگایا تو سدرہ نے مجھے بتایا کہ آپا... اُس سے خوب لڑ رہی ہیں... ایک لمحے کے لیے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا... ایسا کیسے ہو سکتا ہے... کل ہی تو دونوں ملی ہیں اور اتنی اچھی طرح بات کر رہی تھیں میرے گھر سے نکلتے ہی لڑنے لگیں...؟ میں نے سدرہ کو کہا کہ میری بات کرائیے... سدرہ فون لے کر شاید اُس کے پاس ہی جا رہی تھی کے آپا نے جھپٹ لیا...

'یہ دیکھو... کیا کیا اس پاگل نے... ارے میرے کپڑے پھاڑ دیئے ہیں... ارے میرے بھائی تم اب تک کس طرح اس کے ساتھ گزارا کرتے رہے... ہائے ہائے یہ کیا ظلم کر دیا میں نے تم سب پر ... ہائے اللہ... مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ایسی جنونی پاگل ہے...'

ابھی آپا آگے بھی کچھ کہتیں کہ سدرہ نے فون آپا سے واپس چھین لیا...

'پاپا آپ جلدی سے آجائیں پلیز میں سب بتاؤں گی... حقیقت کچھ اور ہے...'

ابھی سدرہ بات مکمل نہ کر سکی تھی کہ میں حلق کے بل چیخا...

'اپنی ماں سے بات کراؤ میری...'

سدرہ ڈر کے مارے آگے کچھ نہ کہہ سکی... تھوڑی کھسر پھسر کے بعد اُس کی کپکپاتی آواز آئی... وہ کچھ بتانا چاہ رہی تھی مگر جذبات میں اُس کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی... پیچھے سے مٹھو کے رونے کی آواز بدستور آ رہی تھی... مٹھو بالکل اُسی انداز میں رو رہا تھا جیسے اپنی ماں کے مرنے کے بعد رونے لگا تھا... میں پھر سے چیختے ہوئے بولا...

'میں نے کہا تھا ناں تم کو... کہ کبھی بھی تم پر پاگل پن کا دورہ پڑا... میرے بچوں یا میرے گھر والوں کو نقصان پہنچایا تو وہ میرے گھر میں تمہارا آخری دن ہوگا؟ بولو کہا تھا ناں...؟ تم اب تک مجھ سے ناٹک کرتی رہی ہو... اب تک میرے بچوں کو مار پیٹ کر ڈرا دھمکا کر میرے سامنے اچھی بنی رہیں... میں سب سمجھ گیا ہوں... ابھی آ کر تمہارا حساب کرتا ہوں...'

میں آپا کی چیخ پکار اور مٹھو کے رونے سے اس قدر خوفزدہ ہو گیا تھا کہ اپنی عقل ہی کھو بیٹھا تھا... مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ آخر کوئی اس طرح مار پیٹ کر ڈرا دھمکا کر کیسے میرے بچوں کو اتنی اچھی تربیت دے سکتا ہے... آخر کو آپا بھی تو تھیں اُن سے تو بچے سنبھلتے ہی نہیں تھے... شاید ابھی تک میں اُس پر اعتماد نہیں کرتا تھا شاید دل میں کہیں مجھے اس طرح کسی بھی

واقعے کے ہوجانے کا کھٹکا تھا میں خود ہی یہ سمجھتا تھا کہ وہ کبھی بھی کسی بھی وقت میرے گھر والوں یا گھر کو نقصان پہنچا سکتی ہے اس لئے بھی میں نے آپا کی بات سُن کر یقین کرلیا کہ بس یہی بات ہے...اُس نے ہی یقیناً آپا کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے... میں سب چھوڑ چھاڑ بھاگم بھاگ گھر پہنچا تو بچے اپنے کمرے میں تھے جبکہ آپا تیزی سے آکر اپنے دائیں کندھے کے جوڑ سے ادھڑی آستین ثبوت کے طور پر دکھانے لگیں...کہ کس طرح اُن کو زدوکوب کیا گیا ہے...غصے سے پھنکارتے ہوئے میں نے اُسے آوازیں دینی شروع کردیں مگر آپا نے مجھے بتایا کہ وہ فون پر مجھ سے بات کرکے ڈر کے مارے اُسی وقت بھاگ کھڑی ہوئی تھی...میں نے اُسی وقت ساس صاحبہ کو فون لگایا...وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچی تھی لہٰذا ساس صاحبہ انجان تھیں میں نے تمام بات اُن کو بتائی کہ کس طرح اُن کی بیٹی نے میری قابلِ احترام آپا سے بدتمیزی کی کہ اُن کی قمیض ہی پھاڑ دی اور یہ کہہ کر فون بند کردیا کہ اب کچھ بھی ہو میں اُس کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کرچکا ہوں...کافی گھنٹے آپا کو دلاسہ دیتے گزری...بچے آئے بھی تو میں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ مجھ سے بات نہیں کررہے...جیسے اُن کو میری باتیں اور میرا اقدام ایسا بُرا لگا تھا کہ وہ مجھ سے باقاعدہ اپنی ناراضگی کا اظہار کررہے تھے...تیمور ایک دم اکھڑا اکھڑا سا تھا اور کئی بار مجھ سے بدتمیزی سے پیش آتا رہا...میں نے نظر انداز کیا اور آخرکار جب میرا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا تو تھکا ہارا اپنے کمرے میں جا بیٹھا...مجھے اچانک خیال آنے لگا کہ شاید میں نے ساس صاحبہ کو اس قدر کھری کھری سُنا کر اچھا نہیں کیا...یہ کہہ کرکے میں اُن کی بیٹی کو چھوڑ رہا ہوں شاید میں نے جلد بازی کا مظاہرہ کردیا ہے...پھر میں نے اُس سے تو بات کی ہی نہیں تمام باتیں خود سے سمجھ کر خود ہی فیصلے دیتا چلا جارہا ہوں...بستر پر دراز میں یہی سب سوچ رہا تھا اور نئے سرے سے حالات پر غور کررہا تھا کہ دھاڑ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور تیمور بڑے شاہانہ انداز میں داخل ہوا...میں اُس سے ابھی اُلجھنا نہیں چاہتا تھا...جو ہوچکا ہوا مگر اب میں کسی کی خاطر اپنے بچے کو کیوں تکلیف دوں... تیمور کے پیچھے ہی سدرہ بھی مٹھو کا ہاتھ پکڑے چلی آ رہی تھی اور ان سب کے پیچھے گھبرائی سی آپا تھیں...

'ارے میں تو کہہ رہی ہوں ان لوگوں کو کہ پہلے باپ کو کچھ کھا پی تو لینے دو...مگر یہ لوگ تو ہمیشہ کے ہٹ دھرم تھا ہیں بھئی...'

میں نے آپا کو اطمینان دلایا اور تینوں بچوں سے نرم لہجے میں گفتگو شروع کرنے کا سوچا کہ تیمور نے اپنا موبائل ٹی وی سے تار کے ذریعے جوڑا اور ٹی وی چلا کر اپنے موبائل میں کچھ تلاش کرنے لگا...ہم سب ٹی وی پر اُس کے کسی چیز کو موبائل میں تلاش کرنے کو دیکھ رہے تھے اور جیسے دم بخود تھے بلکہ میں تو سوچ رہا تھا کہ اچھا ہوا یہ بچے اسی طرح بہلتے ہیں تو یوں ہی سہی...اتنے میں مٹھو مجھ سے آکر لپٹ گیا...تو سدرہ بسورتی ہوئی بولنے لگی...

'پاپا...اماں کا کوئی قصور نہیں ہے...ہم تینوں نے سوچا تھا کہ بڑی پھوپھو کو تنگ کریں گے...ہم نے چھپ کر یہ پلان بنایا تھا...سوری پاپا...غلطی ہوگئی ہے...بہت سوری...!'

'لو اور سنو...یہ حال ہے آج کل کے بچوں کا...بڑوں کا کوئی لحاظ نہیں...اپنی پھوپھو کو ہی سبق سکھانے لگے...بھلا بتاؤ...؟ اور وہ جو تمہاری پاگل سوتیلی ماں نے میری قمیض پھاڑی؟ کیا یہ بھی تم لوگوں نے ہی اُسے کہا تھا؟ سُن لو تم سب...اب میں نہیں پالوں گی تم لوگوں کو...تمہارا باپ جب تک تیسری شادی کرکے تم لوگوں کے لئے کوئی نوکرانی نہیں لاتا میری بلا سے ایسے ہی رہنا...بھلائی کا زمانہ نہیں رہا...حد ہوگئی...یہ صلہ دیا میری اب تک کی محنت کا؟'

آپا جلال میں آگئیں...تیسری شادی...میرے دل پر لگ گئی...مٹھو چیخ اُٹھا...

'مجھے اماں چاہئیں بس...پاپا...اماں...!'

'ہاں کیوں نہیں تاکہ وہ پاگل آکر تم سب کے بھی کپڑے پھاڑ...ننگا کرکے گھر سے باہر بٹھادے...جب ہی سکون ملے گا تم سب کو...ہماری محبت کا تو بدلہ لینے لگے...ہیں؟'

آپا کی للکار پر مٹھو پھر چیخ اُٹھا...

'وہ پاگل نہیں ہیں...تم ہو پاگل...!'

'مٹھو...چُپ کرو...بڑوں سے زبان چلائی...اماں کو بتاؤں گا دیکھ لینا...'

اب کی بار تیمور اپنے موبائل سے نظریں اُٹھا کر تیز لہجے میں بولا...مجھے حیرت ہوئی...ان بچوں کو کیا اب تک اُس کے پلٹ آنے...میرے اُسے واپس بلانے کی اُمید ہے...گو کہ مجھے بھی آپا کا بار بار اُسے پاگل کہنا بُرا لگ رہا تھا مگر بہرحال اُس نے جذبات میں آکر جو کر دکھایا ہے وہ ناقابلِ معافی ہے...آخر اس سے پہلے بھی تو بچوں نے آپا کے ساتھ بدتمیزی کی تھی...آپا بھی ناراض ہوتی تھیں مگر شکر کہ کبھی نوبت ہاتھا پائی تک نہیں پہنچی تھی...میں پھر سے خود کو ویسا ہی بے بس پا رہا تھا جب بچے اور آپا کے درمیان زبانی جنگ چل رہی ہوتی اور میں کسی کا بھی ساتھ دینے یا انصاف کرنے سے ڈرتا تھا...

اچانک ایک ویڈیو چل پڑی...

یہ ہمارے ہی لاؤنج کا منظر تھا:

آپا کسی بات پر مٹھو کو ڈانٹ رہی تھیں اور مٹھو اچھل اچھل کر اُن کو چڑا رہا تھا کہ اچانک آپا کا ہاتھ اُٹھ گیا...انہوں نے بے دھڑک دونوں ہاتھوں سے مٹھو کو پیٹنا شروع کردیا...سدرہ جو قریب ہی بیٹھی شاید مٹھو کے آپا کو چڑانے پر تالیاں پیٹ رہی تھی...آپا کے ہاتھ چھوڑ دینے پر مٹھو کو بچانے بڑھی کہ آپا نے اُس کے بالوں کو مٹھی میں لے کر کھینچنا شروع کر دیا...اب مٹھو کے ساتھ ساتھ سدرہ بھی چیخنے لگی کہ اتنے میں وہ جو شاید باورچی خانے میں تھی گھبرائی ہوئی سی ہاتھ میں بیلن لئے پہنچ گئی...اب جس طرف سے ویڈیو بن رہی تھی اس زاویے سے کیمرے کی آنکھ کی طرف اُس کی پشت تھی اور چہرہ نظر نہیں آرہا تھا صرف آپا کا غیظ و غضب ہی دکھائی دے رہا تھا...اُس نے جلدی سے آپا کے ہاتھ میں جکڑے سدرہ کے بال چھڑائے ہی تھے کہ آپا نے غصے سے اُس کے ہاتھ سے بیلن کھینچ لیا اور مٹھو پر وار کرنے دوڑیں...اُن کو روکنے کے لئے اُس نے آگے بڑھ کر جو آپا کو پکڑنا چاہا تو آپا کی آستین ہی ہاتھ میں آئی جو دوسرے ہی لمحے میں چرر کرکے کندھے سے پھٹ گئی...آپا نے پلٹ کر بیلن اُس کے سر پر زور سے دے مارا اور پھر مٹھو کی طرف بڑھیں مگر اب تک مٹھو کو وہ اپنے پیچھے کرچکی تھی...اب آپا نے پہلے تو اپنی پھٹی ہوئی آستین دیکھی اور پھر اُس پر بیلن کا ایک اور وار کرنے لگیں مگر اب تک وہ مٹھو کو لئے اُن کی پہنچ سے دور ہوچکی تھی...جس کے باعث بیلن ہوا میں جھولتا رہ گیا...آپا جب کچھ نہ کرسکیں تو حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگی تھیں...

'تو پاگل...خود کو سمجھتی کیا ہے...میرا بھائی کس طرح تجھے برداشت کررہا ہے...ایک تو احسان کیا تجھ پاگل کو یہ اعلیٰ گھر رہنے کو دیا اوپر سے تو مجھ پر ہی وار کرنے لگی...پاگل عورت...'

اس کے بعد آپا کے ہر ایک جملے میں ہر ایک لفظ کے بعد کوئی چار پانچ بار لفظ پاگل آتا...وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اور سدرہ اُس کے پاس کھڑی شاید

بی بی کا مقبرہ

''بی بی کا مقبرہ'' اورنگزیب کی ملکہ دل رس بانو کی جائے تدفین ہے جسے ان کے صاحبزادے نے تعمیر کرایا تھا یہ تاج محل کی مکمل تصویر ہے پوری اردو شاعری میں ''ایلورا'' اور ''بی بی کا مقبرہ'' پر سکندر علی وجد کے علاوہ کسی اور نے نہیں لکھا۔ اورنگزیب عالمگیر سے موسوم اورنگ آباد نظام کے دکن کا کیسا مردم خیز شہر تھا اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی دکنی سراج اورنگ آبادی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسی ہمالہ صفت شخصیات نے یہیں جنم لیا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے جس مکان میں آنکھ کھولی تھی اب بھی موجود ہے اور اسے وہاں کی جماعت اسلامی نے شاندار یادگار میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ حمایت علی شاعر بھی یہیں سے ہجرت کر کے پاکستان گئے تھے اورنگزیب عالمگیر یہاں سے سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر خلد آباد میں آسودۂ خاک ہیں۔ (اردو میگزین)

مجھے فون لگا رہی تھی... سدرہ نے مجھے بتا کر فون اُس کی طرف بڑھایا تھا کہ آپا نے جھپٹ کر فون چھین لیا اور پھر جب اُس کی باری آئی تو مجھ سے بات کرتے ہوئے وہ ہکلائی کچھ بھی نہ بول سک رہی تھی... جیسے ہی فون بند ہوا وہ آناً فاناً لاؤنج سے نکل گئی... آپا ابھی بھی چیخ چیخ کر اُسے پاگل پاگل پکار رہی تھیں اور پھر... ویڈیو بند ہو گئی...

میں ایک دم خواب سے جاگ گیا... آپا بھی جز بز سی ہو کر کمرے سے نکل گئیں اور تیمور مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھتا... سدرہ اور مٹھو کو لے کر چلا گیا... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہوا ہے... میں نے اُس پر تو کبھی بھروسہ نہیں کیا مگر اپنے بچوں پر بھی اعتماد نہیں کیا تھا... میں جانتا تھا مگر انجان بنا رہتا تھا کہ آپا جو بھی میرے بچوں کے ساتھ کر رہی ہیں وہی ٹھیک ہے اور اب جبکہ میری زندگی نے خوشگوار کروٹ لے لی تھی میں کتنی آسانی سے سب کچھ چھوڑ دینے پر تیار تھا... جس نے اس قدر میرا مان رکھا... اپنے وعدے پر قائم رہی... بس ایک ہی جھٹکے میں کس طرح میں نے اُسے اُس کی تمام تر محنت کا صلہ چھوڑ دینے کا کہہ کر اُس کے منہ پر مار دینے کا فیصلہ سُنا دیا تھا... یعنی وہ سب کچھ کر کے بھی میرا اعتماد نہیں جیت سکی تھی اور آپا بہت کچھ کر کے بھی میرے لئے قابل بھروسہ تھیں... مجھے خود سے شرم آنے لگی... میں نے چاہا کہ ساس صاحبہ کو تو کم از کم فون کر کے معافی مانگ لوں مگر شرمندگی اور اپنی انا کی جنگ میں کچھ ایسا مصروف ہو گیا کہ دو چار دن اُن کو فون نہ کر سکا... سدرہ اور تیمور مجھ سے بول چال بند کر کے بیٹھے ہوئے تھے... آپا بھی سہمی سی اِدھر اُدھر رہتیں اور گھر کا ماحول بہت سرد ہو رہا تھا کہ اچانک مٹھو نے کھانا چھوڑ دیا اور ضد پر اڑ گیا کہ اماں کے ہاتھ سے کھائے گا... اماں کے پاس لے کر چلو...

میں نے آخر کار تھک ہار کر ساس صاحبہ کو فون کیا تو معلوم چلا کہ اُس کو ایسا دورہ پڑا ہے کہ اُسے ہسپتال میں داخل کروانا پڑ گیا ہے... میں اور بھی شرمندہ ہو گیا کہ جب میں نے شکایت کی کہ مجھے کیوں نہ اطلاع کی تو ساس صاحبہ نے روہانسی ہو کر جواب دیا کہ جب میں اُسے چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا ہوں تو اب بھلا اُس کی زندگی موت کے بارے میں اطلاع پا کر کیا کروں گا...؟

میں زندگی میں پہلی بار اپنی دو ٹوک فیصلہ سُنانے کی عادت پر بہت نادم ہو رہا تھا... کچھ رشتوں کے لئے رویوں میں لچک رکھنی پڑتی ہے ورنہ نقصان سب کا برابر ہوتا ہے... ساس صاحبہ کی مایوس باتیں سُن کر میرے حواس کھو گئے... یہ کیا کہہ دیا انہوں نے ...اُس کی زندگی اور موت کی اطلاع...؟

اگر وہ مر گئی تو کیا میں کبھی بھی خود کو معاف کر سکوں گا؟

بچوں اور آپا کو بتائے بغیر میں گھبرا کر اُسی وقت ہسپتال کے لئے نکل گیا... اُس کو آج ہی جنرل وارڈ میں بھیجا گیا تھا... اُس کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا اور دہانہ ابھی تک تھوڑا ٹیڑھا لگ رہا تھا... سانس بھی تھوڑی تھوڑی دیر میں اٹک سا جاتا... کیونکہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا اور رات بھی کافی ہو گئی تھی تو وارڈ میں جو چند ایک مریض تھے جو اسی طرح کی بیماریوں میں مبتلا تھے اپنے منہ پر چادر ڈالے بے خبر سو رہے تھے... یہ تو مجھے معلوم تھا کہ رات میں نیند کی گولی وہ بھی لیتی تھی... مگر مجھے دیکھ کر وہ اپنا سر جھٹک جھٹک کر جاگے رہنے کی کوشش کر رہی تھی...

'میں نے سوچا تھا کہ میں دنیا کو دکھا دوں گی... میں بھی ایک فعال انسان بن کر اسی دنیا میں کہنے کو نارمل لوگوں میں بالکل ان کی طرح نارمل زندگی گزار کر اپنا آپ منوا لوں گی... میں پاگل نہیں...

آپ نے تو مجھ پر احسان کیا... ایک ناتجربہ کار کو اس قدر اہم کام کرنے کو دیا... گھر... آپ کے بچے... آپ کا ہی ہے سب... میں نے بہت محنت... بہت جانفشانی سے مقابلہ کیا... بہت کوششیں کیں... کتنی ہی بار خود کو سنبھالا... مگر پھر بھی... میں اس دنیا کے داؤ پیچ کو نہ سہہ سکی... میں بُری طرح ہار گئی ہوں... بالکل ناکام ہو گئی ہوں... میں کچھ نہیں کر سکتی... نا اہل... تھی... نا اہل ہی رہی...'

وہ سسکی بھر کر بچوں کی طرح ہتھیلی سے آنسو پونچھنے لگی... میں نے پہلو بدلا...

'آپ واپس چلے جائیں... آپ نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے... میں کبھی بھی ایک نارمل انسان کی طرح نہیں جی سکتی... میں کسی کے کام کی نہیں... میں کچھ نہیں کر سکتی... میں...'

وہ تو رو ہی رہی تھی میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے... میں اُس کی اس قدر مایوس باتیں سُننے تو یہاں نہیں آیا تھا... کوئی اُمید... کوئی دلاسہ... میں گلا کھنکھار کر ایسے گویا ہوا جیسے اب تک میں نے اُسے سُنا ہی نہ ہو... جیسے اب تک اُس نے کچھ بھی نہ کہا ہو۔

'بچے تمہارے لئے بہت پریشان ہیں... مٹھو نے کھانا چھوڑ دیا ہے... تم تیار رہنا میں کل شام کو اُن لوگوں کو تم سے ملانے لاؤں گا...'

میں نے اُس کے دوبارہ بولنے سے پہلے ہی کہہ دیا... گو کہ اس سے پہلے میرے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ میں اُس کو واپس لے جاؤں گا یا چھوڑ ہی دوں گا... اور نہ ہی بچوں کو ملانے کا ہی کوئی ذہن میں خیال تھا... وہ دو چار لمحوں کے لئے جیسے دم بخود مجھے دیکھتی رہ گئی اور پھر گھبرا گئی...

'نہیں پلیز نہیں... بچے مجھے اس طرح دیکھیں گے تو کیا کہیں گے...؟ نہیں... پلیز...''

وہ نقاہت سے اپنا دہانہ سہلاتے ہوئے التجا کرنے لگی...

'ڈاکٹر نے تو یہی کہا ہے کہ کل تک تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی اور اگر تم کو بچے ایسے دیکھ بھی لیں گے تو مجھے ہی قصوروار سمجھ کر تم سے اور محبت کریں گے اور کیا...؟'

میں نے اُس کو دلاسہ دیا اور پھر اُس کو تھوڑا اور اعصابی آرام دینے کے لئے گھر کی باتیں بتانے لگا کہ کس طرح اُس کے جاتے ہی تیمور اور سدرہ مجھ سے ناراض ہو گئے اور بات نہیں کر رہے اور شاید جو

مٹھو نے کھانا چھوڑا ہے وہ بھی اُن دونوں کا سکھایا پڑھایا ہوا ہے کہ مٹھو کو چاکلیٹ دو اور وہ ہڑپ نہ کر جائے ہو ہی نہیں سکتا... میں نے جان بوجھ کر ویڈیو والی بات نہیں بتائی مگر یہ ضرور بتا دیا کہ بچے اب آپا سے بہت تمیز سے پیش آ رہے ہیں اور گھر میں امن سے رہ رہے ہیں... آپا کے نام پر اُس نے جھرجھری لی تھی اور کچھ بولنے کے لئے منہ کھولا تھا مگر پھر چپ ہو گئی... میرے ذہن میں پوری ویڈیو ایک بار پھر چل گئی... میں نے محبت سے آگے بڑھ کر تکیہ پر بکھرے اُس کے بالوں کو سمیٹ کر ایک طرف کیا اُس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا... اور دہانے کو ہلکے سے ہلایا جھلایا تو وہ مسکرا گئی...

'اب تم سو جاؤ... رات میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ورنہ میں تمھارے پاس ہی رہتا... گھر پر بھی بتا کر نہیں آیا ہوں... کل ملتے ہیں انشاءاللہ... بس تم ہمت کرو... خود کو سنبھالو!'

'بچے بھی آئیں گے ناں...؟'

اُس نے خوشی سے پوچھا... تو میں مسکرا کر اثبات میں سر ہلانے لگا...

دوسرے دن حسبِ وعدہ میں بچوں کو لے کر پہنچ گیا اور دل میں سوچ لیا تھا کہ آج ہی اُس کو فیصلہ بھی سُنا دوں گا... یہی کہ اب میں بھی دنیا کو دکھانا چاہتا ہوں کہ جہاں جسمانی بیماریوں میں مبتلا جیون ساتھی کو بیچ راہ میں نہیں چھوڑا جاتا وہیں دماغی بیمار ساتھی بھی پیارا ہو جاتا ہے... ہم دونوں مل کر چاہیں تو زندگی اچھی اور بہت اچھی گزار سکتے ہیں... اس قدر مشکل بھی نہیں... بس تھوڑی ہمت کرنی پڑے گی...

میں نے چونک کر بچوں کا جائزہ لیا...

تیمور اُس کے پہلو میں بیٹھا اپنے موبائل پر کھیل رہا تھا جبکہ سدرہ... سرہانے بیٹھی اُس کا سر دبانے لگی تھی اور مٹھو اُسی طرح اُس سے چمٹا ہوا تھا باقاعدہ جھول رہا تھا... وہ اب اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اُس سے سب کچھ کس طرح کہوں...

اتنے میں مجھے ایک نرس نے آ کر اطلاع کی کہ اُسے ڈسچارج کر دیا گیا ہے لہٰذا بقایا بل کے پیسے دے کر میں چاہوں تو اُسے گھر لے جا سکتا ہوں... یہ سُنتے ہی وہ گھبرا گئی اور تیمور کو کہنے لگی کہ نانی اماں کو فون کر کے بُلا لے...

'اُن کو کیوں تکلیف دے رہی ہو... اب اس عمر میں وہ بچاری کہاں اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ کے چکر لگائیں گی... میں بل دے دوں گا...'

میں نے اُسی طرح اپنی بارعب آواز میں کہا تو اُس کی آنکھیں چھلک گئیں...

'وہ اصل میں... گھر بھی تو جانا ہے ناں... امی جان آ جائیں تو مجھے لے جائیں... میں... میں خود سے نہیں جا پاؤں گی...'

اُس کے لہجے کی مایوسی ایک دم مجھے بھی بے چین کر گئی... میں اب کی بار نرم لہجے میں گویا ہوا...

'وہ کیوں لے کر جائیں گی... تم کوئی ایسی بیمار نہیں کہ میکے جا کر آرام کرو... میں نے پوچھ لیا ہے ڈاکٹر سے... تم کو اگر ذہنی اور جسمانی آرام چاہیے تو اُس کے لئے میں آفس میں چند دن کی رخصت کا کہہ چکا ہوں... اب تم سکون سے اپنے گھر پر چل کر آرام کرو اور یہ... دونوں... تیمور اور سدرہ... یہ تمہاری خدمت کریں گے...'

یہ کہتے کہتے میری نظر جھک گئی جیسے کوئی مجرم اقرارِ جرم پر شرما جائے... تیمور اور سدرہ ایک دم کھل گئے تھے... اُس نے میری شرمساری کو محسوس کر کے فوراً سے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا اور میں... فولادی ارادوں والا... لوہے کی طرح مضبوط... اپنے مقناطیس کی طرف بے اختیار بڑھ گیا...! ☆☆

افسانہ

انیلا طالب

عشقِ بے ثمر

کسی انسان کی محبت میں اپنے آپ کو فنا کر لینا کم عقلی ہے اور کنیز بی بی بھی اولاد کے دکھ کے آگے ہار گئی اور جان گئی کہ بے وقوف کو اسی لیے بے وقوف بنایا جا سکتا ہے......

''کر دیا ماں تو نے مرشد سائیں کا کام یا ابھی تک کاہلوں کی طرح لہسن پیاز چھیلے جا رہی ہے؟'' کنیز بی بی نے مرشد سائیں کی ایک مریدنی سے پوچھا تھا جو اس کے ساتھ ہی آستانے میں کام کرتی تھی اور کتنی ہی دیر لگا کر ایک کام کرتی تھی۔ لنگر پکانا ہوتا تو کنیز بی بی بچی دوپہر میں مرشد سائیں کے آستانے کے صحن میں گڑی تندوری پر پرات بھرے آٹے کی روٹیاں لگا کر چنگیر بھر لیا کرتی تھی مگر جمیلہ ابھی تک گوشت بھوننے سے فارغ نہ ہوئی۔ جمیلہ تو کیا آستانے میں کام کرنے والی بیس مریدنیاں بھی ایس طرح ہاتھ نہ چلا سکتی تھیں۔ جیسے کنیز بی بی چلاتی تھی تمام مریدنیاں جانتی تھیں کہ کنیز بی بی کو مرشد سائیں سے دلی عقیدت ہے اس بات کا واضح ثبوت یہ تھا اس نے سینکڑوں دابڑے بھر کے آستانے کا صحن برابر کیا تھا صحن کی دیواریں بھی اس کی محنت اور اس کے شوہر کی محنت سے لیپی گئی تھیں ہر سال ہونے والے عرس کے موقع پر اپنے گھر سے چارپائیاں اور بستر لانا سارے آستانے کا مٹی سے لیپ کرنا گھر کی پالتو بکریاں نذرانے کے طور پر دے دینا اور بیس تیس من گندم کا مریدنیوں کے ساتھ مل کر صاف کرنا آٹا پسوانا پھر جان جوکھوں میں ڈال کر وسیع لنگر پکانا یہ سب مرشد سائیں سے اس کی دلی وابستگی کا ہی تو ثبوت تھا آج مرشد سائیں کا آستانہ خوب چمک رہا تھا۔ ان کا کمرہ چٹائی سے ڈھک کر اپنے جہیز کے خوبصورت کھیس کو تہہ کر کے وہ مرشد سائیں کی بیٹھنے کے لیے نرم جگہ تیار کر چکی تھی اردگرد دائیں بائیں اس نے گولڈن موتیوں سے بھرے ویلوٹ کے دو سرخ گاؤ تکیے جو اسے اماں نے بڑے چاؤ سے جہیز میں دیے تھے۔ میز پر پڑی تمام چیزوں کو کنیز بی بی نے اپنے پھول دار دوپٹے کے پلو پھیر پھیر کر صاف کیا تھا تعویذ لکھنے کے لیے استعمال ہونے والی سیاہ دوات کی شیشی سے لے کر کمرے میں لگے چاروں قل کے طغرے تک اچھی طرح صاف کیے ہر چیز ٹھکانے پر رکھی کاغذوں کا دستہ اپنی جگہ پر رکھا۔ کھیس پر عطر لگایا اور کمرے میں اگر بتیاں سلگا کر کنیز بی بی باہر لنگر کا انتظام سنبھالنے چلی آئی تھیں۔ جمیلہ سے اس نے مرشد سائیں کے لیے کالی مرچ ہاون دستے میں کوٹنے کو کہا تھا اور خود لنگر کے لیے آیا ہوا فارمی مرغی کا ڈھیروں گوشت صاف کرنے لگی تھی۔ اس نے آدھا گوشت دھو لیا تھا تقریباً جب اس کی نظر پڑی تھی جمیلہ پر وہ لہسن پیاز اور سبز مرچیں ٹماٹر کاٹتی لنگر کا مسالا تیار رہی تھی۔

مرشد سائیں کا کام کر دیا تھا ناں تم نے'تل بند کرتے کرتے کنیز بی بی نے فکرمندی سے پوچھا وہ دوبارہ پوچھ چکی تھی پہلے بھی۔

ہاں ہاں کنیز اتنا پریشان کیوں ہوتی ہے تو مرشد سائیں کے لیے ہیں نے اسی وقت مرچیں پیس لی تھیں۔ پیاز کاٹتے ہوئے جمیلہ نے بتایا تو کنیز بی بی نے اطمینان بھرا سانس لیا پہلے شاید جمیلہ نے نہیں سنا تھا ورنہ وہ پہلے ہی بتا دیتی۔

مرشد سائیں سرخ مرچیں نہیں کھاتے تبھی تو میں نے سیاہ پسوائی ہیں اب غلطی سے بھی یہ فارمی گوشت میں دیسی نہ ملا دینا وہ بھی ذرا نہیں چکھتے وہ...... کنیز بی بی نے اسے ہدایت دیتے دونوں طرح کا گوشت خوان سے ڈھک کر چولہے کے پاس رکھا اور خود باورچی خانہ سے آ گئی۔

کنیز کہاں جا رہی ہے تو یہ منوں گوشت مجھ سے تو نہیں پکے گا تجھے تو سارا حساب ہے نا مرچ مسالے کا۔

جمیلہ نے گھبرا کر اسے کہا تھا کہ وہ اتنی بڑی ذمے داری اپنے نحیف کاندھوں پر کیسے لے سکتی تھی۔

کہیں نہیں جا رہی میں...... آواز نہیں آ رہی تجھے مرشد سائیں کا بچہ کیسے ہنکارے بھر بھر کر رو رہا ہے۔ بی بی جی پاس نہیں ہیں تو دیکھ لو کسی نے اٹھایا تک نہیں اسے پنگوڑے سے۔ کنیز بی بی بڑی

عجلت سے اتنا کہہ کر آستانے کے زنانخانے کی طرف بڑھ گئی تھی مرشد سائیں کے بچے کا رونا وہ کب برداشت کرسکتی تھی۔ تبھی تو بھاگی چلی آئی۔

جب وہ آئی تو مرشد سائیں کی زوجہ اپنے لعل کو پنگوڑے سے نکال کر سینے سے لگائے تھپک رہی تھیں۔ کنیز بی بی سکون سے زنان خانے سے باہر نکل آئی اسے جلد سے جلد لنگر پکانا تھا۔ مرشد سائیں وقت کے پابند جو تھے۔ بڑی بے فکری سے مرشد سائیں کے آستانے میں وہ اپلے جلا کر لنگر پکانے میں مصروف تھی اور اس کا سات دنوں کا بچہ اکیلے گھر میں اپنی سات سالہ بہن فاطمہ کے ہاتھوں میں رو رہا تھا۔ اسے اپنی ماں کی ضرورت تھی...... فاطمہ کو اپنی ممتا کی تلاش تھی کام پر گئے اس کے شوہر کو اپنی بیوی سے توجہ چاہیے تھی مگر اس کے پاس مرشد سائیں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا اسے کسی کی فکر نہیں تھی کنیز بی بی کو کسی کی توجہ نہیں چاہیے تھی اور نہ ہی تلاش تھی اسے کسی کی۔ اسے بس مرشد سائیں کی تلاش تھی۔ اسے مرشد سائیں کی توجہ چاہیے تھی۔

☆......☆

کنیز فاطمہ کو تو چیک کرو کیسے بخار میں پھنک رہی ہے۔ جب سے میں کام سے آیا ہوں بے سدھ پڑی ہے بے چاری۔

مجید نے کنیز بی بی کو کن اکھیوں سے دیکھتے کہا تھا جو مرشد سائیں کے آستانے سے تھک ہار کر آئی تھی۔

میں کوئی بڑی ڈاکٹرنی نہیں ہوں جو اسے چیک کروں۔ کنیز بی بی نے طنزیہ لہجے میں جواب دے کر کروٹ بدل لی۔

ماں تو ہے نہ اس کی اور سیانے کہتے ہیں ماں سے بڑھ کر کوئی ڈاکٹر نہیں ہوتا۔

کنیز بی بی کا طنز نظر انداز کرتے وہ دودھ کا مگ منہ سے لگائے گھونٹ بھر کر بولا تھا۔

رہ گیا تو اتنا سیانا۔ چپ کر کے سونے دے مجھے سویرے سویرے نکلنا ہے میں نے مرشد سائیں کے آستانے کی طرف۔ کنیز بی بی نے بے پروائی سے کہتے ہوئے کھیس لپیٹ لیا تھا۔ مجید اسے دیکھتا رہ گیا۔

فاطمہ کا نہیں تو نکے سے محسن کا ہی خیال کیا کر چند دنوں کا بچہ چھوڑ کر روز آستانے بھاگ جاتی ہے۔ بچے ہیں تیرے، ان کے حقوق پورے کیا کر۔ بددعائیں کیوں لیتی ہے ان کی؟

مگ لبوں سے لگائے گرم گرم دودھ کی چسکیاں لیتا مجید اس کا رویہ مکمل طور پر نظر انداز کر کے اسے سمجھانے لگا

تو ناں مجھے سبق نہ پڑھایا کر بس کر دے یہ لڑائی ہاں کل ناں احسن کو تو لے آ نا بڑی دیر ہوگئی ہے اسے ددھیال رہتے ہوئے۔'' کنیز بی بی کی بات پر مجید نے لمحہ بھر کو رک کر اسے دیکھا پھر وہ بولا۔

اچھا کل لے آؤں گا۔ سہی ہے! پھر مجھے بھی فائدہ ہو جائے گا چل اور کچھ نہیں تو کام سیکھ لے گا میرے ساتھ مستریوں کا۔ دو پیسے ہی ودھ آ جایا کریں گے۔ مگ بان کی کھری چارپائی کے پائے کے قریب رکھتا مجید مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر لگا ہوا دودھ صاف کرتا اس کی جانب دیکھ رہا تھا کہ وہ بھی اس گفتگو میں اپنے شریک ہو شوہر سے بات کرے۔ رائے دے وہ یہی چاہتا تھا۔

چودہ برس کے لگ بھگ ہو چکا ہے وہ مرشد سائیں کے آستانے پر لے جاؤں گی سو مرید آتے ہیں وہاں چائے پانی ہی دے لیا کرے گا۔

کھیس چہرے سے ہٹاتے کنیز بی بی نے کچھ اس طرح بات کی تھی کہ مجید تلملا کر رہ گیا۔

ناں یہ بات ذہن سے نکال دے میرا پتر آستانے کی چوکیداری کرتا پھرے یہ بات نہیں گوارا مجھے۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھوں میں تو کپ پکڑا دے گی نوکروں کی طرح مریدوں کے آگے رکھے وہ ایسا نہیں ہوسکتا کنیز بی بی......

پیچ و تاب کھا کر انگارہ برساتی آنکھوں سے وہ کنیز بی بی کو دیکھتا ایک ایک لفظ چبا کے ادا کر رہا تھا تو نے جو اس کے ننھے ننھے ہاتھوں میں ہتھوڑے اینٹیں دا بڑے پکڑانے ہیں ان کا کیا۔ میرے کپ بڑے چبھ رہے ہیں تجھے کرماں والا ہے یہ تو اسے توفیق مل رہی ہے آستانے پر کام کرنے کی۔

کنیز بی بی کھیس ہٹا کر آلتی پالتی مار کے بیٹھی مجید کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کو تیار تھی۔

لڑنے مرنے کے لیے تو بڑی شیر ہے آگے ہی پتہ اسے اتنا مجھے، جا رہا ہوں میں فاطمہ کے لیے ڈاکٹر کے پاس دوائی لینے۔ مجید کنیز بی بی کو متحرک دیکھ کر جوتی پاؤں میں پہنتا تھوڑا سا پلٹ کر پھر بولا۔

اک گل یاد رکھنا کنیز پتر آستانے پہ کبھی نہیں جائے گا۔ اتنا کہہ کر وہ گولی کی سی رفتار سے صحن سے باہر نکل گیا۔

میں بھی دیکھتی ہوں وہ کیسے نہیں جاتا آستانے پہ...... کنیز بی بی کی شیرنی کی مانند بھری آواز نے مجید کا پیچھا دور تک کیا تھا۔

☆......☆

اگلے ہی دن مجید احسن کو گھر لے آیا تھا جمعہ کی وجہ سے اس کی چھٹی تھی اس لیے ملگجے اندھیرے سے پہلے ہی وہ احسن کو لیے گھر آ گیا۔ گھر کے دروازے سے جب باپ بیٹا داخل ہوئے کنیز بی بی دابڑے میں پانی بھر کے سالن کی دیگچی اس میں رکھ رہی تھی۔ فریج نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس طرح ہی سالن کو خراب ہونے سے بچایا کرتی تھی۔

ست بسم اللہ۔ میرا پتر آ گیا۔

اس پر نظر پڑتے ہی کنیز بی بی نے والہانہ انداز میں احسن کی پیشانی کو چوما۔ چارپائی پر بٹھایا۔ فاطمہ بھی کنیز بی بی کی طرح احسن کے اردگرد منڈلا رہی تھی اپنا یہ بھائی اسے بہت عزیز تھا تبھی تو فاطمہ کو گاؤں کے بھٹے والے سے مکئی کا بھٹہ لا کے دیا کرتا مزیدار ٹافیاں بھی تو یہی کھلاتا تھا۔

محسن تو بس چارپائی پر پڑا رہتا تھا نہ باتیں کرتا نہ اس کے لیے چیزیں لاتا ابھی چند دنوں کا ہی تو تھا وہ تبھی اسے احسن پسند تھا اب بھی جب تک کنیز بی بی احسن اور مجید کے لیے رات کا کھانا لائی تھی فاطمہ احسن کی گود میں چڑھی ہوئی تھی بالکل ننھے بچوں کی طرح۔ ''کنیز'' پتر تیرا اتنی دیر بعد آیا ہے ڈربے سے کوئی دیسی مرغی ہی نکال کر ذبح کر کے پکا لیتی۔

بھنڈی توری کے ساتھ سادہ چپاتیاں کھاتے مجید نے شکوہ سا کیا تھا۔

ایسے ہی مرغ کر لیتی۔ وہ تو میں نے مرشد سائیں کے لیے رکھا ہے اتنا کھلایا پلایا ہے احسن کو تو ویسے بھی مرغے کا گوشت پسند نہیں ہے۔''

کنیز بی بی نے باپ بیٹے کو پانی دیتے وہی بات کی جس کی وجہ سے مجید چڑ جاتا تھا۔

بکریاں مرشد سائیں کے لیے۔ مرغیاں مرشد سائیں کے لیے۔ ہمارا کیا ہے اس گھر میں؟ ہیں بتا ناں ذرا؟

مجید نے توڑا ہوا لقمہ بھی چنگیر میں رکھ دیا احسن جس لڑائی سے بچنے کے لیے دو ماہ بڑے تایا کے پاس سیالکوٹ رہ کے آیا تھا وہی لڑائی اس کے آنے کے چند گھنٹوں بعد ہی شروع ہو چکی تھی۔

رب سے ڈر احسن کے ابا، بزرگوں کے بارے میں ایسی زبان استعمال کریں تو اللہ زبان کھینچ لیا کرتا ہے، یہ سارا کچھ مرشد سائیں کی ہی تو بدولت

ہے۔

دھمکی کے انداز میں کنیز بی بی نے ایک نظر روٹی کھاتے احسن اور فاطمہ پر ڈالی اور پھر مجید پہ نظریں گاڑ دیں۔ چل اب شروع نہ ہو جانا۔

بچہ تھکا ہارا آیا ہے۔ رکشوں اور ویگنوں پہ کیا جان کھا رہی ہے سب کی۔

اس کا غصہ دیکھتے مجید کو بھی نرم پڑنا پڑا۔

چھڈ ساری باتیں پتر تو یہ بتا کل سے جایا کرے گا ناں مرشد سائیں کے آستانے؟

کنیز بی بی مجید کے موڈ کی قطعی پرواہ کیے بغیر احسن سے پوچھ رہی تھی۔

تجھے سمجھایا بھی تھا پہلے کنیز بی بی میرا پتر آستانے پر نہیں جائے گا۔

مجید عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولا۔

"اماں تو تو پہلے ہی وہاں چلی جاتی ہے اب احسن بھی چلا جائے تو میں کیسے رہوں گی' ادھر اس گھر میں؟

فاطمہ نے معصومیت سے کہا تو کنیز بی بی نے جھڑک کر خاموش کرا دیا

اچھا، چل کنیز اپنے پتر سے پوچھ لیتے ہیں جدھر اسے کہے گا ادھر ہی اسے کام پہ لگا میں گے۔

مجید نے مسئلے کو حل کرنے کا فارمولا بتایا۔ کنیز بی بی سمیت سب کی توجہ احسن کے چودہ سالہ چہرے پر تھی۔

مجید بڑے مان سے اسے دیکھ رہا تھا اسے احسن سے یہی توقع تھی کہ وہ کچھ ایسے جملے کہے گا

چھڈ اماں میں کیوں نوکر بن کے آستانے پر رہوں؟ رہندے میں نہیں جاتا ادھر مرشد کے پاس۔

اماں تو ٹھیک کہہ رہی ہے مجھے مرشد سائیں کے پاس ہی جانا چاہیے۔

مجید اور فاطمہ حیرت زدہ رہ گئے۔ مجید کو تو جیسے چپ لگ گئی تھی، اس کی توقع پر پانی پھیر دیا تھا احسن نے۔

ماں صدقے جائے یہ کیا ناں تو نے سیانے والوں کا کام۔

کنیز بی بی نے کھل کر جھٹ سے اسے سینے لگایا۔

احسن کو مزدوری سے زیادہ آسان کام یہی لگا تھا پھر وہ لنگر خانے کے مزیدار کھانوں سے واقف تھا اسی لیے اس نے آستانے پر کام کرنے کی ذمہ داری سنبھالنے میں ہی عافیت جانی۔

مجید نے احسن کی بات سن کر ایک لفظ تک نہیں نکالا زبان سے۔ جب اس کا بیٹا راضی تھا تو اس کے انکار کی کوئی وجہ باقی نہ رہی تھی اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

بات ختم ہو گئی تھی مجید کے گھر میں صحن کی چھوٹی سی کیاری میں رات کی رانی کی مہک چہار سو پھیلی ہوئی تھی۔

چاندنی نے سارے صحن میں روشنی کر رکھی تھی کنیز بی بی پہلو میں ننھے منے محسن کو لٹائے دوسری طرف لیٹی فاطمہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے پھیرتے کب اس خیال سے نیند کی وادی میں چلی گئی اسے پتہ ہی نہ چلا خیال یہ تھا کہ سو جاؤں صبح منہ اندھیرے کام نپٹا کے مرشد سائیں کے آستانے کی طرف جانا ہے۔

☆......☆

فاطمہ کریانے کی دوکان پر چیز لینے گئی ہوئی تھی مجید مزدوری پر اور کنیز بی بی احسن کو ساتھ لیے مرشد سائیں کے آستانے کی طرف گئی تھی محسن صحن کی دیوار کے قریب چارپائی پہ لیٹا زور زور سے ہاتھ پاؤں ہلاتا مسلسل ریں ریں کر رہا تھا ننھی فاطمہ تو اس کی حفاظت نہیں کر سکتی تھی نہ دادی تھیں، نہ پھوپھیاں جو

اس ننھے کی دیکھ بھال کرتیں۔ کنیز بی بی خود جانے سے پہلے ایک فیڈر بنا کر اسے دے جایا کرتی فاطمہ کو محسن کے پلانے کے لیے کپڑے کی مدد سے یعنی دوپٹے کو جھولنا بنا کر محسن کو اس میں لٹا جاتی فاطمہ اسے سارا دن جھلاتی رہتی چارپائی کے ساتھ بندھی دوپٹے کی جھولنگی سے فاطمہ نے اسے نکالا تھا اس کا لنگوٹ گیلا ہو گیا تھا۔ پڑوس کی شبانہ اکثر چھت سے جھانکتی اور محسن کا لنگوٹ تبدیل کر دیا کرتی تھی یہ وہ اس لیے کرتی تھی کہ کنیز بی بی اس کی برسوں کی سہیلی تھی فاطمہ سے اگر محسن نہ سنبھلتا تو شبانہ اسے سنبھال لیتی۔"

م......مر گئی...... میں۔ شبانہ نے جب محسن کا رونا تیز سے تیز ہوتا سنا تو چھت پر چڑھ کر کنیز بی بی کے صحن کی طرف جھانکا تھا۔ ابھی وہ مہمانوں سے فارغ ہوئی تھی۔ صحن کا منظر اس کا دل دہلانے کو کافی تھا۔ محسن کے اوپر بکری لیٹی ہوئی تھی اور محسن ہاتھ پاؤں ہلاتا اس کے نیچے دب گیا تھا۔ کنیز بی بی جاتے وقت ہدایت کر گئی تھی کہ فاطمہ جب دھوپ تیز ہو جائے محسن کو اندر لے جانا اور جو اس کے پائے کے ساتھ بکری بندھی ہے اسے چھاؤں میں باندھ دینا۔

بچپنے کی لاپرواہی کے ہاتھوں نہ ہی اس نے محسن کو اندر لٹایا نہ ہی بکری کو اس طرف باندھا جہاں چھاؤں رہتی تھی۔ شبانہ کے گھر مہمان آئے تھے صبح سے اس نے بھی چھت سے نہیں جھانکا۔ کنیز بی بی نے مرشد سائیں کے لیے رکھی یہ بکری لاڈ سے ایسے پالی تھی کہ وہ زمین پر سونے کی بجائے اکثر چھلانگ مار کر چارپائی پر چڑھ کے کنیز بی بی کے ساتھ ہی لیٹ جایا کرتی تھی۔ بکری کی رسی دراز تھی وہ اپنے معمول کی طرح ستانے کے لیے اس چارپائی پر لیٹی جہاں محسن لیٹا ہوا تھا۔

کیا کروں اب سیڑھی بھی ہے کہ نہیں ادھر ہانپتے کانپتے وجود سے شبانہ نے تیز دھڑکن کے ساتھ عجلت میں لکڑی کی سیڑھی دیوار کے ساتھ کھڑی دیکھ کے پاؤں رکھا اور پھر وہ فاطمہ کو زوردار آوازیں دیتی بھاگ کر محسن کی طرف لپکی۔ محسن کا سانس بہت آہستہ چل رہا تھا چند دنوں کا بچہ اتنا بوجھ کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ شبانہ نے اس کے گال تھپتھپائے۔ وہ آنکھیں موند چکا تھا۔ محسن...... آنکھیں کھول۔" شبانہ نے گھبرا کر اس پر پانی کے چھینٹے ڈالے۔ پھر اس نے جیسے ہی دھڑکن محسوس کرنے کے لیے ہاتھ اس کے دل پر رکھا۔ وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹی محسن کا دل خاموش تھا۔ بالکل خاموش......

ارے کوئی بلائے کنیز کو...... شبانہ روتے ہوئے چلائی۔ اتنی دیر میں فاطمہ بھی آ گئی۔

'مر گیا فاطمہ تیرا بھائی' ارے جائے کوئی بلا کے لائے کنیز کو۔

وہ سینے پر ہاتھ مارتی بین کرتی بولی...... پتر مر گیا تیرا کنیز...... آ جا آستانے سے...... ایک بار منہ دیکھ لے اس کا جو تیرے پیار کو ترستا چلا گیا ...... شبانہ فاطمہ کو سینے سے لگائے ہذیانی انداز میں کہہ رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد سارا گھر لوگوں سے بھر گیا ...... فاطمہ اور احسن بلاتوقف رو رہے تھے۔ مجید کی تو جیسے دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ کتنا مان تھا اسے اپنے بیٹوں پر۔ اب اس کی جوڑی اکیلی رہ گئی تھی۔ کنیز بی بی چار دن تو غم سے بجھی بجھی رہی پھر جب مرشد سائیں تعزیت کے لیے آئے تو وہ پھر سے سب کچھ بھول گئی۔ محسن کے مرنے کے دس دن بعد وہ پھر باقاعدگی سے احسن کے ساتھ آستانے میں جانے لگی۔ زندگی معمول کی طرح چلنے لگی۔ فاطمہ زیادہ تر

وقت شبانہ کے گھر گزارتی سپارہ پڑھتی اس سے اور ساتھ ہی نرسری کلاس کے ایک دو سبق لے لیتی۔ اسکول پڑھنے کا رواج نہیں تھا ان کے گھر میں۔ دونوں وقتوں کا کھانا کنیز بی بی مرشد سائیں کے آستانے سے لے کر آیا کرتی۔ گھر والے وہی کھایا کرتے۔ باقی گھر کا خرچہ مجید کی مزدوری سے چل جاتا۔ فاطمہ کی شادی کے اخراجات کے لیے مجید ایک گنی چنی رقم کنیز بی بی کو دیا کرتا تا کہ وہ اس سے کمیٹی ڈال لیا کرے۔ سال ہونے والا تھا کمیٹی نکلنے والی تھی۔ مجید اس رقم سے گھر کی حالت سدھارنا چاہتا تھا کہ پہلے گھر بار تو ٹھیک ہو پھر ساتھ ساتھ فاطمہ کا جہیز تھوڑا تھوڑا تیار کرتے جائیں گے مگر کنیز بی بی یہ رقم مرشد سائیں کو نذرانے میں دینا چاہتی تھی تا کہ عرس پر وہ بی بی جی کو سونے کا زیور پہنائیں اسے مرشد سائیں کی ہر چیز سے پیار تھا کیونکہ اس نے محبت نہیں عشق کیا تھا ان سے۔

☆......☆

مجید کے لاکھ سمجھانے کے باوجود کنیز بی بی نے کمیٹی کے پیسوں سے پچاس پچاس ہزار کے دو کڑے مرشد سائیں کی زوجہ کو بنوا کر دے دیئے تھے آستانے کے مردان خانے میں احسن ہاون دستے میں مرشد سائیں کی بتائی گئی چند چیزیں کوٹ رہا تھا اور کنیز بی بی باورچی خانے میں مرشد سائیں کے لیے قورمہ تیار کر کے اب شامی کباب بنا رہی تھی سوجی کا حلوہ چاندی کے ورق لگا کر فریج میں رکھ دیا تھا اس نے۔

وہ دو گھنٹے سے باورچی خانے میں سر کھپا رہی تھی۔ پہلے زنان خانے کی صفائی کی۔ پھر مرشد سائیں کے لیے خاصے اہتمام سے کھانا تیار کرنے لگی۔ گوشت ابلنے کے لیے رکھ کر وہ مردان خانے میں چلی آئی۔ مرشد سائیں وہیں اپنی نگرانی میں احسن سے کچھ کٹوا رہے تھے۔

میں نے ناں قورمہ، شامی کباب، حلوہ اور بہت چیزیں بنائی ہیں آپ کے لیے۔ کب کھانا کھائیں گے؟ کنیز بی بی نے مرشد سائیں کی انگلیوں میں سجی فیروزے اور یاقوت کے نگینوں والی انگشتریوں کو بغور دیکھتے بڑے ادب سے پوچھا تھا۔

کنیز تو نے ایسے ہی اتنی محنت کی میری دعوت ہے آج رخشندہ نے پکائی ہے۔ کیا ذائقہ ہے اس کے ہاتھ میں، کنیز بی بی سفید سوٹ میں ملبوس باریش مرشد سائیں کو دیکھے گئی۔ مرشد سائیں نے اپنی ٹوپی سیدھی کر کے اس انداز سے کہا تھا کہ کنیز بی بی کٹ کر رہ گئی۔ کتنی محنت سے اس نے مرشد سائیں کے لیے کھانا تیار کیا تھا۔ اس نے خود کو مریدنی کب سمجھا تھا وہ تو معشوقہ تھی مرشد سائیں کے سامنے۔ اس نے کبھی اپنی اس محبت کا اظہار نہیں کیا تھا ان کے لیے وہ ایک مریدنی کی طرح تھی۔ مگر وہ اپنے آپ کو مریدنی نہیں سمجھتی تھی وہ تو مرشد سائیں سے ایسے رویے کی طلب گار تھی جیسا رویہ دو پیار کرنے والوں کا ہوتا ہے دو محبت کرنے والے دلوں کا ہوتا ہے۔

مرشد سائیں۔ کاش میں آپ کو پا سکتی۔ کاش۔ دل ہی دل میں کہتی آنکھوں میں آنسو لیے وہ دکھی دل سے مردان خانے کی جگہ سے باہر نکل آئی۔

اس کا سینہ غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ احساس محرومی میں گھری کنیز بی بی بجھے دل سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆

فاطمہ خیر سے تیرہ برس کی ہو چکی تھی۔ شبانہ سے قرآن پاک اور اسلامی کتابیں پڑھنے کے بعد وہ کھانا پکانا بھی سیکھ چکی تھی۔ مجید نے اس کی نسبت فاطمہ کے تایا زاد حیدر سے کر دی تھی جو رکشہ ڈرائیور تھا معمولی شکل صورت، مڈل پاس مگر اچھا نیک اور سمجھ دار تھا۔ منگنی کے بعد کچھ سالوں میں اس کی شادی فاطمہ سے ہو جانی تھی۔

احسن بیس سال کا کڑیل جوان بن چکا تھا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی آ چکی تھی۔ وہ مرشد سائیں کے پاس حکمت سیکھ رہا تھا۔ قدرتی جڑی بوٹیاں اور نہ جانے کیا کیا وہ اس سے پسوا رہے تھے۔

یہ کام ختم کرنے کے بعد وہ مرشد سائیں کی بتائی ہوئی چیزیں بھی کوٹنے کے لیے لے آیا۔

مردان خانے میں ایک کونے میں بیٹھ کر وہ مرشد سائیں کے حکم کے مطابق دوائی بنانے کے لیے گندھک کوٹنے لگا یہ گندھک۔ دواؤں میں ڈالنے والی نہیں تھی بلکہ پٹاخوں میں ڈالنے والی تھی جسے اس نے لوہے کے ہاون دستے میں پیسا تھا۔ وہ غلطی سے پٹاخوں والی گندھک لے آیا تھا۔

کنیز بی بی آستانے کے صحن میں گڑی تندوری پر دوپہر کے لیے روٹیاں بنانے میں مصروف تھی۔

ٹھاہ...... کی زوردار آواز سے سارا آستانہ گونج اٹھا تھا۔ مریدنیوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ مردان خانے کی ایک دیوار ٹوٹ گئی۔ برآمدے کی چھت پھٹ گئی تھی۔ ”کنیز تیرا پتر آدھا ہو گیا۔“ پھولی سانسوں کے ساتھ جمیلہ نے روٹیاں لگاتی ہوئی کنیز بی بی کو بتایا تو پیڑہ اس کے ہاتھ سے نیچے جا گرا۔

”کیا کہہ رہی ہے جمیلہ۔“ کنیز بی بی نے دل تھام لیا۔

ارے تو چل کے دیکھ تو سہی تیرا پتر لنگڑا ہو گیا ہے۔ چل جلدی اس کی ٹانگ اڑ گئی ہے۔

کنیز بی بی کی آنکھوں تلے جیسے اندھیرا سا چھا گیا تھا اسے زمین گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔

ایویں نہ اول فول بک۔ کنیز بی بی کو جیسے یقین نہ آیا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا یوں اچانک۔

آ دیکھ لے باتیں کرنے کا وقت نہیں کنیز احسن کو سنبھال۔ وہ اچھل کے کھیتوں میں جا گرا۔ مردان خانے میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔

جمیلہ اسے بچوں کی طرح ہاتھ تھام کر اپنی ہمراہی میں آستانے کے قریبی کھیت کی طرف لے جانے لگی۔

کنیز بی بی چیخیں مارتی پاگلوں کی طرح سرپٹ دوڑے جا رہی تھی اس کے قدم دو دو من بھاری ہو گئے تھے۔ کھیت کے وسط میں ادھورے جسم والے جواں سال احسن کو دیکھتے اسے لگا تھا جیسے احسن کے ساتھ ساتھ اس کا وجود بھی آدھا ہو گیا تھا۔

☆......☆

فاطمہ احسن کی تیمارداری کرتی تو اپنے نوجوان بھائی کے آدھے وجود کو دیکھتے اس کا دل خون کے آنسو روتا۔ مجید کی تو جیسے کمر ٹوٹ گئی تھی۔ سارا گھر افسردگی میں ڈھل چکا تھا۔

صحن میں اس جگہ احسن کی چارپائی بچھی تھی جدھر محسن سویا کرتا تھا۔

کتنے ہی دن احسن کو پٹیاں ہوتی رہیں مگر وہ آدھا ہو چکا تھا پورا نہ ہو سکا۔

کنیز بی بی کے آنسو تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتے۔ پورا مہینہ وہ آستانے نہ گئی۔ چھ ماہ بعد احسن بیساکھی کی مدد سے چلنے لگا تھا وہ گھر رہ رہ کر اکتا گیا تھا تبھی کنیز بی بی اور مجید کے سختی سے منع کرنے کے باوجود آستانے میں اپنی ڈیوٹی سنبھالنے لگا۔

زندگی دوبارہ اسی ڈگر پر چلنے لگی مگر زخم تھے کہ

بھرنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔

کنیز بی بی نے فاطمہ کے اٹھارویں سال کے ختم ہوتے ہی دو جوڑوں میں بیاہ کر حیدر کے ساتھ اس کی رخصتی کرادی تھی۔ احسن اور کنیز بی بی پھر باقاعدگی سے آستانے جاتے تمام کام بہترین طریقے سے انجام دیتے۔ کنیز بی بی کو مرشد سائیں کے آستانے پر کام کرتے اٹھارہ برس بیت چکے تھے۔ کنیز بی بی مرشد سائیں کے کمرے کی صفائی کرتی مردان خانے میں موجود تھی۔

احسن ہمیشہ بیسا کھی پاس رکھے دوائیاں پیس رہا تھا جب مرشد سائیں نے احسن کو آواز دی۔ وہ برآمدے کی طرف آرہے تھے۔

''اوئے آدھے کدھر ہے تو؟'' انہوں نے شاید اسے دیکھا نہیں تھا تب ہی برآمدے میں صفیں بچھاتی مریدنی سے پوچھ لیا۔

ارے بھئی کدھر ہے وہ آدھا، دوائی کٹوانی تھی کم بخت کدھر چھپ گیا۔

مرشد سائیں کی آواز تھی یا انگارے برساتے شعلے۔ مرشد سائیں کے کمرے کی صفائی کرتی کنیز بی بی کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

آپ کے آستانے پہ ہی تو میرا پتر آدھا ہوا تھا مرشد سائیں پھر یہ طعنہ کیوں؟

لب کاٹتی وہ آہستگی سے بڑبڑائی تھی، اسے اس لفظ کی اتنی تکلیف ہوئی تھی کہ اس کا دل کر رہا تھا اس آستانے پر کبھی نہ پلٹ کے آئے۔ الٹے قدموں یہاں سے بھاگ جائے اور پھر چند دنوں بعد ہی نہ صرف اس نے احسن کو ہٹا دیا تھا بلکہ خود بھی ہمیشہ کے لیے آستانہ چھوڑ کر چلی آئی کبھی نہ وہاں جانے کے لیے۔ اس کا دل جو کٹ کر آدھا رہ گیا تھا۔

☆......☆

چاند کی روشنی سارے صحن میں پڑ رہی تھی۔

مجید ادھیڑ عمری میں پہنچا خاصا کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ کنیز بی بی نے اپنے دائیں بائیں دیکھا نہ وہاں فاطمہ تھی نہ ہی وہاں محسن تھا۔ کتنی بدنصیب تھی وہ جب انہیں محبت دینے کا وقت تھا وہ مرشد سائیں پر اپنی ساری محبت لٹا آئی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس کے پیر تھے بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے محبوب تھے۔ اس نے ان سے عشق کیا تھا اور یہ عشق اس سے محسن اور فاطمہ چھین کر لے گیا۔

صحن میں چہار سو رات کی رانی کی خوشبو بکھری تھی تصور ہی تصور میں کنیز بی بی اپنے ساتھ محسن اور فاطمہ کو لٹائے ہوئے تھی۔

مجید میرا سب کچھ لٹ گیا۔ سب کچھ، کیا ملا آستانے سے؟ مرشد سائیں ایسا سلوک کریں گے مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔ کیا مرشد ایسے ہوتے ہیں؟ گلوگیر آواز میں کنیز بی بی نے رک رک کر کہا مرشد کے بغیر تو کچھ حاصل نہیں ہوتا ناں۔ جیسے بندہ شاگرد ہو اور وہ استاد کے بغیر سیکھ نہیں سکتا مرشد سائیں تو ایسے ہوتے ہیں پھر یہ مرشد سائیں؟ کنیز بی بی کے شکوے میں درد ہی درد تھا جس کا جواب مجید نے بڑے فلسفی کی طرح دیا۔

دیکھ' کنیز ہر مرشد سائیں تو ایسا نہیں ہوتا اگر ایک پولیس والا رشوت لے تو کیا سارے ہی برے اور رشوت خور ہوتے ہیں۔

کنیز بی بی نے نفی میں سر ہلایا۔

اگر ایک ڈاکٹر مریض سے ہزاروں روپے بٹورے تو کیا ہر ڈاکٹر ہی ایسا ہوتا ہے، نہیں ناں، تو ایسے ہی ہر مرشد سائیں برے نہیں ہوتے، کنیز بی بی بندے کو اپنی نیت کا پھل ملتا ہے۔ تجھے مرشد سائیں نے برباد نہیں کیا تو تو اس عشق سے برباد ہوئی جو تو نے مرشد سائیں سے کیا تھا۔

مجید کے اس طرح کہنے پر کنیز بی بی شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ مجید نے اسے آئینہ دکھا دیا تھا۔ اس میں اپنا کریہہ عکس دیکھتے وہ لرز کر رہ گئی اس نے کب صرف ایک مرشد سائیں سمجھ کر لنگر پکائے تھے، کب اس نے صرف پیر سمجھ کر آستانے میں اٹھارہ سال گزارے تھے وہ تو یہ صرف اور صرف اپنے محبوب کے لیے کرتی تھی جس کا کام کر کے اسے ہمیشہ اچھا لگتا تھا......ہمیشہ پیارا لگتا تھا......

اماں! سیانے کہتے ہیں کسی سے اتنی محبت نہ کرو کہ دوجے اپنی حق تلفی سمجھنے لگ جائیں......اور تو نے محسن کا حق تلف کر لیا......فاطمہ کا حق......میرا حق اور ابا کا حق۔ سب تلف کر لیا اماں تو نے، پاؤں تک کھیس میں لپٹا احسن بولا تو کنیز بی بی پچھتاوے کی آگ میں جھلس کر رہ گئی۔

☆......☆

کنیز بی بی پورے آٹھ سال بعد مرشد سائیں کے آستانے پر آئی تھی وہاں آتے اسے پرانی یادوں نے جکڑ لیا۔ اسے یاد آ رہا تھا یہاں میرا احسن آدھا ہوا تھا...... یہاں میں نے گندم کے ڈھیر صاف کیے تھے۔ یہاں میں نے سینکڑوں روٹیاں پکائی تھیں۔ وہ جہاں جہاں سے گزرتی ماضی پھن پھیلا کر سامنے کھڑا ہو جاتا۔ مردان خانے میں وہیل چیئر پر بیٹھے مرشد سائیں نے اسے اندر تک لرزا دیا تھا وہ یہاں ان کے بلانے پر عرس کی لائٹنگ کا انتظام کرنے آئی تھی، احسن اب کرائے پر برقی قمقمے جو لگاتا تھا شادی بیاہ، عرس اور دیگر تقریبات پر۔

کیسے ہیں مرشد سائیں؟

کنیز بی بی نے لہجے میں نرمی لاتے کہا۔

تیرے سامنے ہوں کنیز...... سیر کرنے نیوب ویل کی طرف گیا وہاں کسی زہریلی چیز نے کاٹ لیا شکر ہے جان بچ گئی...... زہر مزید پھیلنے سے روکنے کے لیے ٹانگ کاٹ دی گئی۔ آدھا ہو گیا ہوں میں آدھا، میرا وہی حال ہے جو آدھے کا ہوتا ہے۔

مرشد سائیں کو ادھورے وجود میں دیکھتے کنیز بی بی سوچ رہی تھی جتنی مرشد سائیں کی غلطی تھی اس کی سزا انہیں مل گئی۔ احسن کو آدھا کہنے والے مرشد سائیں خود آدھا بن کے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

اور اب کنیز بی بی تیری سزا یہ ہے کہ ساری عمر تو آدھی رہے۔ محسن کی یادوں میں۔ فاطمہ کی یادوں میں۔ تاکہ تیری آدھی ممتا تجھے یاد دلاتی رہے تیری طرح غلطی کرنے والیوں کے بیٹے آدھے رہتے ہیں صرف آدھے......

اور اب کنیز بی بی کی یہ سزا تھی کہ وہ ساری زندگی آدھی ادھوری بن کر ہی جیے گی کیونکہ جب وقت تھا تب وہ نہ تو مکمل ماں بن سکی۔ نہ مکمل بیوی لہٰذا یہ سزا تو اسے اب کم از کم پوری زندگی ہی کاٹنی تھی۔

قطعات

سلیم زاہد صدیقی

تم کو احساسِ خود شناسی دیا
عشوہ، غمزہ، غرور بخشا ہے
ہم کو نفرت سے دیکھنے والو
ہم نے تم کو شعور بخشا ہے

☆

ذہن و دل پر جمود طاری ہے
سوچتا ہوں کہ کیا کیا جائے
اور دیکھوں بہار کا رستہ
یا گریبان سی لیا جائے

ناولٹ

پیار کے بول

محبتوں اور شرارتوں سے گندھی تحریر جو پڑھنے والوں کو
خوابوں کی دنیا کی سیر کرائے گی.....

شغاف روڈ پر تعمیر ہوئی دور سے نظر آتی۔ سفید پتھروں سے بنی بڑی سی خوبصورت کوٹھی جنت ہاؤس میں رہائش پذیر مکینوں کے اعلیٰ ذوق کا منہ بولتا ثبوت نظر آ رہی تھی۔ کوٹھی کے فرسٹ فلور پر بنا محرابی ٹیرس جس میں رکھے سفید پتھروں سے بنے بڑے بڑے دو خوبصورت مور ٹیرس کی دلکشی میں اضافہ کر رہے تھے۔ ٹیرس میں رکھے بڑے سے جھولے پر بیٹھی جنت بیگم سفید ململ کا دوپٹہ سر پر اوڑھے پاندان سے پان نکال کر بنانے میں مصروف تھیں مگر ان کی نگاہیں وقتاً فوقتاً وہیں ٹیرس میں کام کرتی شادو پر بھی لگی تھیں جو ماہیا آ جا کی تان لگاتے ہوئے اپنا بڑا سا پراندہ جھلاتے ہوئے جھاڑو لگا رہی تھی اور جنت بیگم سے نظر بچا کر چھوٹے موٹے ٹھمکے بھی لگا رہی تھی جسے وہ اپنی زبان میں ڈانس ٹیپ یعنی ڈانس اسٹیپ کہتی تھی مگر اب کی بار شادو کا یہ ٹیپ جنت بیگم کی نظروں سے نہ بچ سکا اور دور سے ہی سروتہ آ کر شادو کی چوڑی پشت پر لگا۔

''ہائے میں مر گئی۔'' شادو کمر پکڑ کر وہیں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ ''تجھے میرا گھر ہی ملتا ہے نیستی پھیلانے کو جب دیکھو ناچتی گاتی رہتی ہے نامراد کہیں کی۔''

''وادوا گر میں تھوڑا سا کریش ہو جاتی ہوں تو کیا برا ہے۔''

''کریش نہیں فریش ہوتا ہے۔'' نک سک سے تیار شجاع وہیں ٹیرس میں آتا ہوا بولا۔ ''شجاع صاحب آپ میری انگریزی کا مذاق مت اڑایا کرو۔'' شادو میرا کی طرح برا مانتے ہوئے زور زور سے جھاڑو لگاتی ہوئی بولی۔ یہ جنت ہاؤس کے صبح کا معمول ہے جب تک شادو اپنی پرفارمنس پر جنت بیگم سے داد کے طور پر سروتہ اور صلواتیں نہ وصول کر لی اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔

''میرا بچہ آفس جا رہا ہے۔'' جنت بیگم محبت سے شجاع کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے بولیں۔ یہ ہے شجاع مراد، جنت بیگم کے سب سے بڑے اور

لاڈلے پوتے جو فن تعمیر کے پیشے سے وابستہ ہیں یعنی آرکیٹیکچر، سرمئی آنکھوں والا خوبرو سا لمبے قد کا شجاع مراد جنت بیگم کی آنکھوں کا تارا ہے۔ ''دادو آج کھانے میں کیا بناؤں؟'' صوفیہ وہیں ٹیرس پر سے آج کھانے کا پوچھنے کے لیے چلی آئی۔ یہ ہے صوفیہ مراد شجاع سے دو سال چھوٹی انہوں نے بی اے کیا ہوا ہے۔ یہ محترمہ عموماً کچن میں ہی پائی جاتی ہیں کھانا پکانا اور نت نئے کھانے بنانا ان کا جنون ہے بقول شجاع مراد کہ ہر وقت خود پر ایک شیف کی سی کیفیت طاری کیے رکھتی ہے میری بہن اس کا بس چلے تو کچن میں ہی اپنا بیڈ ڈال لے۔ سیاہ سلکی بالوں کی لمبی سی چوٹی بنائے بھری بھری جسامت کی چہرے پر سادگی اور بھولپن لیے صوفیہ مراد نازک سا دل رکھتی ہیں۔ ہمدرد بلا کی کہ محترمہ کو کوئی بھی آرام سے بیوقوف بنا لے۔ شجاع مراد کے بعد اگر کوئی جنت بیگم کا لخت جگر اور نور نظر ہے تو وہ صوفیہ مراد ہے۔

''آلو بینگن بنا لو اور چاول ابال لو۔''

''دادو پر وہ المیرہ بینگن نہیں کھاتی۔'' صوفیہ چھوٹی بہن کا نام لیتے ہوئے بولی ''اے بہن تم ایک کام کرنا آج اپنی بہن کو کھانے میں فیض احمد فیض کی کتاب اور وصی شاہ کی کتاب رکھ کر پیش کر دینا کہ لو آج اس سے پیٹ بھر لو۔'' دادو کے بیزاری سے کہنے پر صوفیہ اپنی ہنسی دباتے ہوئے پلٹ گئی۔ المیرہ مراد صوفیہ سے دو سال چھوٹی لمبے سے قد کی تیکھے تیکھے نقوش کی گوری سی ہر وقت اپنے آپ میں گم رہتی ہے، کم گو شاعرانہ طبیعت کی، ان کی حال ہی میں شاعری کی کتاب ''سہانی شام'' بھی آ چکی ہے۔ یہ باتیں کم اور شعر و شاعری زیادہ کرتی ہیں، ان کی عادات کی وجہ سے جنت بیگم ان سے بیزار رہا کرتی ہیں۔

یہ ڈوبتا سورج کیسی جادوگری سمیٹے ہوتا ہے اپنے اندر جب یہ ڈوبتا ہے تو کیسے اپنے اطراف میں ایک سحر سا اور ایک احساس قائم کر دیتا ہے۔ یہ بھی المیرہ مراد کی طرح اردو ادب میں ماسٹرز کر رہی ہیں، عروش سکندر کو لکھنے سے کافی شغف ہے اور ان کی تحریریں بھی چھپتی رہتی ہیں اور ان کو لگتا ہے کہ ایک دن ان کا نام بھی بڑے بڑے لکھاریوں کی فہرست میں جگمگا رہا ہوگا۔ یہ اپنی کہانیوں میں ہیرو کا ایسا کردار ڈالتی ہیں کہ فی الحال موجودہ دور میں ایسا ہیرو نظر آنا ناممکنات میں سے ہے، پر مزے کی بات یہ ہے کہ یہ اپنی زندگی میں بھی کوئی ایسا ہی ہیرو چاہتی ہیں اور یہ اس دن کے لیے شدت سے منتظر ہیں جب ان کے ناول کے ہیرو کی طرح اصل زندگی میں بھی کوئی ہیرو انٹری مارے گا اکثر ان کی متلاشی نگاہیں کبھی پارک تو کبھی کسی ہوٹل میں اپنے من پسند ہیرو کو تلاش کرتی ہیں مگر ابھی تک ان کی نظروں کو مایوسی کا سامنا ہے، درمیانے قد کی متناسب جسامت کی کندھوں تک آتے براؤن گھنے بال جن کا عموماً جوڑا لپیٹے رکھتی ہے سنہری رنگت اس پر بڑی بڑی آنکھیں اور لمبی سیاہ پلکیں جو آنکھوں کی دلکشی کو ابھارتی ہیں۔ بڑی بڑی آنکھوں میں ہر وقت گہرا کاجل لگا رہتا ہے۔ جو محترمہ کی آنکھوں میں خوب جچتا ہے مگر جب روتی ہیں تو نہایت مضحکہ خیز منظر پیش کرتی ہیں۔ ''احرار تم دیکھنا ایک دن میں ایک نامور آرٹسٹ ہوں گی لوگ میری پینٹنگ کو ایسے پسند کریں گے جیسے صادقین اور گل جی کو پسند کرتے ہیں۔'' برش ہاتھ میں لیے بڑے جذب سے بولتی ہوئی یہ تابین سکندر ہے، عروش سکندر کی چھوٹی بہن جنت بیگم المیرہ اور عروس کی طرح تابین سکندر کی حرکتوں سے بھی کافی بیزار ہیں، وجہ ان کی اوٹ پٹانگ حرکتیں، ان کی شرارتوں سے ہر کوئی بچتا پھرتا ہے چھوٹے سے قد پر جینز اور ڈھیلی ڈھالی کرتی زیب تن کی ہوئی اپنے براؤن کرلی بالوں کی پونی بنائی ہوئی چہرے پر بچپنا لی ہوئی تابین سکندر پرائیویٹ یونیورسٹی سے فائن آرٹ میں ماسٹرز کر رہی ہیں رنگوں سے کھیلنا ان کا عشق ہے اور ان کو یقین ہے کہ ایک دن ان کے فن کی پوری دنیا میں دھوم ہوگی......

جنت ہاؤس اپنے نام کی طرح پر سکون سا، اس کے باسیوں کے دل محبت و خلوص سے لبریز ہیں اس گھر کے مکینوں کی محبت و خلوص کی مثال دور دور تک دی جاتی اور اس سب میں ہاتھ جنت بیگم کی تربیت کا تھا۔ جنت بیگم جن کو اللہ نے دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا بڑا بیٹا مراد جس کو اللہ نے ایک بیٹے اور دو بیٹیوں سے نوازا۔ اس کے بعد ثانیہ جو شادی کر کے امریکہ میں اپنے شوہر کے ساتھ مقیم ہیں۔ ثانیہ کو اللہ نے ایک بیٹے سے نوازا اور اس کے بعد سب سے چھوٹا بیٹا سکندر جس کی دو بیٹیاں ہیں جنت ہاؤس جو ہر وقت صبح شام گھر کے مکینوں سے چہکتا رہتا تھا اس کی پر سکون دیواروں میں آج بھی بیتے اٹھارہ سال کے حادثے کے نشان ثبت ہیں، مراد اور سکندر اپنی بیگمات کے ساتھ عمرے کی ادائیگی سے واپس آتے ہوئے پلین کریش میں اپنی جانیں کھو بیٹھے تھے۔ جنت بیگم کا اپنے شوہر حسن احمد کی وفات کے بعد دوسرا صدمہ تھا جس نے ان کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ دنوں وہ سکتے کی کیفیت میں رہیں۔ مگر انہوں نے خود کو بہت مشکلوں سے اپنے چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیوں کی خاطر سنبھالا اور ان کی اچھی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کو اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا اب یہی بچے اپنی دادی کا مضبوط سہارا تھے اور ان ہی کے دم سے جنت ہاؤس میں رونق لگی رہتی ہے۔ ان ہی بچوں کو دیکھ کر جنت بیگم جیتی ہیں...... رشک آتا ہے مجھے ان لوگوں کے بچے دیکھ کر ایک یہ میرے بچے ہیں شجاع اور صوفی کو ہٹا کر تو تینوں نالائق سدا کی نکمیاں جنت بیگم ناشتے کی ٹیبل پر تینوں کو لائن سے گھورتی ہوئی بولیں۔ ان کی اس بات پر شجاع جو پہلے ہی چوڑا ہوئے بیٹھا تھا اور پھیل گیا ویسے بھی اتوار کا دن اسے سب دنوں سے زیادہ اچھا لگتا تھا بقول تابین سکندر کے شجاع فتنہ ہماری لائیو بے عزتی کو بہت انجوائے کرتا ہے دادو نالائق تو نہ بولیں میں آپ کی قابل آرٹسٹ پوتی وہ دن دور نہیں دادو جب آپ کو اپنی اس آرٹسٹ پوتی پر فخر ہوگا۔ تابین سکندر اپنی بھوری آنکھوں میں تفاخر لیے بولی۔ اے بی بی پہلے تم انسان تو بن جاؤ بعد میں میرا فخر بننا۔ دادو کے ڈپٹ کے بولنے پر وہ منہ بسور کر رہ گئی۔ سامنے بیٹھا شجاع اس کی اس عزت افزائی پر اپنے بتیس دانتوں کی نمائش کرنے لگا دل کر رہا ہے لمبو تیرے دانت توڑ دوں سارے، تابین اسے غصے سے گھورتے ہوئے دل ہی دل میں بولی وجہ دادو کی موجودگی تھی جو اپنے پوتے کی شان میں کچھ نہیں سن سکتی تھیں۔

وہ دادی میری کہانی چھپی ہے۔ عروش کے فخر سے بتانے پر دادو کا حلوہ پوری کھاتا ہاتھ رک گیا اور وہ کافی گہری نظروں سے عروش سکندر کے چہرے کو دیکھنے لگیں۔ عروش تجھے شرم نہیں آتیں ایسی حرکتیں کرتے ہوئے دادو کی کرخت آواز پر عروش سٹپٹا کر دادو کو اور باقی سب کے حیران چہروں کو دیکھنے لگی کیونکہ عروش کی طرح وہ بھی دادی کی اس ڈپٹ پر حیران تھے۔ عروش تو نے کہانی میں کیا لکھا تھا سچ بتا کہیں تو نے عمران ہاشمی کی مووی تو نہیں لکھ ڈالی تابین کی تشویش زدہ سرگوشی پر عروش کو جلدی جلدی سر نفی میں ہلانے لگی۔ دادو میں نے کہانی میں قسم سے ایسا نہیں لکھا میری کہانیاں تو ہمیشہ بڑی صاف ستھری ہوتی ہیں۔ عروش گڑبڑا کر جلدی سے صفائیاں دیتے ہوئے بولی۔ ہاں دادو یہ اپنی کہانیوں کو منرل واٹر

سے دھوتی ہے۔ تابین کی زبان میں کھجلی ہوئی۔ چپ کرو بس اوٹ پٹانگ بولنا ہے تم دونوں نے اور عروش تم کو کون پاگل بولے گا کہ یہ رائٹر ہے مجھے سامنے والے کرنل صاحب نے بتایا کہ آپ کی پوتی عروش گھروں کی بیل بجا کر بھاگتی ہے، میں پوچھتی ہوں عروش کیا تجھ میں تھوڑی سی عقل ہے یا وہ بھی تو نے بیچ کھائی۔ سامنے بیٹھا شجاع عروش کی اتنی پیاری عزت ہونے پر بری طرح سے جھوم رہا تھا کہ حلوے کی ڈش رکھتی ٹیبل پر شادو ایک منٹ کے لیے تو یہ بھی کہ شجاع صاحب کو حال آ رہے ہیں اور المیرہ بی بی آپ بھی کچھ فرما دیجیے اور مجھے بتایئے کہ آپ میں کتنا بڑا شاعر چھپا بیٹھا ہے۔ دادو کی توپوں کا رخ اب المیرہ مراد کی طرف تھا دادو کی اس بات پر المیرہ مراد خود کو پروین شاکر سمجھ کر دھیرے سے ہنس دی دادو میرے لیے تو یہ شعر صادق ہے

میری سمجھ سے باہر ہے
میرے اندر بیٹھا ہوا شخص

المیرہ مراد جون ایلیا کا شعر کہنے کے بعد اپنے اردگرد واہ واہ سننے کے لیے دیکھنے لگی۔ ہاں بی بی کون سمجھ سکتا ہے تم کو کوئی پاگل ہی ہوگا جو تم کو سمجھے گا دادو کی اس صاف گوئی پر المیرہ منہ لٹکا کر حلوہ پوری سے انصاف کرنے لگی۔ ایک یہ ہے میری بچی اپنی پیاری ایسی کام کی دادو المیرہ کے برابر بیٹھی چائے نکالتی صوفیہ کو دیکھ کر محبت سے بولیں۔ دادو کی اس بات پر سب منہ لٹکا کر رہ گئے صوفیہ دادو کی تعریف پر مزید پھول کر کپا ہوگئی۔ دیکھو اس کو سوجھا ہوا تربوز لگ رہی ہے۔ عروش صوفیہ کو دیکھ کر جل کے تابین کے کان میں سرگوشی کرنے لگی اور دادو میں بھی آپ کا فرماں بردار پوتا ہوں تا شجاع کیسے اپنی تعریف سننے میں پیچھے رہتا۔ ہاں کیوں نہیں تو تو میرا چاند ہے دادو واری صدقے ہوتے ہوئے بولیں۔ وہ ان تینوں کو دل جلانے والی مسکراہٹ سے دیکھنے لگا ان تینوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کچا کھا جائیں۔

رات کے کھانے کے بعد وہ چاروں شجاع سے آئسکریم کھلانے کی ضد کرنے لگیں۔ وہ گاڑی میں ان کو آئسکریم پارلر لے آیا تابین آئسکریم پارلر میں بیٹھی اپنی آئس کریم کم اور سب کی آئسکریم اور اپنا اسپون زیادہ چلا رہی تھی۔ کیا مصیبت ہے اپنی کھاؤ نا۔ عروش جھنجلا کر بولی۔ ہاں اپنی تو کھا ہی رہی ہوں پر سب کے فلیور بھی تو ٹیسٹ کروں گی۔ اس کو ٹیسٹ کرنا نہیں کہتے بلکہ رغبت سے کھانا کہتے ہیں جو آپ کر رہی ہیں۔ شجاع اپنی آدھی ہوتی آئسکریم کو دیکھ کر جل کر بولا۔ اچھا زیادہ مروت لو میری بھی لے لو ایک اسپون اس کے کپ میں ڈالتے ہوئے بولی واہ بڑا احسان کیا ہے اتنی ڈھیر ڈال کر۔ اس کے طنز پر وہ ڈھٹائی سے ہنس دی۔ اوئے تابی سامنے دیکھ۔ عروش تابین کے کان میں بولی تابین اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھنے لگی جہاں ایک ہینڈسم سا لڑکا بیٹھا کافی دیر سے عروش کو دیکھ رہا تھا۔ اوئے عروش یہ تیرے ناول کے ہیرو جیسا ہے اس کی آنکھیں دیکھ کتنی بڑی بڑی ہیں اور دیکھ بھی تجھے رہا ہے۔ تابین پرجوش ہو کر بولی اس لڑکے کا عروش کو دیکھنا سب ہی نے نوٹس کر لیا۔ یہ ایسے کیوں دیکھ رہا ہے۔ سب سے پہلے شجاعت بولا۔ ہوسکتا ہے میں اس کو کسی ناول کی ہیروئن لگ رہی ہوں عروش لبوں پر شرمیلی مسکان جمائے دھیرے سے بولی ہیروئن کم ذہنی پسماندہ زیادہ لگ رہی ہو اس طرح سے شرماتی ہوئی۔ المیرہ کو اس کا چھچھوراپن ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ زیادہ جلنے کی ضرورت نہیں عروش تپ کر بولی مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ اس کا ہماری عروش کو اس طرح سے گھور گھور کر دیکھنا۔ صوفیہ تشویش زدہ لہجے میں بولی اس کی اس بات پر عروش رنج کے بدمزہ ہوئی اچانک

سے وہ اٹھ کر ان پانچوں کی سمت آنے لگا گھبراہٹ میں عروش کا برا حال ہونے لگا بے ساختہ وہ دوپٹے کا کونہ دانتوں میں کچلنے لگی یا اللہ ناول میں تو ہیرو اتنی جرات سے ہیروئن کو سب کے سامنے پروپوز کرتے ہیں اف یہ مجھے پھول دے گا میں کیا کروں۔ عروش سکندر گردن جھکائے بری طرح سے شرما رہی تھی۔ سوری میں معذرت چاہتا ہوں اس طرح سے دیکھنے پر دراصل میری چھوٹی سسٹر بہت زیادہ آپ میں مل رہی تھی میری بہن کی وفات ہوگئی ہے بس آپ میں اس کا چہرہ دیکھا تو میں بے اختیار دیکھے گیا۔ لڑکے کے مسکرا کر افسردگی سے کہنے پر عروش کی جھکی گردن جھٹکے سے اٹھی اور وہ صدمے سے اس کو دیکھنے لگی مگر تب تک وہ وہاں سے نکل چکا تھا۔ اوئے ہوئے چھوٹی بہن شجاعت کی شرارت بھری آواز پر وہ کھسیا گئی۔ ان چاروں کے اس طرح سے ہنسنے پر وہاں بیٹھا ہر شخص ان کی اس ہنسی کو دیکھ رہا تھا مگر وہ چاروں سب کی نظروں سے بے نیاز عروش کے خفت سے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھ کر اپنی ہنسی نہیں روک پا رہے تھے۔

اعتبار آ بھی جائے گا چلو تو سہی چلو تو سہی

یونیورسٹی لان میں بیٹھا احراز گٹار بجاتے ہوئے گا رہا تھا۔ واہ کیا آواز ہے۔ تابین کی اس تعریف پر احراز ماتھے پر بکھرے سیاہ بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کرتا ہوا مسکرانے لگا۔ ”نہ سر ہے نہ تال ہے پھر بھی گانے سے مطلب ہے۔“ تابین کے جملہ پورا کرنے پر احراز اسے گھور کر رہ گیا۔

”اچھا خاصا تو گاتا ہے۔“ ہانیہ کی تعریف پر احراز کے چہرے پر جو رنگ بکھرے تھے اسے دیکھ کر تابین کی ہنسی نکل گئی۔ تھینک یو ہانی۔ احراز آنکھوں میں محبت کے جگنو لیے ہانیہ کو دیکھتے ہوئے بولا جو بلیک شرٹ پر گولڈن اسکرٹ پہنی ہمیشہ کی طرح دلکش لگ رہی تھی۔ ہلکے ہلکے میک اپ میں اپنے گولڈن ڈرائی بالوں کو ہاتھ سے سنوارتی ہوئی مسکرا کر احراز کو دیکھنے لگی۔ اوئے لیلیٰ مجنوں میں بھی بیٹھی ہوں یہاں۔ تابین کے شرارت سے کہنے پر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیے۔ اس ہی کا تو افسوس ہے کہ تم بھی ہو چھوڑتی ہی نہیں کبھی تنہا۔ احراز علی کے بےچارگی سے کہنے پر تابین نے اسکیچ بک اٹھا کر سر پر دے ماری۔ بیٹا ہم تینوں کا ساتھ اسکول سے ہے اور اب آپ چاہتے ہیں میں چھوڑ دوں۔ تابین کمر پر ہاتھ رکھ کر لڑاکا انداز میں بولی۔ ارے تم ہماری چہکتی چڑیا ہو تمہارے بغیر تو سچ میں ذرا مزہ نہیں۔ ہانیہ اس کے گلے لگتے ہوئے محبت سے بولی۔ تابین سامنے بیٹھے احراز کو دیکھ کر زبان نکال کر منہ چڑانے لگی اس کے بچپنے پر احراز ہنس دیا۔

احراز علی کے باپ علی احمد ایک نامور بزنس مین ہیں ان کی بہت خواہش تھی کہ احراز بزنس کی تعلیم حاصل کرنے ملک سے باہر جائے مگر احراز علی کو فائن آرٹس سے لگاؤ تھا اور اس کا اپنا ایک آرٹ اسٹوڈیو کھولنے کا ارادہ بھی تھا مگر اس شرط پر علی احمد راضی ہوئے کہ بعد میں وہ ان کے بزنس پر بھی توجہ دے گا اور احراز نے ہامی بھر لی تھی۔

☆......☆

”سامنے والے کرنل صاحب ان کی بیگم اور ان کا پوتا جو لندن سے آیا ہے میں سوچ رہی ہوں کہ ان کو اس اتوار ڈنر پر بلا لوں۔“ جنت بیگم کے سامنے والے گھر سے کافی اچھے تعلقات تھے۔ ان کے شوہر حسن اور اشتیاق صاحب جگری دوست تھے۔ اشتیاق صاحب کی بیگم سے جنت بیگم کی اچھی دوستی تھی اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہ پانچوں اس وقت دادو کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ عروش کے کان لندن پلٹ پوتے پر کھڑے ہوگئے۔

عروش کی چمکتی آنکھوں میں چھپی خباثت شجاع سے چھپی نہ رہ سکی۔ بات سنو تم تینوں ذرا تمیز سے رہنا تم لوگوں کی فالتو حرکتوں سے میں بہت تنگ ہوں۔ دادوان تینوں کووارن کرتے ہوئے بولیں۔

شادو ایک بات بتا تجھ سے چین سے ٹک کر نہیں بیٹھا جاتا اسپرنگ لگے ہیں، کیا پورا بیڈ ہلا رکھا ہوا ہے۔ دادو ہلتی جلتی ٹانگیں دبائی شادو کو گھور کر بولیں۔ اس کے اندر میراثیوں والے اسپرنگ فٹ ہیں جو ہر وقت اسے ناچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ عروش دھیرے سے بولی جس پر پاس بیٹھے وہ چاروں اپنی ہنسی ضبط کرنے لگے۔ ہاں اور یہ چٹکلے ذرا چھوڑنے اپنے کم کرو ہر وقت سرکس کی جوکر بنی رہتی ہو۔ دادو کی تیز سماعتوں پر شجاع عش عش کر اٹھا جنہوں نے عروش کی دھیرے سے کی گئی سرگوشی کو بھی سن لیا تھا۔ عروش کھسیانی سی ہو کر اپنے ساتھیوں کو دیکھنے لگی جن کے چہروں پر دبی دبی سی شریر مسکان تھی۔

اتوار رات ڈنر پر اشتیاق صاحب اپنی اہلیہ اور پوتے کے ساتھ آئے۔ ان کا پوتا خاور جو لندن سے پڑھ کر آیا ہوا تھا کھانے کی ٹیبل پر مستقل صوفیہ کے ہاتھ کے بنے کھانے کی تعریف کرتا رہا یہاں تک کہ ایک بار تو جذباتی ہو کر یہ بھی کہہ گیا کہ دل چاہ رہا ہے کہ پکانے والے کے ہاتھ چوم لوں۔ اس کی اس بات پر جنت بیگم کے حلق میں نوالہ اٹک گیا اور سامنے ہی بیٹھی صوفیہ شرم سے دوہری ہو گئی۔ باقی ان تینوں کا ہنسی روکنے کے چکر میں اس قدر برا حال تھا کہ المیرہ کا بس نہیں چل رہا تھا دوپٹے کا گولہ بنا کر منہ میں ٹھونس لے۔ تابین نے ہنسی روکنے کے چکر میں چاول بھر بھر کے چمچے میں منہ ٹھونسنا شروع کر دیئے تھے۔ اس سارے وقت میں خاور کی نگاہوں کا مرکز صوفیہ ہی رہی۔ خود پر پڑتی وقفے وقفے سے اس کی نگاہوں سے وہ غافل نہ تھی۔ اس نظروں کی چوری کو عروش نے پکڑ لیا تھا۔ اسے بھی صوفیہ کے لیے خاور اچھا لگا لمبا چوڑا صحت مند سا وجیہہ شخصیت کا مالک خاور اسے بھی پسند آیا۔

جنگل میں منگل ہے تیرے ہی دم سے سب نے یہ شور مچایا ہے۔ آج احراز کی سالگرہ کا دن آیا ہے۔ کال پر لہک لہک کر ہمیشہ کی طرح سے وہ وش کر رہی تھی۔ اس کے انداز پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا پورے بارہ بجے نہ ایک سیکنڈ اوپر نہ ایک سیکنڈ نیچے کیا بات ہے تابین سکندر کی تھینک یو۔ ویلکم یہ بتاؤ کہاں ٹریٹ دے رہے ہو۔ ٹریٹ یہ کیا ہوتی ہے تابی۔ اس کے بھولپن سے سوال کرنے پر وہ دانت کچکچا کر رہ گئی یہ ٹریٹ وہ ہوتی ہے جو ہر سال احراز علی کو دیتے ہوئے موت پڑتی ہے جس میں احراز علی کے والٹ سے پیسے نکالتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اس کا دل بیٹھتا ہے یہ ٹریٹ وہ ہوتی ہے...... اوہ لڑکی بس بس ...... اس کو نان اسٹاپ بولتا دیکھ کر چپ کراتے ہوئے بولا قسم سے ایسی خبیث ہو تم ہر بار ندیدوں کی طرح ٹریٹ لیتی ہو پھر بھی باز نہیں آتیں اب شرافت سے گفٹ دے دینا۔ ارے یہ گفٹ کیا ہوتا ہے۔ تابین کے شرارت سے پوچھنے پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ یہ گفٹ وہ ہوتا ہے جو ہمیشہ کی طرح تابین سکندر سے نہیں دیا جاتا۔ بس کرو بہت بڑے خبیث ہو ہر بار بھوکے ندیدوں کی طرح گفٹ وصول کرتے ہو پھر بھی کہنے سے باز نہیں آتے۔ تابین کے فوراً بدلہ چکانے پر وہ اس کی چالاکی پر ہنس دیا۔ کال بند کر کے اس کے لیے وہ گفٹ پیک کرنے لگی۔ کر دیا احراز کو وش کمرے میں المیرہ آئی۔ المیرہ اس سے پوچھتی ہوئی اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔ جی کر دیا۔ مگن انداز میں وہ سر جھکائے گفٹ پیک کرنے میں مصروف تھی۔ تابی ادھر دیکھو المیرہ اس کے لہجے کی نمی کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔ ہاں بولو وہ ہنوز سر جھکائے کام میں مصروف بولی ادھر دیکھو وہ زبردستی اس کا منہ اٹھاتے ہوئے بولی تابین چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائے اسے دیکھنے لگی پتا ہے تابین سکندر تمہاری غلطی کہاں سے شروع ہوتی ہے تم بہت جذباتی طبیعت کی مالک ہو صرف تصویر کا ایک رخ ہی دیکھتی ہو تم تو یار آرٹسٹ ہو اور ایک آرٹسٹ کی نگاہ تصویر کے ہر پہلو پر ہر رخ پر ہوتی ہے تمہاری غلطی یہ ہے کہ تم نے اپنی لائف میں آپشن کا بٹن نہیں رکھا۔ انسان کی زندگی میں دو آپشنز کے بٹن ہونے چاہئیں اگر اس کو لگے کہ یہ راستہ اس کے لیے ٹھیک نہیں یا اس راستے میں سوائے اذیت اور درد کے کچھ حاصل نہیں تو وہ اس دروازے سے نکل جائے کم از کم اپنی لائف میں اس دروازے سے نکلنے کا آپشن تو رکھو تم نے ایک شخص پر اپنی زندگی شروع کر کے وہیں پر ختم کر دی ہے یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ تم اس کی ایک اچھی دوست ہو اس کے سوا کچھ نہیں اس کے دل میں ہانیہ ہے، تابین سکندر نہیں وہ تابین کے چہرے پر پیار سے اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے اداسی سے بولی وہ تو کافی دیر سے ضبط کی کوشش میں ہلکان ہوئے جا رہی تھی اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں کیسے رہوں گی اس کے بنا میں کیا کروں گی المیرہ اس کے لہجے کی بے بسی نے المیرہ کو بھی رلا دیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا بظاہر یہ شوخ و چنچل نظر آنے والی زندگی سے بھرپور تابین اپنے اندر محبت کا خاموش سمندر لیے ہوئے تھی۔

جنم دن مبارک ہو۔ وہ جو پینٹنگ میں مصروف تھا تابین کی شوخ آواز پر پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ لو ندیدے پکڑو وہ اس کی طرف گفٹ بڑھاتے ہوئے شرارت سے بولی۔ لاؤ دو جلدی سے اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولا۔ سہی تو میں تمہیں ندیدہ بولتی ہوں اس کے جھپٹ کر گفٹ لینے پر تابین منہ بناتے ہوئے بولی۔ یہ ہانیہ کہاں رہ گئی اور اس نے کر دیا وش تمہیں۔ ہانیہ بی بی کو کبھی یاد رہی ہے میری سالگرہ جواب کریں گی وہ محترمہ وش۔ احراز کے مسکرا کر کہنے پر تابین اس کے چہرے پر پھیلی اداسی کو دیکھ کر چپ سی رہ گئی۔ لو آ گئی وہ احراز ہانیہ کو دیکھتے ہوئے بولا جو ان دونوں کی جانب چلی آ رہی تھی۔ ہیلو کیسے ہو تم دونوں مسکرا کر دونوں کو دیکھتے ہوئے بولی اور کرسی پر رکھے گفٹ کو دیکھتے ہوئے حیرانی سے بول اٹھی یہ آج کس کی سالگرہ ہے بھئی۔ اس کے کہنے پر احراز خفیف نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اوہ نو سوری احراز وہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی ہمیشہ کی طرح پھر بھول گئی سوری سالگرہ مبارک ہو۔ تمہارا گفٹ ڈیو ہے اس کے شرارت سے کہنے پر احراز مسکرا دیا۔ تابین جلتی آنکھوں سے دونوں کو ایک دوسرے کو مسکراتا ہوا دیکھنے لگی۔ تم نے ٹھیک کہا تھا المیرہ میری ساری غلطی یہ ہے کہ میں نے دروازے سے نکلنے کا آپشن نہیں رکھا آنکھوں میں آئی نمی کو اندر دھکیلتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ سوچنے لگی مگر میری دعا ہے میرے یہ دونوں دوست ہمیشہ ایک دوجے کے سنگ شادو آباد رہیں وہ سچے دل سے دونوں کے لیے دل ہی دل میں دعا کرنے لگی۔

علاج یہ ہے کہ مجبور کر دیا جاؤں
وگرنہ یوں تو کسی کی سنی نہیں میں نے

کیا خوب کہا ہے جون ایلیا صاحب نے المیرہ سر دھنتے ہوئے بولی۔ ویسے یہ شعر المیرہ تم پر صادق ہے اور تم اتنی ڈھیٹ ہو کبھی کسی کی نہیں سنتیں۔ صوفیہ ہنسی روکتے ہوئے المیرہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ایک نمبر کی بد ذوق ہو تم صوفیہ کی اس بات پر وہ شدید بدمزہ ہوئی بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی جادوئی لمحے یا وقت کے سحر میں گرفتار ہو کر اس میں

جکڑ لیا جاتا ہے پھر تا عمر چاہے بھی تو چھٹکارا ممکن نہیں اس کا۔ عروش اپنی کہانی کا اقتباس سناتے ہوئے سب کو داد طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔ چلو جی ان کو بھی دورہ پڑ گیا تابین بیڈ پر لیٹی بیزاری سے چیونگم چباتے ہوئے بولی چپ کرو چھوٹی بندریا۔ عروش اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ہاں تم خود تو بہت عالم چنا ہو ہر وقت ہی خود کو ناول کی ہیروئن سمجھتی ہیں محترمہ اگر تمہاری زندگی میں کوئی پو بھی آ جائے نہ تو شکر بھیجنا۔ تابین کمرے میں داخل ہوتی چائے لاتی شادو کو دیکھ کر اس کے منگیتر کا نام لیتے ہوئے بولی۔ تابین کی اس بات پر شادو کے ہاتھ میں پکڑی چائے کی ٹرے لرز گئی جسے اس نے بڑی مشکل سے ٹیبل پر رکھا اللہ نہ کرے تابی بی بی میرا ہونے والا شوہر ہے میں اسے کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔ اچھا چلو شادو تم شیئر نہ کرنا چیتا کر لینا۔ اس کے شیئر کو شیر کہنے پر تابین شریر لہجے میں بولی۔ کمرے میں بیٹھی صوفیہ اور المیرہ بھی اپنی ہنسی روکتے ہوئے شادو کی ملکہ جذبات ٹائپ ایکٹنگ دیکھ رہی تھیں۔ میرے لیے وہ پو ہی رہ گیا ہے نہ عروش کے جل کر بولنے پر شادو اچھل کر رہ گئی وہ پورہ گیا ہے، سے کیا مراد ہے عروش بی بی وہ تو پورا ہیرو ہے اور خبردار کسی نے میرا ہونے والا سہاگ چھیننے کی کوشش کی شادو عروش کو دیکھتے ہوئے ایسے بولی جیسے واقعی عروش اس کا ہونے والا سہاگ چھین لے گی۔ تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے فلمیں دیکھ دیکھ کر عجب باؤلی ہوئی ہو عروش گھور کر شادو کو دیکھتے ہوئے بولتی ہوئی پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی۔ ان کو کیا ہوا یہ کیوں اتنا واپر ہو گئی شادو تھوڑی پر انگلی رکھے حیرانگی سے ان تینوں کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ المیرہ اپنی شادو ہی اتنی عجیب الخلقت ہے کہ اس کے ساتھ بندہ باپر سے واپر بن جائے۔ تابین آنکھ مار کر المیرہ سے مخاطب ہوئی جس پر وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دی شادو وہیں کھڑی ہونقوں کی طرح ان دونوں کو ہنستا دیکھنے لگی۔

☆......☆

سامنے والے اشتیاق صاحب نے اپنی صوفیہ کا ہاتھ مانگا ہے۔ دادو رات کھانے کی ٹیبل پر سب کو بتاتے ہوئے بولیں۔ سامنے والے جو کرنل انکل ہیں انہوں نے سب سے پہلے تابین کی حیرت بھری آواز گونجی ہاں تو اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے، دادو ناگواری سے اس سے حیرت زدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے بولیں میں حیران نہیں ہوں دادو مجھ پر تو حیرتوں کے پہاڑ بلکہ حیرتوں کے بم آ پھٹے، ہماری صوفیہ کیا اتنی بڑی ہے اور ابھی تو کرنل صاحب کی بیوی بھی زندہ ہیں اگر چلو وہ نہ ہوتیں تو ہم شادو کے بارے میں سوچتے ٹیبل پر ڈش رکھتی شادو کو دیکھتے ہوئے بولی۔ میں صرف پو کی ہوں شادو پو کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی وہ تو مر جائے پر اپنے نام کے ساتھ اشتیاق کا نام نہیں لگائے گی شادو پرانی پاکستانی فلموں کی ہیروئن کی طرح تیز تیز سانس لیتے ہوئے بولی۔ ارے لو دماغ چل گیا اے لڑکی تیرا وہ اپنے لیے نہیں اپنے پوتے خاور کے لیے صوفی کا ہاتھ مانگ رہے ہیں دادو تابین کو کڑے تیوروں سے دیکھتے ہوئے بولیں اور شادو تم ذرا شبنم کم بنا کرو، دادو شادو کو گھورتے ہوئے بولیں۔ بیٹا صوفیہ مجھے تم سے پوچھنا تھا میں کیا جواب دوں انہیں دادو کے سوال پر صوفیہ کا رغبت سے آلو پراٹھا کھاتا ہاتھ رک گیا۔ جی دادو مجھے کوئی اعتراض نہیں صوفیہ چہرے پر شرمیلی مسکان سجائے سر جھکا کر بولی اس کی اس ادا پر تینوں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو ذومعنی انداز میں دیکھنے لگیں۔ شجاع بیٹا کیا بات ہے بڑے چپ چپ سے ہو دادو شجاع کو دیکھتے ہوئے بولیں جو چپ چاپ اپنا کھانے میں مصروف تھا۔ نہیں دادو کچھ نہیں

پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کے بولا اس اتوار ثانیہ آ رہی ہے اس کے ساتھ تم لڑکیوں ذرا تمیز سے رہنا صوفیہ کا تو مجھے پتہ ہے پر باقی تم تینوں سے تو خیر مجھے کسی تمیز کی امید نہیں، انسان بن کے رہنا، دادو کی بات پر وہ تینوں منہ بنا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

تابین بہت دنوں سے محسوس کر رہی تھی احراز کافی اپ سیٹ لگ رہا تھا پہلے والی شوخی تو کہیں ہم نظر ہی نہیں آ رہی تھی اور کچھ ہانیہ کا رویہ بھی کھنچا کھنچا سا معلوم ہو رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جان کر اگنور کر رہی ہے، تابین ان دونوں کے رویے پر چکرا گئی تھی ہانیہ اسے دیکھتے ہی کچھ کام کا بہانہ کر کے اٹھ جاتی ادھر احراز عجیب گم صم۔ آج اس نے سوچ لیا تھا کہ معلوم کر کے رہے گی ماجرا کیا ہے آخر۔ احراز مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے وہ اس کے پاس لائبریری میں آئی ہاں بولو وہ کتاب پر سے نظر ہٹا کر بولا۔ یہاں نہیں کسی ریسٹورنٹ چلو۔ وہ اس کو لیے ریسٹورنٹ میں چلی آئی۔ بولو کیا بات ہے۔ کیا بات ہے کے بچے یہ چل کیا رہا ہے، کیا گیم کھیل رہے ہو تم دونوں وہ میرے ہاتھ نہیں لگ رہی ہانیہ بی بی ادھر تم ہو کو نگے کا گڑ کھائے بیٹھے ہو، تابین خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی اور یہ تمہارے منہ پر بارہ کیوں بجنے لگے ہیں۔ اس کے کمزور چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی کچھ نہیں ہوا یار وہ زبردستی مسکرا کے بولا اور مس ہانیہ تمہارے ہاتھ لگے گی بھی کیوں، اس کو ڈر ہے کہ تم بھی کہیں میری طرح سوالات کی بوچھاڑ نہ کر دو۔ ڈر پر کیسا ڈر؟ تابین الجھی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ جو ایک جھوٹے کو سچے سے ہوتا ہے پتا ہے جو انسان جھوٹا ہوتا ہے نا وہ سب سے فرار حاصل کرتا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کو کوئی سچ کا آئینہ دکھائے سچ کے آئینے میں تو ہمیشہ اپنا چہرہ بھیانک نظر آتا ہے نا میں نے کہا ہانیہ سے کہ ہم پڑھائی کے بعد شادی کریں گے تو وہ پہلے حیران ہو کر میرا منہ دیکھنے لگی اور پھر دیر تک ہنستی رہی اس کی ہنسی میں پتا ہے ایک عجیب سی بات تھی جیسے اس نے میری بے وقوفی کے مزے لیے ہوں وہ بولی احراز علی میں نے تم سے شادی کا کوئی وعدہ کیا ہے۔ میں نے کب کہا کہ میں تم سے شادی کروں گی تم تو بس میرے اچھے دوست ہو میں اس وقت بس ساکت سا اس کی بات کو سن رہا تھا۔ تابین شادی کا وعدہ نہیں کیا پر باتوں سے بڑا کوئی وعدہ اور ان باتوں میں دبا دبا سا اقرار وہ سب کیا کیسا لگتا ہے یار جب آپ کے منہ پر بیٹھ کر کوئی آپ کے احساسات کا مذاق اڑائے حالانکہ شریک جرم وہ بھی ہوتا ہے ضبط کی شدت سے سرخ ہوتی آنکھوں سے وہ تابین کو دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی بات پر تابین نم آنکھوں سے افسردگی کو محسوس کرتے ہوئے سر جھکا کر رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہانیہ یہ سب بولے گی......

☆ ☆

آج صبح سے ہی جنت ہاؤس میں رونق لگی ہوئی تھی ثانیہ پورے دس سال بعد پاکستان آئی تھی ساتھ ان کے زاویار بھی تھا۔ وہ سب لوگ دادو کے کمرے میں جمع تھے۔"

"کیا تھا جمال بھی آ جاتا۔"

"اماں جمال کے آنے کا تھا بس طبیعت بھی ان کی ایسی ہو گئی کہ وہ آ نہ سکے۔" ثانیہ بیڈ پر ماں کے برابر بیٹھی ان کا ہاتھ پکڑے محبت سے بولی۔ "بول رہے تھے جمال کہ صوفیہ کی شادی میں ضرور آؤں گا۔" ثانیہ محبت سے سامنے صوفے پر بیٹھی بھتیجی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"اماں آپ نے شجاع کے لیے کوئی لڑکی دیکھی۔" ثانیہ ماں سے آہستگی سے پوچھنے لگی۔

”نہیں دیکھی تو نہیں پر اب سوچ رہی ہوں کہ کوئی دیکھ لوں کیونکہ میں چاہ رہی ہوں صوفیہ کے ساتھ ساتھ شجاع کی بھی شادی کر دوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اماں اچھا ہے میں اپنے دونوں بھتیجا بھتیجی کی شادی میں شریک ہو جاؤں گی۔“ ثانیہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

”وہ تو ٹھیک ہے تم بھی پاکستان آئی ہوئی ہوں لگے ہاتھوں زاویار کے لیے بھی کوئی لڑکی دیکھ لو۔“

”اماں آپ کے نواسے کو تو کوئی لڑکی ہی پسند نہیں آتی۔“ ثانیہ غصے سے اپنے مغرور بیٹے کو دیکھ کر بولی جو کاؤچ پر بیٹھا شجاع سے باتوں میں مصروف تھا۔ خوبرو چہرے پر گہری بھوری رنگت کی بڑی بڑی آنکھیں اور اٹھی ناک اسے کافی مغرور ظاہر کر رہی تھی۔ زاویار جو باتوں میں مصروف تھا گاہے بگاہے اس کی نگاہ سامنے باتیں کرتی المیرہ پر پڑ رہی تھی پتہ نہیں پر اسے کچھ عجیب سی کشش محسوس ہوئی تھی اس کو دیکھ کر۔ شام زاویار چائے کا کپ لیے لان میں چلا آیا جہاں سب محفل جمائے بیٹھے تھے۔ ثانیہ اماں کے ساتھ کسی رشتے دار کے ہاں ملنے گئی ہوئی تھیں۔

”کیا ہو رہا ہے بھئی۔“ زاویار کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا ”کچھ نہیں بس آپ کو یاد کر رہے تھے۔“ تابین کے شوخی سے کہنے پر زاویار ہنس دیا اسے جنت ہاؤس کا ہر فرد ہی دلچسپ اور محبت سے لبریز لگا سوائے المیرہ کے۔ اس کی سب سے ہی اچھی بات چیت ہو گئی تھی مگر ابھی تک المیرہ سے براہ راست کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ ”یہ محترمہ بولتی نہیں ہیں۔“ وہ برابر بیٹھی عروش سے پوچھنے لگا۔ ”کون محترمہ؟“ وہ حیرانی سے زاویار کا منہ تکتے ہوئے بولی۔ ”وہ جو سامنے جھولے پر بیٹھی ہے۔“ وہ جھولا جھولتی المیرہ کو دیکھتے ہوئے بولا ”توبہ ہے زاویار بھائی وہ دو ایسے لگا رکھی ہے المیرہ نام ہے اس کا۔“

”مجھے پتہ ہے اس کا نام پر میں پوچھ رہا ہوں یہ بولتی نہیں کیا۔“

”بولتی کم ہے شعر و شاعری زیادہ کرتی ہے۔ ویسے یہ شروع سے ہی اپنی دنیا میں مست رہتی ہے کسی کے کام سے نہ مطلب رکھنے والی۔“ وہ ہنستے ہوئے المیرہ کے بارے میں بتانے لگی۔ ”پر یہ آپ کیوں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں؟“ وہ مشکوک نگاہوں سے زاویار کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ارے لڑکی حد ہے ایسے ہی پوچھ رہا ہوں“ وہ اس آفت کی پرکالہ سے جان چھڑاتے ہوئے بولا ”یار اس سنڈے پکنک کا پلان بنا رہے ہیں ہم زاویار“ شجاع اس کے پاس آتے ہوئے بولا ”گڈ آئیڈیا یہ تو بہت اچھی بات ہے مزہ آئے گا۔“ زویار خوش ہوتے ہوئے بولا ”پر دادو بول رہی تھیں کہ پکنک پر عروش نہیں جائے گی۔“ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے عروش کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے بولا ”کیوں کیوں میں کس خوشی میں نہیں جاؤں گی۔“

”پتا نہیں یار دادو بول رہی ہیں فارم ہاؤس پر چڑیا گھر کی بندریا نہیں جائیں گی۔“

”اچھا میں بندریا ہوں اور تم خود کیا ہو بڑا کہیں کے ہیرو ہونا“ عروش آنکھیں نکال کر گھورتے ہوئے بولی۔ زاویار دلچسپی سے دونوں کی نوک جھونک کو انجوائے کر رہا تھا۔ اچھا اگر چلو گی بھی تو تمہیں گاڑی کی ڈگی میں بٹھا کر لے جاؤں گا۔“

”دفع ہو جاؤ تم یہاں سے خود جاؤ گاڑی کی ڈگی میں اللہ کرے تمہاری بیوی ہو بندریا۔“ عروش پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ شجاعت کے ہنسنے پر زاویار اس کے ہنستے چہرے کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے بھائی میرے چہرے پر کیا لکھا ہے جو اتنے غور سے دیکھ رہے ہو۔“

”محبت...... پڑھ رہا ہوں تمہارے چہرے پر ......“

”کیا مطلب وہ گڑبڑا کے بولا“ کیا مطلب کیا، جو عروش سے تمہیں محبت ہے وہ پڑھ رہا ہوں اور کیا۔“

”تم سے ایسا کس نے کہا۔“

”تمہارے چہرے پر صاف صاف لکھا ہے۔“

”ابے نہیں یار“ وہ اس کو ٹالتے ہوئے بولا

”شجاع مراد یہ کب سے ہے محبت اب یہ بتاؤ۔“

”یار کب سے کا تو یاد نہیں پر بس اتنا پتا ہے کہ محبت کے معنی ہی عروش سکندر ہیں۔“

”اس کو پتا ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔“

”کہاں یار میرے ساتھ مل کر تو وہ پاگل اپنا ہیرو تلاش کرتی ہے۔“ وہ بیچارگی سے سب کچھ بتانے لگا۔ اس کی بات پر زاویار ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اڑالو میری بے بسی کا مذاق اس کے اس طرح ہنسنے پر وہ منہ پھلا کر اسے دیکھنے لگا۔ ”میں تو قسم سے تیری ہمت پر داد دے رہا ہوں کہہ کر وہ ایک بار پھر ہنسنے لگا۔ اس کے اس طرح سے ہنسنے پر اس کو بھی ہنسی آ گئی۔

☆......☆

وہ آج کلاس میں پورے پندرہ دن کی غیر حاضری کے بعد آیا تھا۔ تابین سکندر دور سے احراز علی کے چہرے کو دیکھنے لگی اور پھر بے چین ہو کر اس کے پاس چلی آئی۔ ”سنو! محبت کیا ہوتی ہے۔“ وہ جو پینٹنگ میں مصروف تھا اس کے سوال پر اپنی گہری سیاہ آنکھوں میں شرارت لیے اسے دیکھنے لگا۔

”محبت ایک بریانی کی گرم پلیٹ سے زیادہ نہیں“ وہ اس کی بات پر حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت دیکھ کر وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ ”جب مجھ سے میری محبوبہ بچھڑی تھی نہ تو میری حالت کسی مجنوں سے کم نہ تھی میرا دل چاہتا تھا میں اس کے پاس جاؤں اور کھینچ کر اس کی بے وفائی پر اس کے چہرے پر تھپڑ ماروں کہ میرے ساتھ وقت گزاری کر کے کیوں اس نے میرے احساسات سے کھیل کر چھوڑا۔ میں اس کے غم میں ہی ڈوبا تھا کہ میری ماں نے مجھ سے آ کر کہا بیٹے مجنوں تو تم بن چکے ہو اس بے حس کی خاطر جس کو تمہاری پروا نہیں۔ اب ایک کام کرو کھانا پینا چھوڑو اور مر جاؤ۔ دو دن میں نے ماں کی بات پر عمل کیا تیسرے دن بھوک اور پیاس سے سب کچھ بھولنے لگا۔ یاد تھا تو بس پیٹ میں پڑنے والے بھوک سے بل اور حلق میں پیاس سے پڑنے والے کانٹے۔ ماں نے گرم گرم بریانی کی پلیٹ سامنے رکھی اور میں ٹوٹ پڑا۔ بس میں سمجھ گیا کہ اس محبت کی اوقات ایک پلیٹ بریانی سے زیادہ نہیں تھی کسی ناقدرے کے لیے افسوس کرنا اب میرے لیے ایسا ہی ہے تابین سکندر!“

”کیا وہ بریانی کی پلیٹ ہم مل کر کھا سکتے ہیں۔“ وہ ہنس کر اس سے پوچھنے لگی۔ اس کی بات پر وہ خوشی سے اسے دیکھنے لگا۔ ”پتا ہے تم گٹار اچھا بجا لیتے ہو اور گا بھی اچھا لیتے ہو۔“ وہ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولی ”اور تم باتیں بہت اچھی بنا لیتی ہو۔“ وہ ہنسی روکتا ہوا بولا ”مجھے تمہارے گالوں پر پڑتا ڈمپل کچھ خاص پسند نہیں“ وہ اس کے گال میں پڑتے ہوئے ڈمپل کو دیکھتے ہوئے منہ بناتے ہوئے بولی ”جی جی مجھے پتہ ہے آپ کو میرا ڈمپل کس قدر پسند ہے۔“ اس کی بات پر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بے ساختہ ہنس دیے۔

☆......☆

پتا نہیں کیا ہو گیا تھا آج احراز بھی کیا سوچ رہا ہو گا۔ تابین بیڈ پر لیٹی آج دن میں احراز کے ساتھ کی جانے والی باتوں کو سوچ کر شرمندہ ہو رہی تھی۔

میں کیوں اتنا جذباتی ہوئی وہ منہ پر ہاتھ رکھے افسوس کیے جارہی تھی۔ ''کیا ہوا کیا سوچ رہی ہو؟'' المیرہ اس کو سوچوں میں گم دیکھ کر پوچھنے لگی۔ تابین نے اسے ساری بات بتاڈالی۔ ''ارے یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ نہ تابی دیکھو تمہارے جذبے کس قدر سچے اور خالص تھے۔'' المیرہ بے تحاشہ خوش ہوتے ہوئے بولی ''نہیں یار مجھے بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔ احراز کیا سوچ رہا ہوگا میں کس قدر چالاک ہوں، ہانیہ کے جاتے ہی جگہ لینے کی پڑ گئی۔ میں بس خود پیچھے ہٹ جاؤں گی۔'' تابین کے سنجیدگی سے کہنے پر المیرہ حیرانگی سے اس کو دیکھنے لگی۔

☆......☆

المیرہ ٹیرس میں جھولے پر بیٹھی ''میرے دل میرے مسافر'' پڑھ رہی تھی کہ زاویار وہیں اس کے پاس چلا آیا اور اس کے ساتھ ہی جھولے میں بیٹھ گیا المیرہ نے برابر بیٹھے زاویار پر ایک نگاہ مسکرا کر ڈالی اور پھر کتاب میں گم ہوگئی۔ ''کافی شوق لگتا ہے آپ کو شعر و شاعری سے۔''

''جی بہت زیادہ۔'' اس کی بات پر وہ دھیمے سے مسکرا کر بولی۔

آؤ چپ کی زبان میں ناصر
اتنی باتیں کریں کہ تھک جائیں

زاویار نے مسکرا کر شعر کہنے پر المیرہ خوشگوار حیرت سے اسے دیکھنے لگی یعنی کہ آپ کو بھی شوق ہے:

ایک نہ ایک بات سب میں ہوتی ہے
وہ جو ایک بات مجھ میں کیا تھی

زاویار کے اس شعر پر المیرہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ اب دونوں کی اکثر اس شعر و شاعری کو لے کر باتیں ہونے لگیں۔ زاویار کا ہر انداز آہستہ آہستہ المیرہ مراد کے دل میں جگہ بنانے لگا وہ المیرہ مراد جو اپنی دنیا میں مگن رہتی تھی اب اس کی باتوں میں خود بخود زاویار کا ذکر آنے لگا جس کو تابین نے کافی محسوس کیا تھا۔

شام وہ چاروں واک پر نکلی ہوئی تھیں کہ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہوئے عروش اچھل کر ان تینوں کے سامنے آگئی۔ کیا ہوا تمہیں کرنٹ کیوں لگ رہا ہے۔ صوفیہ عروش کو اس کے عزائم سے باز رکھتے ہوئے ڈپٹ کر بولی ''ارے نہیں یار سن تو لو پہلے میری۔ وہ تینوں کو دیکھتے ہوئے بولی شرارت اس کی آنکھوں میں صاف ناچ رہی تھی۔ یہ جو گھر ہے نہ وہ سیاہ دروازے کے کھلے گیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی'' ہاں تو ہم نے کب کہا ہے کہ یہ چڑیا گھر ہے'' تابین جھنجھلا کر بولی۔ ''ارے سن تو لو یہاں نا میں نے یہاں ایک بہت ہینڈسم ہیرو دیکھا۔ اس کی تو ٹھرک کبھی ختم نہیں ہوتی چلو آ جاؤ بڑھو کوئی ضرورت نہیں'' المیرہ اس کو غصے سے گھورتی ہوئی ان دونوں کو دیکھتے ہوئے بولی ''یار ایک منٹ تم دیکھ تو لو اسے'' عروش زبردستی روکتے ہوئے بولی اس کے کہنے پر وہ تینوں بھی اس کے ساتھ اس کھلے گیٹ سے اندر جھانکنے لگیں' حالانکہ یہ تو بڑی غیر اخلاقی حرکت یوں کسی کے گھر کے اندر جھانکنا پر کیا کرے بہن کی ٹھرک کے آگے مجبور ہے۔'' صوفیہ اندر لان کو دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ ہے تیرا ہیرو۔ تابین لان میں کھڑے کتے کو دیکھ کر حیرت سے چیخی۔ دماغ خراب ہے تیرا عروش کچا کھا جانے والی نگاہوں سے تابین کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اوئے بھاگو وہ ہماری طرف آرہا ہے۔'' المیرہ کتے کو اپنی طرف دوڑتا دیکھ کر چیخی۔ کون ہیرو آرہا ہے۔ صوفیہ بدحواس ہوکر پوچھنے لگی۔ ارے نہیں کتا۔ تابین چیخ مار کر دوڑ لگاتے ہوئے بولی۔ یہ ہیرو کو کتا کیوں بول رہی ہے۔ صوفیہ ناسمجھی سے المیرہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ بھاگ صوفی آ گیا ہیرو۔ المیرہ صوفیہ کا ہاتھ پکڑ کر دوڑ لگاتے ہوئے بولی۔ ہائے میری کمر۔ بھاگتے بھاگتے صوفیہ کا سانس پھولنے لگا۔ تب ہی بولتے ہیں پراٹھے کم ڈکارتے ہیں المیرہ۔ اس کی صحت مند جسامت پر چوٹ کرتے ہوئے بولی۔ اوئے عروش کہاں رہ گئی بھاگتی تابین اچانک رک کر اپنے ساتھ عروش کو موجود نہ پا کر پوچھنے لگی۔ وہ تینوں دوبارہ تیزی سے واپس چلتی اس سیاہ دروازے تک جہاں عروش بی بی اپنا پیر پکڑے مستقل رو رہی تھی اور ایک لڑکا اس کے قریب ہی گھٹنوں کے بل جھکا ہمدردی سے اس سے کچھ پوچھ رہا تھا، دیکھو اس فتنی کو دریافت کرہی لیا اس نے ہیرو۔ صوفیہ ان دونوں سے بولتی ہوئی اس کے پاس چلی آئی۔ کیا ہوا عروش زیادہ لگ گئی وہ دونوں بھی فکر مندی سے اس کو دیکھنے لگیں۔ میں کب سے پوچھ رہا ہوں سسٹر بتا رہی نہیں رہیں۔ عروش کے شدت سے رونے کی وجہ ان تینوں کو سمجھ آگئی تھی بمشکل اپنی ہنسی کو ضبط کرتی وہ تینوں اس کو سہارا دے کر اٹھانے لگیں

رات تک وہ اس کا ریکارڈ لگاتی رہیں۔ رات شجاع بھی اس کے کمرے میں چلا آیا سن کر تو اسے بھی ہل گئی تھی اب کیسا ہے تمہارا پیر وہ فکرمندی سے اس کا پیر دیکھنے لگا۔ پیر سے زیادہ میرا دل ٹوٹا ہے وہ بچوں کی طرح منہ بسور کے بولی۔ اس کی اس بات پر شجاع لبوں پر پھیکی سی مسکان لا کر مسکرا دیا۔ کیا ہوا شجاع کچھ کچھ چپ سے ہو۔ نہیں تھکن ہے چلو میں چلتا ہوں۔ نیند آرہی ہے تم خیال رکھو اپنا۔ اچانک وہ کھڑا ہوتا ہوا کمرے سے نکل گیا اس کے رویے پر عروش حیرت زدہ رہ گئی۔ شجاع کو کیا ہوگیا آج وہ اس کے انداز پر سوچنے لگی۔

آج صبح سے ہی سب پکنک پر فارم ہاؤس آئے ہوئے تھے۔ اماں سب کتنا اچھا لگ رہا ہے ناں۔ لان میں کرسی پر بیٹھی ثانیہ ماں سے بولیں۔ ہاں بہت اچھا لگ رہا ہے اللہ میرے گھر کو ہمیشہ آباد رکھے۔ جنت بیگم محبت سے کرکٹ کھیلتے بچوں کو ہنستا مسکراتا دیکھتے بولیں۔ کاش محمود مراد اور میری بہو آج زندہ ہوتی جنت بیگم نم آنکھوں سے بولیں۔ کوئی بھی موقع یا تہوار ہوتا جنت بیگم کی آنکھیں انہیں یاد کر کے نم ہوجاتیں۔ ان کو دیکھ کر بچے بھی افسردہ ہو جاتے تھے۔ ہاں اماں کاش ایسا ہوتا وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتے ثانیہ بھائیوں' بھابیوں کو یاد کر کے اپنی آنکھوں میں امنڈتے آنسوؤں کو روکتے ہوئے بولیں

آپ کے ہاتھ کے کھانے بہت لذیذ ہوتے ہیں خاور کچن میں چائے بناتی صوفیہ کو دیکھ کر اس کے پاس چلا آیا۔ خاور کی فیملی کو بھی دادو نے فارم ہاؤس پر چلنے کو کہا تھا پر کسی کام کی وجہ نہ چل سکے۔ شجاع کے بہت اصرار پر خاور آنے پر راضی ہوا تھا۔ مجھے آپ کے ہاتھ کے پراٹھے بھی بہت پسند ہیں بہت ذائقہ ہے آپ کے ہاتھوں میں۔ صوفیہ اس کی تعریف پر مسکرادی اور بریانی کا تو جواب نہیں اس کی تعریف پر صوفیہ کے لبوں کی مسکان پہلے سے ہلکی پڑی اور میٹھا تو آپ ایسا لذیذ بناتی ہیں۔ بس اب کی بات اس کے لبوں کی مسکراہٹ بالکل معدوم ہوگئی۔ بات سنیں ذرا آپ کو میں اچھی لگی ہوں یا میرے ہاتھ کے بنے کھانے ایسا کریں کسی باورچن سے کرلیں شادی۔ وہ ناراضگی سے خفا خفا انداز میں بولی۔ ارے میں نے تو سنا تھا آپ کو کھانے پکانے کا اور اپنے کھانوں کی تعریف سننے کا شوق ہے۔ ہاں شوق ہے پر یہ تھوڑی کہ بس آپ کھانے کی کریں جائیں تعریف میری بھی تو کریں۔ وہ سر جھکا کر شرماتے ہوئے بولی آپ تو پہلی ہی ملاقات میں دل میں گھر کر گئی تھیں جی۔ خاور کے شوخی سے بولنے پر صوفیہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بری طرح شرما گئی۔ دیکھ دیکھ اس کو کیسی ذہنی پسماندگی برس رہی ہے۔ اس کو اس

طرح شرماتا دیکھ کر تابین سرگوشی کرتی ہوئی ان دونوں سے بولی۔ وہ تینوں چھپ کر کھڑکی سے اندر کچن میں خاور اور صوفیہ کا لائیو چھچھورا پن ملاحظہ کر رہے تھے۔ ہاں دادو کے سامنے کیسی سو بر بنتی ہے دل چاہ رہا ہے دادو کو بلا کر دکھاؤں ان کی لاڈلی کی اوور ایکٹنگ۔ عروش جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے بولی اس کے اس طرح سے بولنے پر المیرہ کی ہنسی نکل گئی۔

گھر میں آئے ہوئے احراز کے پرپوزل نے تابین سکندر کو چکرا کر رکھ دیا تھا اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک ہوا کیا۔ اس نے احراز کو کال کر کے شام کسی ریسٹورنٹ میں ملنے کا بولا تھا۔ احراز یہ سب کیا ہے تابین پریشانی سے احراز کے پرسکون چہرے کو دیکھ کر سوال کرنے لگی وہ دونوں اس وقت ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ کیا ہے۔

کیا وہ انجان بن کر جوس کا سپ لیتے ہوئے بولا میں تمہارے پرپوزل کی بات کر رہی ہوں وہ اس کو گھور کر بولی۔ ہاں تو کیا غلط ہے۔ احراز اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے اس طرح سے دیکھنے پر تابین سکندر پہلی بار گھبرائی۔ نہیں مجھے کچھ عجیب لگ رہا ہے ہانیہ کو پتا لگا تو کیا سوچے گی کہ فوراً ہی اس کے جاتے ہی میں نے جگہ لے لی۔ کیا میں انتظار میں تھی تم یقین کرو احراز میں نے کبھی ایسا نہیں چاہا۔ میں نے تم دونوں کے لیے ہمیشہ سچے دل سے ساتھ رہنے کی دعا کی۔ تم صفائی کس کو دے رہی ہو تابین سکندر وہ اس کی صفائی دینے پر بولا۔ اور یہ سب مجھے المیرہ بتا چکی ہے کہ تمہیں کیا لگ رہا ہے اور کیا نہیں۔ کیا مطلب المیرہ بتا چکی۔ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ اس کی چار دن پہلے میرے پاس کال آئی تھی اس نے مجھے بتایا کہ وہ سب جو آپ برسوں سے دل میں چھپائے

بیٹھی تھیں۔ تابین کو المیرہ سے اس غداری کی امید نہ تھی پتا ہے تابین بعض اوقات مجھے تمہارا رویہ کہیں نہ کہیں چونکا ڈالتا تھا پر میں سوچتا کہ نہیں ہو سکے گا وہ سب نہ ہو جو میں سوچ رہا ہوں۔ تم جس طرح سے میری ہر خوشی مجھ سے وابستہ ہر دن کو یاد رکھتی ہو تو میں سوچتا کہ کاش ہانیہ بھی تمہاری طرح یاد رکھا کرے ایک بار ہانیہ نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ اسے لگتا ہے کہ تابین مجھ سے محبت کرتی ہے میں نے اس کا وہم سمجھ کر ٹالا تھا مگر اس دن کلاس میں جس طرح تم نے مجھ سے آ کر پوچھا۔ محبت کیا ہوتی ہے میرے شک کو یقین میں بدل دیا تھا وہ اس کو اس دن کا حوالہ دیتے ہوئے بولا جس پر وہ جھینپ سی گئی اور پھر المیرہ کی کال نے سب سچ ثابت کر ڈالا میں نے سوچا اور بہت سوچا کہ میں اس شخص کو اپنی زندگی میں کیوں نہ شامل کروں جو بہت میری قدر کرتا ہے۔ پتا ہے یہ قدر لفظ جو ہے نا تابین سکندر اس کی اہمیت بہت ہے جو لوگ قدر کرنا جانتے ہیں نہ تو وہ محبت کرنا بھی جانتے ہیں کہتے ہیں قدر نہ کرو تو چھن جاتی ہے نعمت پھر چاہے وہ رزق ہو یا محبت اور ہانیہ کو بھی ایک دن ضرور قدر آئے گی کہ اس نے کیا کھویا ہے۔ تابین اس کی بات پر بولی۔ میں نے ابھی تھوڑے دن پہلے ہانیہ کو کسی اور لڑکے کے ساتھ دیکھا تھا بہت خوش باش تھی میں سمجھ گیا کہ اس لڑکی کے لیے کوئی مشکل نہیں اپنی زندگی میں کسی کو بھی جگہ دینا۔ حیرت ہے میں بچپن سے اس کے ساتھ تھا پر مجھے اتنا اندازہ ہو ہی نہیں سکا۔ بعض اوقات احراز کسی کو سمجھنے میں عمر گزر جاتی ہے اور کسی کو سمجھنے کے لیے ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے۔ مجھے بس افسوس ہے کہ اس نے مجھے کس طرح دودھ میں سے مکھی کی طرح نکالا۔ انسان اگر جانور کو بھی پالتا ہے تو اس کو چھوڑتے ہوئے بھی تکلیف ہوتی ہے اگر اس جانور کو کہیں چھوڑ بھی دیتا ہے تو

پلٹ کر ضرور پوچھتا ہے کہ اب تم ٹھیک تو ہو میرے بغیر رہنے کے ہو گئے عادی۔ احراز پرنم لہجے میں بولا۔ احراز علی بہت سے لوگ جانور پال تو لیتے ہیں پر وہ یہ ثابت بھی کر دیتے ہیں کہ ان میں انسانوں والی انسانیت نہیں تھی وہ اس پالتو جانور سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ ہاں پر میں اب شکر ادا کرتا ہوں کہ اللہ نے مجھے پہلے ہی اصلیت سے واقف کر دیا۔ تم میری بہت اچھی دوست ہو تابی اور ایسے وقت میں جب انسان ٹوٹ کے بکھرا ہو اور اس کو سنبھالنے کے لیے جو ہاتھ آگے بڑھتا ہے جو آپ کے دکھ میں دکھی ہوا ہے ان کی قدر کرنی چاہیے اور میں تمہاری عزت بھی کرتا ہوں اور قدر بھی کیونکہ عزت اور قدر سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ احراز محبت سے تابین کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے اس خوبصورت اقرار پر تابین سکندر مسکرا دی۔

مانا کہ چاند بہت خوبصورت لگ رہا ہے پر اب ایسا بھی نہیں کہ بندے کو اپنے اردگرد کا ہوش ہی نہ رہے۔ عروش چھت پر کھڑے شجاع کو چاند کو تکتا دیکھ کر اس کے پاس چلی آئی۔ کیا بات ہے شجاع میں بہت دنوں سے نوٹ کر رہی ہوں تم بہت بدل گئے ہو اب پہلے کی طرح بات کرتے ہو نہ اب وہ انداز رہا ہے تمہارا عروش شکوہ کرنے لگی۔ تمہارا وہم ہے بس آفس کا کام زیادہ ہو گیا ہے آج کل تو بس مصروفیت بڑھ گئی ہے اوہ، اچھا آفس کا کام خالی میرے لیے ہی زیادہ ہوا ہے اور مجھے دیکھ کر ہی مصروفیت بڑھی ہے باقی سب کے لیے تو ویسے کے ویسے ہو تم بس مجھے اگنور کر رہے ہو اور اب تو دادو تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں تمہاری شادی ہو جائے گی تو تم بالکل بدل جاؤ گے شجاع واقعی تم اب وہ نہیں رہے عروش افسردگی سے منہ جھکا گئی۔ تم سے کس نے کہا میں شادی کے بعد بدل جاؤں گا ویسا ہی رہوں گا آخر کو

ہم نے مل کر تمہارا ہیرو بھی تو دریافت کرنا ہے۔ شجاع ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ لا کر بولا مگر اس مسکراہٹ میں اس کی آنکھوں نے ساتھ نہ دیا۔ مجھے نہیں ڈھونڈنا کوئی ہیرو ویرو دفع کر بس۔ عروش ایک دم روتے ہوئے بولی۔ وہ اس کے اس طرح رونے پر بونقوں کی طرح اس کو دیکھنے لگا۔ تم رو کیوں رہی ہو مجھے نہیں پتا میں کیوں رو رہی ہوں پر میں اپنا اچھا دوست نہیں کھونا چاہتی جب سے دادو نے تمہاری شادی کا ذکر چھیڑا ہے جب سے پتہ نہیں کیوں لگ رہا ہے کہ میں کچھ کھونے والی ہوں۔ مجھے ابھی تک نہیں تھی اپنے جذبات کی خبر بس یہ جانتی تھی کہ کوئی خوشی ہو کوئی غم ہو یا کچھ بھی ہو شجاع کو بتائے بغیر گزارا نہیں۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ روتی ہوئی عروش اگر اس وقت شجاع کے چہرے پر بکھرے خوشی کے رنگ دیکھ لیتی تو دنگ رہ جاتی وہ اس کا ہاتھ پکڑے وہیں چھت پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ پتا ہے عروش یہ جو محبت ہوتی ہے نہ وہ محبوب کی خوشی میں خوش ہونا سکھاتی ہے اور اب چاہے محبوب کی خوشی چاہے کسی اور میں ہو میں سوچتا تھا کہ محبت میں کرتا ہوں عروش سکندر تو میں کیوں اسے مجبور کروں کہ تم بھی مجھ سے ویسی ہی محبت کرو میں شاید کبھی نہ بتاتا تمہیں کہ میں تم سے کس شدت سے محبت کرتا ہوں پر یہ میری محبت کی شدت ہی تو تھی کہ اس نے تمہارے دل پر دستک دی۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے شجاع کو دیکھ رہی تھی۔ ہاں یہ تمہاری محبت کی شدت ہی تو تھی کہ ہر اچھا لڑکا مجھے بھی بنا لیتا تھا وہ منہ بنا کر بولی اس کی بات وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ آسمان پر چمکتے چاند کی روشنی بھی ان دونوں کے ملن پر مسکرا دی۔

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

تابین شرارت سے شعر کہتے ہوئے المیرہ کو دیکھنے لگی جو بے چینی سے ادھر ادھر چکر کاٹ رہی تھی ابھی بارہ بجنے میں پورا آدھا گھنٹہ ہے بیٹھ جاؤ آرام سے۔ کیا بدتمیزی ہے میں تو بس ایسے ہی المیرہ جھینپتے ہوئے بولی۔ المیرہ مجھے زاویار بھائی سے بہت محبت ہوگئی ہے نا تابین اس کے چھلکتے چہرے کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔ بہت زیادہ پتا نہیں چلا کب کس طرح وہ المیرہ مراد کی زندگی میں اس کی باتوں میں دعاؤں میں شامل ہوئے۔ وہ تابین کے پاس وہیں بیڈ پر بیٹھتی محبت سے بولی۔ میں کہاں اپنے آپ میں گم رہنے والی سی ایک لڑکی اپنے اردگرد ایک مضبوط حصار قائم کی ہوئی اور کیسے زاویار نے اس حصار کو توڑ کے میرے دل کے دروازوں کو توڑ کر بڑے مزے سے آکر براجمان ہوگئے۔ محبت ہوتی ہی ایسی ہے یہ پوچھتی نہیں ہے میرے نزدیک یہ بڑی غیر قانونی چیز ہے اجازت بھی نہیں لیتی اور آکر ٹھاٹ سے آپ کے جسم کے سب سے اہم حصے جسے آپ دل کہتے ہیں پر قبضہ جمالیتی ہے تابین مسکرا کر بولی جاؤ بارہ بج گئے۔ تابین کی بات پر وہ گفٹ اور کارڈ اٹھا کر نکلنے لگی سو بیسٹ آف لک وہ تابین کے کہنے پر دھڑکتے دل کے ساتھ زاویار کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ کانپتے ہاتھوں سے اس کا دروازہ ناک کرنے لگی زاویار کے دروازہ کھولنے پر وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر اسے سالگرہ مبارک کہتے ہوئے اس کی جانب گفٹ اور کارڈ بڑھا دیا جسے خوشدلی سے وہ تھامتا ہوا اسے اندر آنے کا اشارہ کر کے کمرے میں رکھے صوفے پر بیٹھ کر گفٹ دیکھنے لگا وہ بھی وہیں بیڈ پر ٹک گئی۔ اب وہ کارڈ پر لکھے شعر کو پڑھنے لگا

داستان ختم ہونے والی ہے
تم میری آخری محبت ہو

اس شعر میں ہی بہت کچھ تھا۔ یہ کیا ہے وہ شعر پڑھتے ہوئے المیرہ کو دیکھنے لگا المیرہ اپنے کانپتے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پیوست کرتے ہوئے زاویار کے چہرے کو دیکھنے لگی جہاں صرف سنجیدگی تھی اور کچھ بھی نہیں۔ اتنا آگے کیوں بڑھی المیرہ مراد اس کے سوال پر وہ آنکھوں میں حیرت لیے اسے دیکھنے لگی۔ ٹھیک ہے مجھے آپ اچھی لگیں منفرد سی پر یہ مطلب تھوڑی ہے کہ آپ سے محبت ہوگئی مجھے۔ زاویار کی اس بات پر المیرہ صدمے کی سی کیفیت میں بیٹھی زاویار کے ہلتے ہونٹوں کو دیکھنے لگی۔ ٹھیک کیا آپ نے ساری غلطی میری ہے وہ دھیرے سے کہہ کر اس کے کمرے سے نکل گئی۔

تابین جو بے چینی سے اس کے انتظار میں تھی اس کو اس طرح سے کمرے میں آتا دیکھ کر دھک سے باہر آگئی۔ المیرہ کیا ہوا کیا بات ہوئی ہے زاویار بھائی سے۔ تابین اس کا ہاتھ پکڑ کے بے صبری سے پوچھنے لگی وہ وہیں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ المیرہ بتا نا پلیز۔ اس کے پوچھنے پر وہ اسے ساری بات بتا کر عجیب طریقے سے ہنس دی۔ پر المیرہ زاویار بھائی کا تو انداز باتیں سب چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا کہ انہیں المیرہ مراد سے محبت ہے۔ تابین کا بھی بس نہیں چل رہا تھا کہ جا کر زاویار جمال کا منہ توڑ دے نہیں۔ تابین سکندر شاید یہ مرد کی فطرت ہے ہر منفرد چیز پر لپکنے کی اس کو میں اپنے آپ میں گم اچھی لگی اس نے سوچا ہوگا کہ چلو اس کی پرسکون زندگی میں، میں محبت کا پتھر مار کر اس کا حصار توڑتا ہوں وہ مرد ہے اس پر سب جائز ہے وہ سب کچھ کر کے بھی بہت مزے سے بولتا ہے کہ میں نے تو کچھ نہیں کیا پر اس سارے عمل میں اگر کوئی مرتا ہے کسی کی روح زخمی ہوتی ہے تو وہ عورت کی ہوتی ہے۔ المیرہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ تابین بھی اس کے اس طرح سے رونے پر رونے لگی۔

پورے ایک ہفتے بعد جنت ہاؤس میں ان کی تینوں پوتیوں اور پوتے کی منگنی تھی۔ دادو کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ بس خیر سے میری المیرہ رہ گئی اللہ اس کے لیے بھی بہت اچھا کرے۔ جنت بیگم بیڈ پر بیٹھی زیورات دیکھتی ہوئی ثانیہ سے مخاطب ہوئیں۔ اماں المیرہ مجھے بہت پسند ہے اور میں اسے اپنے زاویار کے لیے چاہتی ہوں اور خود زاویار نے مجھ سے کہا ہے۔ میری تو بڑی خواہش تھی کہ اپنے مرحوم بھائی کی کوئی بیٹی لوں پر بیٹے کو دیکھ کر چپ ہو جاتی تھی لیکن کل رات زاویار نے مجھ سے خود بولا تو میں بتا نہیں سکتی کہ میں کس قدر خوش ہوں۔ ثانیہ خوشی خوشی ماں کو بتاتے ہوئے بولیں۔ ان کی بات پر جنت بیگم بھی بے انتہا خوش ہوئیں۔ کمرے میں داخل ہوتی تابین ان دونوں کے مابین ہوتی گفتگو سن کر الٹے پاؤں المیرہ کے پاس دوڑی اور اسے آکر بتانے لگی ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا اب الماری ٹھیک کرتی المیرہ بے خودی سے بولی۔ پر المیرہ زاویار بھائی نے خود تمہارا نام لیا ہے وہ میں نہیں جانتی کہ انہوں نے میرا نام کیوں لیا پر میری طرف سے انکار ہے بلکہ یہ بات میں خود زاویار صاحب کو بولتی ہوں۔ وہ کمرے سے باہر نکل کر لان میں چلی آئی جہاں زاویار بیٹھا تھا۔ زاویار صاحب یہ کیا شوشہ چھوڑا ہے آپ نے۔ وہ اس کے پاس آکر سنجیدگی سے پوچھنے لگی وہ جو کرسی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ کیوں شادی کرنا کچھ غلط ہے وہ بھولپن سے پوچھنے لگا۔ آپ سمجھتے کیا ہیں خود کو جب دل چاہے گا نہ بولیں گے جب دل چاہے گا ہاں میں انسان ہوں جیتی جاگتی کوئی کھلونا نہیں۔ آپ کا دل نہیں بھرا کیا میرے جذبات سے کھیل کر جو آپ کو یہ نیا پلان سوجھا۔ مسئلہ کیا ہے آپ مردوں کے ساتھ آپ سمجھتے ہیں کہ محبت عورت کی مجبوری ہے جب چاہیں گے انگلیوں پر نچائیں گے وہ بری طرح سے چیختے ہوئے بولی۔ یہ انداز المیرہ مراد کا نہ تھا اس طرح سے چیخنے پر اس کو لگ رہا تھا اس کی برداشت جواب دے گئی ہے۔ میں جانتا ہوں میں نے بہت غلط کیا اس دن آپ کے ساتھ مجھے خود احساس ہوا کہ میں یہ کیا کہہ گیا۔ مرد کی انا کو بڑی تسکین ملتی ہے جب کوئی عورت اس سے محبت کا اعتراف کرے۔ میں بھی اس وقت کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا پر میں اس وقت حیران ہو گیا جب آپ بہت آرام سے کہہ کر ہاں ساری غلطی میری ہے نکل گئیں نہ آپ جاہل لڑکیوں کی طرح مجھ پر چیخیں چلائیں نہ کوئی طعنہ۔ آپ کی اس وقت کی جو خاموشی تھی وہ مجھے بے چین کر گئی کہ ہاں اگر کوئی مجھ سے اعتراف کر رہا ہے اپنی محبت کا تو یوں کر رہا ہے کہ اسے یہاں لانے میں میرا ہاتھ ہے۔ میرا ضمیر مردہ نہیں تھا کہ میں ڈھٹائی سے اس کو بھلا دیتا اور نہ ہی میں کوئی بزدل مرد تھا کہ جو وقت پڑنے پر ساتھ چھوڑ دیتا۔ میں نے بولا اس وقت ایسا صرف اس لیے کہ میں سننا چاہتا تھا کہ آپ کیا بولیں گی پر آپ تو محبت کے معاملے میں بھی بڑا انا پرست نکلیں چپ چاپ محبت سے دستبردار ہو کر چلی آئیں اگر اس وقت میں ضمیر کو سلا دیتا نہ تو ساری عمر کے لیے یہ ضمیر مجھے نہ سونے دیتا معاف کرنے والا بڑا ہوتا ہے المیرہ مراد اور۔ دیکھو کوئی اتنی بھی دیر نہیں ہوئی کہ وقت ہاتھ سے نکل گیا ہو۔ زاویار کی بات پر المیرہ خاموشی سے پلٹ گئی۔ وہ شکست خوردہ سا اسے جاتا دیکھتا رہا اسے لگا شاید اس نے واقعی دیر کر دی۔

☆......☆

تابین احراز کے ساتھ مال میں شاپنگ کر رہی تھی وہ شاپنگ کم اور الٹی پٹانگ حرکتیں زیادہ کر رہی تھی جس پر وہ مستقل اس سے ڈانٹ کھا رہی تھی۔ تابین احراز اپنے پیچھے سے آتی پکار پر وہ دونوں رک

کر آواز کی سمت دیکھنے لگے۔ وہ ہانیہ تھی مسکرا کر دونوں کے پاس چلی آئی۔ کیسے ہو تم دونوں۔ کیسے آنا ہوا ادھر۔ وہ دونوں کو دیکھتے ہوئے سوال کرنے لگی۔ ہاں وہ بس شاپنگ کے سلسلے میں آئے تھے تابین کچھ جھجکتے ہوئے بولی وہ اسے منگنی کی شاپنگ نہیں بتا رہی تھی۔ احراز مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے کیا تم کہیں بیٹھ سکتے ہو۔ ہانیہ کے کہنے پر وہ تینوں فوڈ کورٹ میں چلے آئے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ ہانیہ کے سر جھکا کر بولنے پر احراز شدید اشتعال میں آ گیا۔ تابین عجب سی کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔ وہ جس کو تم نے میرے ساتھ دیکھا تھا وہ میرے ڈیڈ کے دوست کا بیٹا ہے باہر سے آیا ہوا تھا۔ میری اس سے کافی اچھی دوستی ہو گئی تھی مجھے لگنے لگا وہ اچھا لائف پارٹنر بن سکتا ہے پر میری آبزرویشن بہت غلط تھی اس میں وہ خوبیاں نہیں تھیں جو تم میں ہیں وہ اس کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولی۔ اوہ تو تم اس کو آبزرویشن میں رکھے ہوئے تھیں احراز کے سوال پر وہ سر ہلانے لگی پتا ہے ہانیہ تم جیسوں کے لیے ایک بات فٹ بیٹھتی ہے کہ جو در در بھٹکتے ہیں وہ فقیر ہوتے ہیں ارے تم تو کسی ایک در کی ہو ہی نہیں۔ احراز کے لہجے میں بولتی حقارت کو محسوس کرتی ہانیہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک بات یاد رکھنا ہانیہ کبھی کسی کے منہ پر دروازہ مت بند کرنا اس کی جو اذیت ہوتی ہے ناں وہ بڑی بری ہوتی ہے میں بھی آیا تھا اپنی فریاد لے کر تمہارے دروازے پر سب کچھ اختیار میں تمہارے ہوتے ہوئے بھی تم نے خود اپنے ہاتھوں سے مجھ پر دروازہ بند کیا کہ جاؤ احراز علی میں تمہارے قابل نہیں ہوں کہ تم اپنی فریاد لے کر میرے دروازے تک بھی آؤ اور ایک بات اور جو لوگ دوسروں کو آبزرویشن میں رکھتے ہیں ناں وہ خود تنہا رہ جاتے ہیں کیونکہ کوئی انسان پرفیکٹ نہیں ہوتا۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے جو رہی سہی عزت تھی وہ بھی تم نے ختم کر دی۔ چلو تابین وہ بالکل چپ بیٹھی تابین کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ہانیہ بی بی در در بھٹکنے والے کو فقیر کہتے ہیں اور جو ایک در کا ہو جائے اسے محبوب کہتے ہیں اور میرا محبوب میرے ساتھ ہے احراز بے ساختہ تابین کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ تابین اس کے اس عمل پر بالکل گھبرا گئی۔ ہانیہ شاکڈ کیفیت میں ان دونوں کو دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں چمکتی ملال کی نمی صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ تابین کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔ کرسی پر بیٹھی ہانیہ کو دروازہ بند ہونے کی اذیت کا احساس رلائے دے رہا تھا۔

اب یہ ملال اسے ساری عمر رونا تھا کہ اس نے خود اس نعمت کی قدر نہ کی۔ میں نے کہا تھا ناں احراز وہ دن دور نہیں کہ ہانیہ کو خود احساس ہوگا کہ اس نے کیا چھوڑا ہے۔ تابین گاڑی چلاتے احراز کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ہاں اس نے خود مجھے وہاں تک لا کر چھوڑا جہاں پر میری قدر ہے اس لیے میں اب اس کی ناقدری کا شکر گزار ہوں۔ احراز خوشگوار لہجے میں تابین کو محبت سے دیکھتا ہوا بولا۔ اس کی بات پر وہ مطمئن ہو کر مسکراتی آنکھوں سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

لائٹوں سے جگمگ کرتے جنت ہاؤس کی آج شان ہی نرالی لگ رہی تھی۔ لان میں لگے اسٹیج پر منگنی کی دلہنیں بنی بیٹھیں جنت بیگم کی پوتیاں سب کی نگاہوں کا مرکز تھیں۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھرے تھے۔ دادو کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ نظروں نظروں میں اپنی پوتیوں کی نظر اتار رہی تھیں۔ اسٹیج کے صوفوں پر بیٹھی دلہنوں کی آج چھب ہی نرالی تھی۔ موتیا کلر کے غرارے میں بال کھولی عروش سر پر نزاکت سے دوپٹہ لیے برابر بلیک ڈنر سوٹ میں بیٹھے شجاع کے دل میں اتر رہی تھی۔ برابر بیٹھی المیرہ وہی پنک کلر

مشہور ماہر نفسیات ڈینیل گلومین کا کہنا ہے، کسی انسان کے لیے یہ کافی نہیں کہ اس کی اپنی شخصیت ایسی ہو کہ وہ ذہن اور جذبات کا بہترین استعمال کر سکے حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں صلاحیتیں بہت کم لوگوں میں یکجا ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ جو ذہانت اور جذبات پر بیک وقت قابو پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہی کامیاب ہوتے ہیں، خوش رہنے کا فن جانتے ہیں اور ساتھ ساتھ معاشرتی رویوں پر خوشگوار اثرات مرتب کرتے ہیں۔ (خورشید اقبال، کراچی)

کی گھیر دار فراک اور چوڑی دار پاجامے میں مغلیہ دور کی شہزادی لگ رہی تھی بلیک ڈنر سوٹ میں بیٹھا زاویار المیرہ کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا تم نے مجھے معاف کر دیا ناں۔ جی کر دیا کیا کروں میں بھی مجبور تھی دل کے ہاتھوں المیرہ کے شرارت سے کہنے پر زاویار مطمئن ہو کر ہنس دیا۔ پرپل کلر کے گاؤن میں جس پر ہلکا ہلکا سا کام ہوا تھا اپنے لمبے بالوں کو آگے ڈالی عام دنوں سے ہٹ کر تیار ہوئی صوفیہ برابر گرے سوٹ میں ملبوس خاور کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی کیا مشکل ہے تم ٹک کر نہیں بیٹھ سکتیں سفید قمیص شلوار پر سبز کوٹی میں ملبوس احراز ہلتی جلتی تابین کو ڈپٹتے ہوئے بولا تم کو کیا میری مرضی جواباً اس کو گھور کر دیکھ کر بولی وہ تابین کو دلچسپی سے دیکھنے لگا جو انگوری رنگ کی چھوٹی سی قمیص اور گھیر دار شرارے میں نازک سی گڑیا لگ رہی تھی۔ یہ عروش کیا تاک جھانک میں لگی ہے کھانے کے وقت وہ اسٹیج سے اتر کر اپنے دوستوں کے پاس چلے آئے تھے شجاع اور زاویار کہ ادھر ادھر دیکھتی عروش کو دیکھ کر زاویار اسٹیج کی طرف دیکھتا ہوا شجاع سے بولا۔ رائٹر ہے بھئی اور رائٹر میں ہمیشہ سے دریافت کرنے کے جراثیم موجود ہوتے ہیں شجاع شرارت سے آنکھ مار کر بولا۔ بیٹا ب دھیان رکھنا کہیں یہ نہ ہو کہ اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے محترمہ کوئی ہیرو دریافت کر لیں۔ زاویار کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو۔ چلو اسٹیج پر چل کر بیٹھو ثانیہ دونوں کے پاس آ کر محبت سے بولیں۔ آج تو آپ لوگ قسم سے زیادہ ہی بونی ل لگ رہے ہیں۔ شادو اسٹیج پر کھڑی سب کو دیکھتے ہوئے خوشی سے بولی۔ بونی تل نہیں شادو بیوٹی فل۔ زاویار ہنستے ہوئے بولا۔ ہاں ہاں وہی جی شادو کی بھی تیاری آج دیکھنے والی تھی۔ اماں شادو کی انگریزی اتنی اچھی ہے اس کو اینمل پلانیٹ میں کام کرنا چاہیے جنت بیگم کا ہاتھ پکڑ کے اسٹیج پر آتی ثانیہ ہنستے ہوئے بولیں۔ ان کی اس بات پر شادو کی گردن فخر سے تن گئی۔ ہاں اس کمبخت کو وہی لے سکتے ہیں۔ ہر وقت بندروں کی طرح درختوں پر چڑھی رہے گی۔ دادو کی اس بات پر اسٹیج پر موجود سب نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔ جنت بیگم محبت سے اپنے بچوں کے ہنستے مسکراتے چہروں کو دیکھنے لگیں ان کو لگا وہ آخرت میں بھی سرخرو ہو جائیں گی۔ اپنے بیٹوں بہوؤں کے سامنے کہ انہوں نے ان کی اولادوں کو نہ صرف اچھی پرورش کی بلکہ ان کو اچھے ہاتھوں میں سونپا۔

جنت ہاؤس کے مکینوں کے سکون میں ایک راز چھپا ہوا ہے اور وہ راز یہ ہے کہ یہاں کے مکین پیار کے بول بولتے ہیں۔ ان میں لوگوں کو معاف کرنے کی اعلیٰ صفت پائی جاتی ہے اور لوگوں کے پیار کی قدر کرنا بھی جانتے ہیں یہ لوگ۔ بس جنت ہاؤس کے ہر مکین کے پاس ایک میڈیسن ہے اور وہ ہے پیار کے بول۔ یہ لوگ کم ظرف لوگوں کو بھی اپنے اعلیٰ ظرف کے مطابق پیار کے بول سے نوازتے ہیں کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ پیار کے بول بولنے والوں پر اللہ بہت مہربان ہے بس اس پیار کے بول کی میڈیسن یہ ہر شخص کو دیتے گئے اور آج ان کا اپنا گھر خوشیوں اور پیار سے مہک رہا ہے۔ زندگی میں محبت و خلوص ہو تو ہر گھر جنت ہاؤس بن جائے۔ ☆☆

زندگی کا سفر یقیناً بہت اعصاب شکن عمل ہے کہ اس میں بے شمار لوگ بچھڑ جاتے ہیں' بگڑ جاتے ہیں بدل جاتے ہیں مگر بس یہ اطمینان ہوتا ہے آخری پڑاؤ منزل پر ہی ہوگا۔ تین نسلوں پر محیط سفر کی دلچسپ داستان جو آپ کو دوشیزہ اور دوشیزہ والوں سے جوڑے رکھے گی

دوشیزہ کا دفتر اب طارق روڈ سے شفٹ ہو کر آدم آرکیڈ بہادرآباد آچکا تھا...... دفتر کے ہر کونے کی سجاوٹ'

بہترین کارکردگی پر اسٹیٹ لائف کی شیلڈ وصول کرتے ہوئے سہام مرزا

فرنیچر کا انتخاب امی کا کمرہ کون سا ہوگا' ابو کہاں بیٹھیں گے اس زمانے میں طارق عزیز صاحب نیلام گھر والے اور مرحوم سلیم ناصر صاحب (آنگن ٹیڑھا والے) آفس میں بطور مدیر موجود تھے لہٰذا طے یہ ہوا کہ پہلا کمرہ طارق عزیز صاحب اور اس کے سامنے والا امی کا ہوگا جو بعد میں میرا کمرہ بنا...... ابو اور سلیم ناصر صاحب آخری کمرے میں بیٹھا کرتے درمیان والا کمرہ فرہاد زیدی صاحب کا تھا جو

نسیم فاروقی' مرحوم دانیال' سی' ناصر رضا' مظہر زیاش' مرزا' پروین شروانی صاحبہ

ایم ڈی پی ٹی وی بھی رہے۔ مجھے اپنا دفتر بہت پسند تھا۔ ہال میں مارکیٹنگ والے بیٹھا کرتے تھے جن میں ریاض

ڈاکٹر جہاں آرا' نسیم آمنہ اور رخسانہ سہام

رزا صاحب' پروین شروانی صاحبہ' امتیاز علی صاحب (جو بجیا کے ڈراموں میں اکثر ہوتے تھے) جعفر بھائی یہ لوگ بیٹھا کرتے سب سے زیادہ رونق اور ہلا گلا اسی کمرے میں ہوتا تھا ایک بار فرید نواز بلوچ مرحوم (دانش اور یاسر نواز کے والد) آفس آئے تو ابو ان کو بڑی خوشی سے سب سے ملوا

رہے تھے جب امی سے تعارف کا موقعہ آیا تو ابو نے امی
سے پوچھا۔ ''رخسانہ بتاؤ یہ کون ہیں؟'' (ویسے مجھے ابو کی
یہ بات ہمیشہ بڑی پریشان کرتی تھی بعض اوقات آپ
کے ذہن میں اس شخص کا نام نہیں آتا اور بڑی شرمندگی
ہوتی ہے) بہرحال امی کی خود اعتمادی پر تو کتابیں لکھی
جاسکتی تھیں فوراً بولیں ہاں سہام انہیں کون نہیں جانتا یہ نادر
جسکانی ہیں یہ سن کر ابو تو جو شرمندہ ہوئے سو ہوئے فرید نواز
بلوچ مرحوم بہت گڑبڑائے' اصل میں نادر جسکانی سندھ کا
بہت بدنام ڈاکو تھا۔ سن 83 میں سچی کہانیاں کا اجرا ہوا اور
اس کے بعد پندرھویں صدی' شوبزنس' میڈیکل ورائٹی اور
بچوں کا رسالہ' شوبزنس کی وجہ سے ہر وقت دفتر میں ٹی وی

لکھاریوں کو عزت نہیں دیتے تھے وہ بچوں بڑوں سب کا
احترام کرتے تھے۔ اس زمانے میں تو کوئی سوچ بھی نہیں
سکتا تھا کہ بچوں کو اتنی اہمیت ملے گی کہ ان کے انٹرویوز
بڑوں کی طرح شائع ہوں گے۔ ہر مہینہ دوشیزہ کے اولین
ایجنٹ مجیب صاحب شہروں کی ریکارڈ سیل پر تمام آفس
اسٹاف کو لنچ دیا کرتے...... اس دن بہت چہل پہل ہوتی
کئی قسم کے کھانے بڑی سی میز پر سج رہے ہوتے جہاں
سب ابو کی موجودگی میں کھانا کھاتے۔ کیا دن تھے' اُن
قہقہوں کی گونج اب بھی میرے کانوں میں موجود ہے۔
اتنی دعوتیں اتنے فنکشن ہوتے تھے کہ شاید ہی کوئی شام تھی
جو گھر پر گزرتی' اور اگر ایسا کوئی دن ہوتا تو گھر پر کسی نہ کسی

تصویر میں عابدہ رؤف اور سیما غزل نمایاں ہیں

اور فلم سے جڑے لوگوں کی آمدورفت رہتی تھی۔ ابو نے
فیصلہ کیا کہ بچوں کے رسالے پر اپنی کلاس میں فرسٹ
آنے والے بچے کی تصویر انہی بڑی شخصیات کے ساتھ
ہوگی تو ایک طرف دفتر میں مشہور شخصیات کے انٹرویوز
ہو رہے ہوتے اور دوسری جانب چھوٹے چھوٹے ذہین
بچے اپنی رپورٹ کارڈ کے ساتھ منتظر ہوتے کہ کب اُن کا
انٹرویو لیا جائے۔ اب احساس ہوتا ہے کہ ابو صرف

کی دعوت ہوتی۔ کتنی جلدی وہ خوبصورت اور اچھے دن گزر
گئے اب تو واقعی میں خواب لگتے ہیں لگتا ہی نہیں کہ کبھی ایسی
زندگی بھی گزاری تھی نہ وہ لوگ رہے نہ وہ محفلیں......

''یاد ماضی عذاب ہے یارب''

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کا سلسلہ تواتر سے جاری تھا۔
پروین شروانی اور ریاض مرزا صاحب کی انتھک محنت نے
ادارے کو وہ عروج عطا کیا کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں

رہ گئے۔ پیور سلک کی پلین ساری میں موتیوں کی مالا پہنے

سیما غزل اور طارق بٹ انور مقصود صاحب کا انٹرویو لیتے ہوئے

جب پروین آنٹی آفس میں قدم رکھتیں تو ہر جانب جیسے
روشنی ہی روشنی ہوتی۔ لبوں پر سرخ لالی اور سیاہ تراشیدہ

سیما غزل اور رینٹ کے ہاشمی صاحب کے ساتھ

زلفوں کو سنبھالتی وہ واقعی میں مارکیٹنگ ہیڈ تھیں۔ اُن کا

ڈیپارٹمنٹ خوب پھل پھول رہا تھا دوشیزہ کے فنکشن میں
کفنوں کی بھرمار ہوتی گل احمد اور الکرم والے اپنے پورے
پورے تھان فی بندہ بھیج دیا کرتے' فلپس' شان مصالحے
'ڈان بریڈ' پی آئی اے' نیشنل بینک اور دیگر بے شمار

اشتہاری کمپنیوں کی مصنوعات تحفوں میں دی جارہی ہوتیں......ابو کا ارادہ تھا کہ جلد وہ اپنے بہترین لکھاری کو گاڑی تحفے میں دیں گے......وہ گاڑی نہیں جو آج کل مختلف گیم شوز میں دی جاتی ہے بلکہ اصل گاڑی مختلف کمپنیوں سے بات چیت چل رہی تھی کہ اچانک ایک دن ضیاء الحق مرحوم کے پریس سیکریٹری جناب صدیق سالک مرحوم کا فون آگیا کہ مرزا صاحب آپ اور بیگم صاحبہ فوراً اسلام آباد پہنچیں، کچھ گرم کپڑے رکھ لیں شاید صدر صاحب کے ساتھ چین جانا پڑے۔ پاسپورٹ ہمراہ لایئے گا۔ ای ابو اسلام آباد چلے گئے۔ ضیاء الحق صاحب سے ملاقات ہوئی انہوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اخبار نکالیں...... پریس کے لیے جگہ اور دیگر سہولیات میں فراہم کروں گا

ایڈیٹر کرسی سنبھال لی اب شب و روز مختلف تھے شوبزنس ناصر رضا صاحب کے حوالے کردیا گیا۔ سچی کہانیاں اور دوشیزہ دانش دیروی اور شمیم نوید مرحوم کی ذمہ داری بنا اور طارق عزیز پندرہویں صدی کو پیارے ہوگئے' دن ورات کی کڑی محنت کے بعد سویرا اخبار کی ڈمی شائع ہوگئی۔ ابو صبح اسٹیٹ لائف جاتے 3 بجے دوشیزہ کے آفس اور پھر جب پریس پر پرنٹنگ مکمل ہوجاتی تو صبح کے 4 بجے گھر آجاتے....(اس انتھک محنت کا صلہ ان کو اخبار کی کامیاب اشاعت کی صورت مل رہا تھا)۔ میں ابو کے ساتھ پریس چلی جاتی تھی کیونکہ مجھے یہ ڈر رہتا کہ وہ دل کے مریض ہیں اُن کی دوائیں ہمہ وقت میرے پاس موجود رہتیں کون سی دوا کب زبان کے نیچے رکھنی ہے میں

شہناز انور شفا' طلعت آفتاب اور نسیم آمنہ

چین جانے کا ارادہ تھا مگر میں جونیجو کی حکومت گرا رہا ہوں لہٰذا بتایئے فوری طور پر اخبار کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے۔ ابو نے کہا صدر صاحب آپ ٹیلی پرنٹرز کی لائنیں لگوادیں میں اخبار شائع کردوں گا بے فکر رہیے۔ راتوں رات ٹیلی پرنٹرز کی لائنیں ڈال دی گئیں۔ دیوہیکل جنریٹر آدم آرکیڈ کے احاطے میں اتار دیا گیا۔ ضیاء الحق صاحب کے بہترین دوست ضیاء السلام انصاری صاحب نے بطور

بخوبی واقف تھی اس لیے ابو کا سایہ بنی رہتی......اخبار کی اشاعت سے پہلے ہی ضیاء الحق صاحب کے طیارے کا حادثہ ہوگیا سب نے ابو کو منع کیا کہ سہام اخبار کا خیال چھوڑ دو مگر وہ نہ مانے اور اپنے بل بوتے پر سویرا کی اشاعت شروع کردی۔ وہ دفتر جہاں قہقہے گونجا کرتے تھے......شام کی چائے پر کبھی اسماعیل شاہ' اظہار قاضی' عائشہ ریاست ہوتیں تو کبھی نذیر ناجی' فراست رضوی' محسن بھوپالی'

وسعت اللہ' سردار قریشی صاحب' جمال احسانی مرحوم موجود

عائشہ ریاست' فرزانہ رحمان مرحومہ' ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور سحر انصاری صاحب

ہوتے اب وہاں ایک افراتفری کا عالم تھا۔ اخبار کا عملہ بالکل الگ تھا اور رسالوں کے لوگ بالکل الگ کبھی کبھی

محسن بھوپالی مرحوم' ظہیر صاحب' اسلم صاحب مرحوم' پرویز بلگرامی' سلیم اختر صاحب

مدیران کو دیکھ کر لگتا جیسے رضیہ غنڈوں میں پھنس گئی ہے۔

سویرا کے بعد شام کا اخبار انجام بھی پوری سج دھج کے ساتھ منظر عام پر آگیا تھا۔

روزنامے اور ڈائجسٹ والوں کا تعلق حالانکہ ایک ہی میڈیم سے ہے جس کو پرنٹ میڈیا کہتے ہیں مگر مزاجوں

میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک   بہت ٹھہراؤ پایا جاتا ہے اور اخبار میں کیونکہ روزنئی خبر درکار

عابدہ روف صاحبہ اور آرٹسٹ عذرا فاطمی صاحبہ

دن پرانا اخبار پکوڑے لپیٹنے یا چنے رکھنے کے کام آتا ہے۔   ہوتی ہے اس لیے اس سے وابستہ لوگ عام طور سے کچھ
مگر ڈائجسٹ کو پڑھنے والا سالوں ڈائجسٹ کو سینت   جلد باز محسوس ہوتے ہیں۔ خیر آ ہی گیا وہ شاہکار جس کا تھا

شوکت صدیقی صاحبہ اور ذکیہ آنٹی (ہمشیرہ منورہ نوری)

سینت کر رکھتا ہے۔ لہٰذا اس میں کام کرنے والوں میں بھی   انتظار اخباروں کی سیل میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور ایک

وقت وہ بھی آیا جب سویرا ایک ہی دن میں دو بار چھپنے لگا۔   اشتہارات اور کاغذ کا کوٹہ کینسل ہو گیا۔ یہ وقت بہت سخت

منورہ نوری خلیق مرحومہ اور رخسانہ سہام مرزا

ابو کی ساری توجہ اخباروں کی جانب تھی۔ صحت گر رہی تھی'   تھا اکاؤنٹ صفر رہ گئے تمام گاڑیاں بک گئیں ابو نے پیدل
دوشیزہ سمیت تمام ڈائجسٹ عدم توجہی کا شکار ہونے   دفتر جانا شروع کر دیا ہمارے بچپن کے ڈرائیور شیر گل روز

ایک لنچ کی یادگار تصویر...... صبیحہ شاہ صاحبہ' طلعت آفتاب' سہام مرزا مرحوم اور محسن بھوپالی مرحوم

لگے...... پھر حکومت وقت کو سویرا کی کسی خبر پر غصہ آ گیا اور   اسی طرح ڈیوٹی پر حاضر ہوتے اور ابو کے پیچھے پیچھے ان کا

بریف کیس لے کر پیدل دفتر کی طرف روانہ ہوجاتے۔
امی اس دوران شدید ڈپریشن کا شکار ہوگئیں پرچے ایک
ایک کر کے بند ہوتے چلے گئے۔ مگر دوشیزہ اور سچی کہانیاں
شیر گل کی طرح وفادار رہے...... دوست احباب سب نے
ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ دفتر جہاں ابو کے پاس کام ہونے کے
لیے وقت نہیں ہوتا تھا اور وہ سارا کام گھر لا کر پوری پوری
رات جاگ کر کرتے تھے اب وہاں سناٹوں کا راج تھا......
دانش انکل دوشیزہ اور سچی کہانیاں کو سینے سے لگائے بیٹھے
تھے۔ اسی دوران امی شدید بیمار ہوگئیں اور کومے میں چلی

کے تلووں میں جا بجا چھید تھے پاؤں زخمی تھے میری ہمت
ہی نہیں ہوئی کہ میں اپنے باپ سے آنکھیں ملا سکتی
خاموشی سے جوتے اُتار کر اپنے دوپٹے سے صاف کیے
اور شیر گل کے ہاتھ موچی کے پاس بھجوا دیے۔ مگر اس دن
پھر اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ ابو کے رسالوں کو جان دے
کر پروان چڑھاؤں گی۔ بڑوں سے سنا تھا کہ جب
جوتے پھٹ جاتے ہیں تب یقین رکھو حالات ضرور
بدلتے ہیں......اور پھر واقعی میں سب اچھا ہوتا چلا گیا۔
اب نئے لوگ تھے دفتر پرانا تھا......گاڑیاں بھی آگئیں اور

تینوں مدیران مرحوم دانش دیروی، سلیم فاروقی اور پرویز بلگرامی امجد اسلام امجد کی آفس آمد پر

گئیں۔ یہ دہری پریشانی تھی جس نے ہم سب کے
اعصاب شل کر دیے۔ میری عادت تھی میں ابو کے گھر
آتے ہی اُن کے جوتے اُتارا کرتی تھی بیٹیاں ویسے بھی
باپوں کی لاڈلی ہوتی ہیں اور اپنے ہاتھوں سے اُن کے کام
کر کے خوش ہوتی ہیں۔ کچھ عرصے سے وہ مجھے ایسا کرنے
سے روک رہے تھے ایک دن میں نے ضد کر کے اُن کے
جوتے اتارے تو میں یہ دیکھ کر گنگ رہ گئی کہ ان کے جوتوں

گھر اور دفتر کی ویرانی بھی دور ہوگئی۔ 99ء میں برسوں کار کا
دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ مدیر سیما
غزل اور عابدہ رؤف تھیں عابدہ آنٹی سنجیدہ مزاج چہرے پر
نرم سے مسکراہٹ لیے کام میں مصروف رہتیں اور
سیما غزل جن کی ہر انگلی میں ایک خوبصورت انگوٹھی
آنکھوں میں چمک اور چہرے پر شیطانی ہمہ وقت موجود
رہتی دوشیزہ کو روز بروز نکھار رہی تھیں۔ پرویز بلگرامی اور

دانش دیروی اپنی اپنی کرسیوں پر براجمان تھے......ایک بار

محترم اتا کا عاصفہ اتا کا بجیا اور سہام مرزا مرحوم

پھر رنگ، خوشبو اور ہنسی کی جلترنگ دفتر میں بکھرنے لگے۔
دوشیزہ اور سچی کہانیاں پورے طمطراق سے اپنی چھب

ایام جوانی، طارق عزیز صاحب اور قمر علی عباسی مرحوم

دکھانے لگے......99ء میں جب دوشیزہ کا فنکشن ہوا تب

میں نے سپاس نامہ پیش کیا ابو نے بڑی محنت کروائی تھی
کیونکہ میری زبان ویسے تو بہت صاف تھی مگر ہوں تو
حیدرآبادی بس ق اور خ پر آج بھی پھسل جاتی ہوں لہٰذا
انہوں نے سپاس نامے میں ایسا کوئی لفظ ہی نہیں لکھا جو ق

پارخ سے شروع ہوتا ہو۔ ویسے یہاں مجھے اپنی اُردو کی بہت

مروڑتی جاتیں اور کہیں لکھی لڑکیاں......اب میں نے

دوشیزہ کے اولین ایجنٹ مجیب صاحب ہمراہ فریدہ مسرور اور غزالہ رشید

پیاری ٹیچر مس عزیزہ یاد آ رہی ہیں اُن کا تعلق بھی دکن سے
تھا اور جب وہ املا ٹیسٹ لیتیں تو پوری کلاس فیل ہوجاتی

باقاعدہ طور پر دفتر کی ذمہ داری سنبھالنا شروع کردی تھی۔
پابندی سے آفس، پھر مختلف فنکشنز میں ابو کے ساتھ جانا

حکیم ناصر اور سہام مرزا مرحوم

تھی کیونکہ سب خبر کو قبر اور قبر کو خبر لکھتے ...... مگر وہ کان

مجھے سب سے زیادہ مزہ قمر علی عباسی انکل کی بک لانچ میں

آتا تھا وہ ہر سال امریکہ سے آ کر ایک کتاب شائع کرتے

ابو خاموشی سے کہیں آخری نشستوں پر بیٹھ جائیں گے

نیر گل جو ہمیں اسکول لے جاتے رہے پھر دانیال زین کو بھی......

اور بڑے دھوم دھڑکے سے اُس کی رونمائی کرتے میرے
اور ابو کے لیے فرنٹ صوفہ مختص ہوتا۔ نیلوفر آنٹی ہمیشہ

نیلوفر آنٹی اور قمر علی عباسی مرحوم سے بچپن کا تعلق تھا جب وہ
حسن اسکوائر پر رہتے تھے بچپن کی یادیں اور لوگ، بہت قیمتی

رضوانہ پرنس، رضیہ مہدی، نگہت نسیم

آہستہ سے کہتیں منزہ آگے بیٹھنا وہ جانتی تھیں کہ میں اور

ہوتے ہیں اسی لیے جب 2012ء میں امریکہ گئی تب

عباسی انکل کے گھر جانے کی بہت کوشش کی مگر بھانجی کی شادی نے موقعہ نہ دیا مجھے آج بھی عباسی انکل کے وہ جملے یاد ہیں۔

"یار آ جاؤ بڑی یاد آتی ہے۔" اور اب مجھے ان کی بہت یاد آتی ہے ہمیں اپنے پیاروں کے لیے ضرور وقت نکالنا چاہیے ورنہ شدید پچھتاوا رہتا ہے۔

اللہ نے مجھے دو شہزادوں سے نوازا دانیال اور زین بیٹے تو وہ میرے تھے مگر قبضہ ابو کا تھا۔ اب اُن کی زندگی کا محور صرف یہ دونوں تھے۔ دفتر اور دفتر سے گھر...... اُن کی ہر

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کے موقع پر پروین شروانی ہمراہ سید صاحب (نصف بہتر)

بات اور ہر سوچ صرف دانیال زین کے گرد ہی گھومتی تھی نہ میں ابو کے سامنے ان دونوں کو ڈانٹ سکتی تھی نہ کوئی سختی کر سکتی تھی۔ امتحانوں کے دنوں میں ایک دن دانیال کی پٹائی کر دی تو ابو آنکھوں میں آنسو لے کر آ گئے میں نے انہیں اس طرح بکھرتے تو اس وقت نہیں دیکھا تھا جب جوتوں میں چھید ہو گئے تھے۔ جب اپنے پرائے ہو گئے تھے...... جب صبح و شام بس رات کا ہی منظر رہتا تھا' انہوں نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ میں بچوں کو کبھی نہیں ماروں گی۔ "سوری ابو میں نے بہت بار وعدہ خلافی کی اور اب تک کرتی ہوں۔"

اب فریدہ مسرور اور سونیا دوشیزہ کی تزئین و آرائش میں معروف تھیں اور زندگی سبک خرامی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ انسان بھی بڑا عجیب ہے پریشانیوں پر سہم جاتا ہے' ٹوٹ جاتا ہے مگر اچھے دن آنے پر سارے دکھ اور درد بھول کر پھر سے کھڑا ہو جاتا ہے نئے دکھوں کو جھیلنے کے لیے......

2001ء یہ روح فرسا خبر ہم سب کی سماعتوں پر بجلی بن کر گری کہ ابو کو پیٹ کا کینسر ہو گیا ہے اور بقول ڈاکٹرز کے زندگی کے صرف چھ ماہ ان کے پاس ہیں۔ شوکت خانم ہسپتال لاہور اور آغا خان کراچی میں علاج شروع ہوا' 'وقت متعین ہے نیند رات بھر کیوں نہیں آتی" مجھے زندگی میں پہلی اور آخری بار اپنے رب سے شکوہ ہوا جب تک انسان کو عقل نہیں ہوتی وہ رب سے شکوے کرتا ہے مگر اللہ اپنے بندے پر پنا فضل کر دیتا ہے تب صبر کی بھاری سل سینے پر دھر جاتی ہے اور یہی بھاری سل اصل میں زندگی کا نچوڑ ہے باقی سب پانی کا بلبلہ...... میں رو رو کر دنیا بنانے والے سے اُن کی زندگی مانگتی رہی اور وہ آنکھوں میں بے بسی لیے دانیال' زین کو تکا کرتے ایک دن میں نے بہت ہمت کر کے پوچھا ابو اللہ سے کوئی گلہ ہے آپ کو تو بولے

بس یہی کہ مجھے کچھ وقت اور دے دیتے دانیال زین 18 سال کے ہو جاتے تو میں سکون سے مر جاتا...... یہ بات تو مجھے جلتی دھوپ میں ننگے سر اور ننگے پاؤں کھڑے ہونے پر سمجھ میں آئی کہ وہ اپنے نواسوں کا شناختی کارڈ کیوں اپنے سامنے بنوانا چاہتے تھے۔ دراصل ہمارے آس پاس ہی ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے ہیت تو انسانی ہوتی ہے مگر وہ وحشی درندے ہوتے ہیں' خون آشام بلاؤں جیسے...... جو کسی کا بھی حق بہت آرام سے ہڑپ کر لینا جانتے ہیں...... چھ ماہ کے اندر اندر ابو نے اس دنیا کو خیر باد

اپنے آپ کو موت کی طرف بڑھتا دیکھے مگر ابو نے اور میں نے یہ بھی دیکھا دنیا سے وہ جا رہے تھے اور سانسیں میری اٹک رہی تھیں۔ ابو کے انتقال کے بعد جب پہلے دن آفس گئی تب اُن کا لکھا آخری چیک کا کاؤنٹر فائل میرے سامنے تھا۔ "میرے کفن دفن اور کھانے کے پیسے۔" روز سارا اسٹاف گھر آ جاتا کوشش کرتے مگر آنکھوں کی نمی نہیں چھپا پاتے۔ بڑا مشکل ہوتا ہے روز کسی کو قطرہ قطرہ پگھلتا دیکھنا...... روز صبح دفتر آنے والوں سے اُن کی خیریت پوچھتے اب آواز فون پر بھی دھیمی ہو رہی تھی۔ شیر گل ان

تیسری نسل زین شمسی اپنی مانو کے ساتھ......

کہا۔ بہت دردناک تھا وہ آخری دن جب وہ دفتر سے اٹھے سب کو خدا حافظ کہا اور کہا کہ اب دفتر کی سیڑھیاں چڑھنا ممکن نہیں تم لوگ سنبھالو گے اب اس آفس کو...... کتنا مشکل ہوتا ہے جب انسان کو پتہ چل جائے کہ لب وقت رخصت ہے وہ اب اُن راستوں پر کبھی نہیں لوٹ سکے گا۔ جہاں سے روز گزرتا تھا۔ سب منظر بدل جائیں گے' ابو کی بیماری کے دنوں میں مجھے احساس ہوا کہ اللہ کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک نعمت موت کا بتا کے اچانک آ جانا ہے انسان آج بھی اتنا مضبوط نہیں کہ لمحہ لمحہ

کے سارے ذاتی کام کر رہے تھے۔ بہت عزیز تھے انہیں شیر گل اور شیر گل نے بھی حق ادا کیا۔ کینسر بڑھتے بڑھتے سانس کی نالی تک آ گیا تھا غذا حلق سے نہ اترتی اور نوالے میرے گلے میں پھنس جاتے...... اللہ دشمن کو بھی باپ کے سائے سے محروم نہ کرے...... برسوں میں اُن راستوں پر جہاں ابو ساتھ ہوتے تھے جا کر دیکھتی تھی کہ ٹنڈ منڈ درخت ویسے ہی کھڑا ہے بھاری سا پتھر برسوں اسی جگہ پڑا رہا نہیں تھے تو میرے دوست میرے باپ جن کی زندگی جہد مسلسل تھی۔ کیا انسان اس جھاڑ جھنکار اور پتھروں سے بھی

گیا گزرا ہے کہ وہ زمین پر موجود رہتے ہیں اور انسان چلا جاتا ہے...... اور مجھے اپنے اس سوال کا جواب ہمیشہ ہاں ہی کی صورت ملا انسان تو سب سے کمزور ہے...... مگر مانتا نہیں۔ ابو نے اپنی محنت اور اپنی محبت دونوں میرے اندر اتار دی۔ وہ جنون وہ عشق جو انہیں دوشیزہ اور پھر سچی کہانیاں سے تھا مجھے ورثے میں ملا...... میں فریدہ مسرور اور غزالہ رشید کے ساتھ اس سفر پر نکل کھڑی ہوئی۔ جو وہ ادھورا چھوڑ گئے تھے۔ سلیم فاروقی مرحوم ناصر رضا صاحب کاشی چوہان' رضوانہ پرنس اور پرویز بلگرامی بھی اس سفر کا حصہ بنے رہے۔ دوشیزہ اور سچی کہانیاں تو تناور درخت تھے...... مگر دانیال زین بہت معصوم بہت چھوٹے' میری زندگی کا مقصد دوشیزہ کی چھاؤں میں اپنی اولاد کو پروان چڑھانا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی جن بچوں کو مارنے پر ابو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اُن کی تربیت میں کوئی کمی رہ جائے۔ زندگی کا سفر اکیلے ہی کاٹنا ہوتا ہے...... ہر شخص اپنی پیٹھ پر اپنا بوجھ لادے ہوئے ہے۔ میں بھی اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہی ہوں۔ آج اُن کا نواسہ یعنی تیسری نسل نے دفتر کی تقریباً ساری ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں.... لوگ کہتے ہیں مرزا صاحب آپ کے تو بیٹے نہیں کون سنبھالے گا یہ سب؟ کیوں کرتے ہیں اتنی محنت؟ تب وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتے مگر ایک نظر مجھ پر ضرور ڈالتے اور مجھے لگتا جیسے اُن کی آنکھیں کہہ رہی ہیں سونی سنبھالے گی یہ میرا بیٹا ہے۔ ابو میں اعتراف کرتی ہوں ساری زندگی بھائی کی کمی بہت محسوس کی آپ کے جانے کے بعد بہت سال ڈرتی بھی رہی لڑتی بھی رہی' ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی بھی رہی' مگر اب نہیں...... بیٹیاں کمزور نہیں ہوتیں وہ والدین کے ورثے کو سنبھالنے کی اہل ہوتی ہیں۔ میں نے جو ابو سے سیکھا تھا وہ ان کے شکریے کو لوٹا دیا ہے۔ دانیال کو منصفی کا شوق چرایا ہے وہ دن بھی میری زندگی کا بہترین دن ہوگا جس دن وہ عدالت میں یہ کرسی سنبھالے گا اور ایمان داری سے فیصلے کرے گا۔ مجھے یقین ہے اس دن میں ابو سے آنکھیں ملا سکوں گی۔

درحقیقت ان کے نواسوں کو اس قابل کر کے کہ وہ ابو کے ادارے کی باگ دوڑ پوری طاقت سے سنبھال سکیں میں نے ان کے زخمی پیروں پر پھاہے رکھنے کی کوشش کی ہے اور اب میں ان سے آنکھیں چرانے نہیں بلکہ ملانے کے قابل ہوں جانتی ہوں یہ سفر یونہی جاری و ساری رہے گا۔ کیونکہ یہ دوشیزہ کا سفر ہے جو کہنے کو تو دوشیزہ ہے مگر اس کی زندگی سخت جدوجہد' لگاتار محنت' ناکامیوں اور کامیابیوں سے مرقعہ ہے تبھی تو ایک صدی کا سفر طے کر کے بھی دوشیزہ ہی ہے۔

آخر میں ان تمام لوگوں کا دل سے شکر ادا کرنا چاہتی ہوں جو اس سفر کا حصہ تھے' ہیں اور رہیں گے۔ میں دوشیزہ فیملی سے جڑے ہر رائٹر کی ممنون و مشکور ہوں جن کے ساتھ کے بغیر یہ سفر ممکن نہ تھا۔ میں ابن حسن پریس' جنانی بائنڈرز' عکس فلم میکرز' ممتاز صاحب' مظہر آرٹسٹ اور دفتر میں موجود ہر اُس شخص کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے ہمیشہ ادارے کا ساتھ دیا۔ حالانکہ دوشیزہ کا ساتھ دینا کافی مشکوک بنا دیتا ہے مگر یہ وہ واحد دوشیزہ ہے جس کا ساتھ معتبر کرتا ہے۔

دوشیزہ کا سفر ایک صدی پر محیط ہے کچھ لوگوں کا ذکر کر سکی کچھ کے نام میری کوتاہ بینی کی وجہ سے رہ گئے حقیقتاً اس سفر کو تحریر کرنا ایسے ہی ہے جیسے دریا کو کوزے میں بند کرنا لہٰذا جن لوگوں کا ذکر میری تحریر میں نہیں میں ان سے معذرت خواہ ہوں وہ میری تحریر میں نہیں مگر میرے دل میں موجود ہیں اور جب سامنا ہوگا تب وہ یہ مان بھی جائیں گے...... میں اپنے پڑھنے والوں سے امید رکھتی ہوں کہ وہ اپنی قیمتی آرا سے مجھے ضرور نوازیں گے۔ یہ شعر آپ سب کی نظر

منافقت کا نصاب پڑھ کر محبتوں کی کتاب لکھنا
بڑا کٹھن ہے خزاں کے ماتھے پر داستانِ گلاب لکھنا

☆☆......☆☆

افسانہ

ام ایمان

واپسی

”چھ ماہ کا تھا جب ظالموں نے اس کو ماں سے جُدا کر دیا تھا لیکن وہ لوٹ آیا، ماہ و سال اور مذہب بھی رکاوٹ نہ بنا... بیشک وہ خوش نصیب ماں تھی... “

میری بیوی میرے ہزار کہنے پر بھی ابتسام اور قاسم کو ساتھ لانے پر تیار نہیں ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے لیکن آئے گا، اسے امید تھی انشاء اللہ امید ہے اور ہمیشہ رہے گی یہ

کہتے ہوئے اس کی آنکھیں عجیب انداز میں جگمگانے لگتی تھیں مجھے اس کی امید سے جگمگاتی آنکھیں ایک طرح شرمندہ کر دیتی تھیں کیونکہ جب بھی میں نے اپنے دل کا جائزہ لیا تھا امید کو اتنا روشن کبھی نہیں پایا۔

تم اپنے بیگ میں کیا رکھ رہی ہو؟

میں اسے بیگ میں ایک ہفتے سے کچھ نہ کچھ رکھتے دیکھ رہا تھا اس کی تیاری عروج پر تھی لیکن وہ اپنے اس جوش اور جذبے کو ہر ایک سے چھپا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی...... ایک نوٹ بک اس کے بیگ کے ساتھ رکھی تھی۔ اس دن مقررہ تاریخ میں ابھی دو دن باقی تھے...... میں نے کام پر جانے سے پہلے اس کی نوٹ بک کو اٹھایا...... خدیجہ باورچی خانے میں میرے لیے کافی بنا رہی تھی۔

میں نے اس کی یاددہانی کے نکات پر نظر ڈالی جو کچھ یوں تھی۔ چاکلیٹ دودھ کا ڈبہ، خوشبو کی شیشی، تصاویر، ایک بالوں کا برش۔

ہونہہ...... تیاری تو دیکھو جیسے وہ وہاں اسے ملنے دیں گے۔ مجھے تو ذرا بھی امید نہیں ہے۔ پتہ نہیں وہ وہاں ہے بھی یا نہیں...... اللہ کرے جو بھی ہو وہ ایسا سا ہو کہ اس کے اعصاب اسے سہار سکیں۔

لیجیے جناب آپ کی گرما گرم کافی حاضر ہے

خدیجہ کا جوش و جذبہ اور خوشی چھپائے نہ چھپتی تھی۔

میں نے کن انکھیوں سے اس کو دیکھا اور کافی کا پیالہ تھام کر کمرے کے واحد دریچے کی طرف رخ کیا۔ اس دریچے کے سامنے کوئی منظر دور تک کھلا نہ تھا۔ ننھا سا صحن اور پھر اس کی دیوار...... ہمارا ایک کمرے کا یہ ننھا سا گھر جس میں ہم کئی مہینوں سے رہ رہے تھے۔ لیکن اس سے پہلے مقدس شہر القدس کا محلّہ ”المغربیہ“ جہاں ہمارا خاندانی گھر تھا۔ جس کے سامنے کا باغ تو بڑا تھا ہی لیکن پایاں باغ بھی ہمارے اس موجودہ گھر کا چار گنا تو ہوگا۔

مجھے دریچے کے سامنے بیرونی دیوار پر اپنے گھر کے سارے منظر نظر آنے لگتے۔ زیتون کے درختوں اور سیب کی خوشبو سے مہکتا ہوا ہمارا گھر دادا عماد الدین کی سفید براق داڑھی جو مسلسل ہلتی رہتی تھی جب وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر ہمارے کھیل سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ چچا ہشام جن کی پیشانی اور کھڑی ناک ان کے مراکش نسل سے ہونے کی گواہی دیتی تھی۔ دادا تو ہم کو بار بار یہی بتاتے تھے ورنہ ہمیں چچا ہشام کی وسیع پیشانی اور کھڑی ناک سے زیادہ ان کی توپ کی جیبوں اور ان کے نئے نئے طرح کی کھیلوں کی ایجاد سے دلچسپی تھی۔

دادا، بابا، ہشام چچا اور مجھے شام کو قہوہ کی چسکیوں میں اکثر اس بات کی چھوٹی چھوٹی تفصیل سنایا کرتے تھے جب ان کا خاندان مراکش سے سلطان صلاح الدین ایوبی کے جھنڈے تلے مسلمانوں کو صلیبیوں کے ظلم سے نجات دلانے کے لیے آ کر شامل ہوا۔

یہ جولائی ۱۱۸۷ کی بات ہے جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں سے حطین کی فیصلہ کن جنگ لڑی اور انہیں شکست فاش سے دوچار کیا۔ اور اکتوبر ۱۱۸۷ میں فاتحانہ اسلامی افواج اپنے امیر کے ساتھ فلسطین میں داخل ہوئیں۔

دادا جان! تو کیا اس سے پہلے فلسطین میں مسلمان حاکم نہیں تھے۔ میں حیرانی سے پوچھتا۔

کیوں نہیں تھے میرے بیٹے مسلمانوں نے تو حضرت عمرؓ کے دور میں پندرہ ہجری ۶۳۶ء میں ہی فلسطین فتح کر لیا تھا اور امیر المومنین نے خود یروشلم آ کر وہاں کے صلیبی بطریق سے شہر کی چابیاں لی تھیں جو اس نے ایک معاہدے کے بعد خود حضرت عمرؓ کے حوالے کی تھیں اور خاص بات یہ کہ اس وقت

مسلمانوں نے بغیر کوئی خون بہائے یہ کامیابی حاصل کی تھی۔

حضرت عمرؓ کو وہاں کے لوگوں نے یوں اپنے شہر کی چابیاں دے دی تھیں؟ میں حیرانی سے پوچھتا......

ہاں میری جان عیسائی بطریق نے ہتھیار ڈالنے کی یہ بھی شرط رکھی تھی کہ امیر المومنین خود آ کر اس کے ہاتھ سے شہر کی چابیاں لیں۔ اس وقت مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان وہ مشہور معاہدہ ہوا جسے تاریخ میں ''عہد العمریہ'' کہا جاتا ہے۔

یہ کس بات کا عہد تھا؟

اس سوال کے پوچھنے والے چچا ہشام تھے۔

دادا ہلکی سی مسکراہٹ سے ان کو دیکھتے اور سوال کی تہہ میں بیٹھا ہوا مقصد پا جاتے۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کا جواب دیتے۔ اس معاہدے کی رو سے مقامی آبادی کو پہلی بار مذہبی آزادی حاصل ہوئی اور ان کے کلیساؤں کو بھی تحفظ دیا گیا۔ مسلمانوں کے حسن سلوک سے یہاں کی پوری آبادی جو کنعانیوں اور فلسطینیوں پر مشتمل تھی مسلمان ہوگئی اسی دور میں مقام معراج پر گنبد صخری جیسی خوبصورت عمارت تعمیر کی گئی۔

مقامی آبادی عرب سے آنے والوں کے ساتھ ان کے انصاف اور رواداری کے باعث خوب گھل مل گئی۔ خوشحالی کا دور شروع ہوا اب مقامی اور غیر مقامی کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ عربی زبان سب کی زبان بن گئی۔

پھر صلاح الدین ایوبی کو یہاں آنے کی کیا ضرورت ہوئی؟؟

بابا بھی چچا ہشام کے انداز میں سوال پوچھتے...... اور دادا اسی طرح میری طرف رخ کرکے جواب دیتے جیسے سوال کرنے والا میں ہوں۔

بیٹا مسلمانوں کی حکومت جاری تھی لیکن ۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے القدس پر حملہ کیا اور اس پر قابض ہوگئے خوب لوٹ مار مچائی یہاں تک کہ انسانی خون سے گھوڑوں کی ٹاپیں ڈوبنے لگیں۔

یا اللہ اتنا خون بہایا؟؟؟

میرے دل میں گھبراہٹ ہوتی۔

ہاں اٹھاسی سال تک یہاں مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے میں لگے رہے آخر کار ایوبی تلوار میدان میں آئی جس نے مسلمانوں کو ان کے ظلم سے نجات دلائی۔ حطین کی فیصلہ کن جنگ میں مسلمانوں نے صلیبیوں کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے محلہ المغربیہ کا یہ قطعہ زمین ان مراکشی مجاہدوں کو وقف کر دیا تھا جنہوں نے صلیبیوں کے مقابلے میں ان کا ساتھ دیا تھا۔

تو ہم ان مراکشی مجاہدوں کے وارث ہیں؟؟

چچا ہشام کی پرجوش آواز آئی......

ہاں میرے بچوں ہم ان کے وارث ہیں۔

اور یہ محلہ المغربیہ مسلمانوں کی وقف جائیدادیں ہیں۔

یہودی چالبازی کے ساتھ ان پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ دیکھتے ہو نہ کہ ابوغنم کی پہاڑی یہودی کالونی بن گئی ہے......

ہاں بابا یہودیوں کی نیت ٹھیک نہیں نظر آتی...... مجھے ان کے ہاتھوں سے لہو ٹپکتا محسوس ہوتا ہے۔

ہاں لیکن یہ جگہ ہم خالی نہیں کریں گے۔ ہرگز خالی نہیں کریں گے۔ بدذات یہودیوں کے لیے... دادا کی آواز مستحکم اور پرعزم تھی۔

بابا نے دادا کے قول کو نبھایا۔ اگرچہ یہاں رہنا انتہائی خطرناک ہوگیا تھا ہر لمحہ حملے اور بلوہ کا ڈر... خبر آئی کہ فلاں فلاح محلے میں یہودیوں نے دھاوا بولا اور شقاوت اور درندگی کی ساری حدیں پھلانگ ڈالیں سب سے پہلے بلدۃ الشیخ پھر حبرون، ابو قصر، دیر یاسین، خان یونس، قلقیلہ آئے دن ایک ہولناک خبر آتی......

آخر ان ہی حالات میں میری شادی ہوئی خدیجہ میری زندگی میں آئی۔ دادا اور بابا کے قول کے معاملے میں ڈگمگاتا تو آگے بڑھ کر مجھے سہارا دیتی۔

''نہیں یحییٰ حسین ہم یہاں سے نہیں جائیں گے ان شقی یہودیوں کے لیے اپنے محلے کو چھوڑ کر ہم کہیں نہیں جائیں گے۔''

حالات خراب تھے المغربیہ کے مسلمان اکثر ہمت کے ساتھ ڈٹے تھے۔ یہودی ابھی اس محلے کو خالی کرانے میں دلچسپی لیتے نظر نہیں آتے تھے۔ وہ ابھی اپنی سرحدوں میں اضافے کے لیے کوشاں تھے۔ شاید ان کے ذہن میں تھا کہ اس پر ہم جب چاہیں قابض ہو جائیں گے۔

وہ ایک سخت گرم دن تھا۔ میں کام سے گھر سے نکلا تو دوبارہ اس گھر میں جانا نصیب نہیں ہوا۔ الجواہریہ کے پاس انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ بغیر کسی بات کے انہوں نے مکوں اور گھونسوں کی بوچھاڑ شروع کی ابتدا میں میں نے مدافعت کی لیکن میں تنہا اور وہ پورا جتھا...... بے ہوش ہو کر گرا تو ہوش آنے کے بعد اپنے آپ کو جیل کی کوٹھری میں پایا۔

دس سال کی اس قید کے دوران مجھے اپنے بچوں کی شکلیں بھی بھول گئی تھیں خدیجہ ایک دفعہ ابتدا میں مجھ سے ملنے آئی تو میں نے آئندہ آنے سے سختی سے منع کر دیا اور بچوں کو لے کر فوراً فلسطینی کیمپ کا رخ کرنے کو کہا۔

دادا اور بابا تو پہلے ہی اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ بعد میں چچا ہشام کے بارے میں خدیجہ نے خط میں بتایا کہ اسرائیلی فوج انہیں بھی گرفتار کر کے لے جا چکی ہے۔

خدیجہ میری ہدایت پر بچوں کو لے کر کیمپ چلی گئی تھی۔ میں مطمئن تھا۔ کال کوٹھری میں بھی پرامید تھا۔ اسرائیلیوں کے غیر انسانی سلوک کا اندازہ کسی دوسری جیل کا قیدی نہیں لگا سکتا بس ایک پتھریلی زمین تھی جس پر ہم کو پھینک دیا گیا تھا۔ انتہائی ناکافی خوراک اور اذیت کے نت نئے گر......

ایک صبح میں کوٹھری میں بیٹھا سورج کی اس کرن کا نظارہ کر رہا تھا جو ایک دیوار پر کبھی کبھی نظر آتی تھی۔ نہ جانے کیسے اور کس رخ سے وہ کوٹھری میں داخل ہوتی تھی میرے ہزار سراغ لگانے کے باوجود بھی مجھے کبھی پتہ نہ چل پایا۔ شاید یہ اس امید کا استعارہ تھی جو میرے دل میں جاگتی تھی۔ ہزار اندھیروں کے باوجود......

چابیوں کو کھنکھناتا ہوا فوجی کوٹھری کا دروازہ کھول رہا تھا۔ میں نے چونک کر اس کو دیکھا...... اس کی آنکھوں کی سفاکی میں کسی چیز کی ملاوٹ تھی... یہ وہ آنکھیں نہیں تھی جو مجھے اذیت خانے لے جاتے ہوئے نظر آتی تھیں جوش اور خوشی کے ساتھ ملی جلی سفاکیت سے لبریز...... آج کچھ بجھی بجھی ہوئی تھیں۔

کیا بات ہے؟؟؟ کہاں جانا ہے؟؟؟

اس کے باہر نکلنے کے اشارے پر میں نے پوچھا۔

''چپ چاپ باہر آ جاؤ'' وہ غرایا۔

طویل راہداریاں طے کرتے ہوئے وہ مجھے کسی انجان جگہ لے جا رہا تھا شاید آخری نیند سلانے موت کی وادیوں میں اتارنے کے لیے...... اس سوچ کے ساتھ ہی میری زبان پر کلمہ شہادت اشہد ان لا الٰہ جاری ہوگیا۔ میں نے دل ہی دل میں خدیجہ اور بچوں کو خدا حافظ بھی کہہ دیا۔

لیکن وہ مجھے جیل سے باہر لے آیا جہاں بہت سے دوسرے فلسطینی قیدی بھی موجود تھے پتہ چلا کہ ہمیں ایک اسرائیلی فوجی کے بدلے رہا کیا جارہا ہے۔ میں نے سجدہ شکر ادا کیا میری ننھی امید کی کرن روشنی پھیلا چکی تھی۔

مجھے آزادی مل گئی کیمپ میں خدیجہ اور بچوں سے ملاقات بھی ہوگئی۔ قاسم اور ابتسام میرے قد سے اونچے ہو چکے تھے۔ مراکشی نقوش کے جوان رعنا جو عنقریب القسام بریگیڈ میں شامل ہونے والے تھے۔ یہ خدیجہ نے مجھے فخر سے بتایا۔ اونچے قد اور چوڑے سینے والے بیٹوں کے سامنے تو اب میں بالکل مرنجان مرنج قسم کا ایک عمر رسیدہ شخص لگتا تھا۔

میرا ہشام میرا ننھا تھا؟؟

کہاں ہے؟؟ میرا ہشام یوسف"

یک دم میں نے چونک کر یاد کیا۔ شکلیں بھولی تھیں تعداد تو نہیں... میں نے پلٹ کر خدیجہ سے پوچھا

قاسم اور ابتسام کو جھنجوڑا......

سب خاموش تھے۔ دم سادھے......

کیا ہوا؟ کیوں خاموش ہو؟؟

میں نے تلخی سے پوچھا۔

خدیجہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لائی اور بستر پر بٹھایا۔ قاسم کو اشارہ کیا قاسم کوئی ٹھنڈا مشروب لے آیا۔

میرے ہاتھوں نے اس کی ٹھنڈک محسوس کی شدت کی گرمی میں ٹھنڈا نہیں میں تو پانی کو بھی ترسا رہا تھا لیکن اس مشروب کا گلاس میرے لبوں تک نہیں جاسکا

میں نے گلاس کو سختی سے تھاما۔ یہ ٹھنڈا شربت میرے ہاتھ میں برسوں بعد آیا ہے لیکن میں اسے نہیں پیوں گا جب تک تم لوگ ہشام کے بارے میں مجھے آگاہ نہیں کرو گے شاید وہ شہید ہوگیا ہے میں نے ایک لمحے کو سوچا لیکن اگر ایسا ہوتا تو یہ یوں گم صم نہ ہوتے۔ مطمئن ہوتے...... کیا بات ہے؟ کچھ تو بتاؤ......

میں نے اب کے ذرا دھیمے سے پوچھا

یحییٰ حسینی خدیجہ نے میرا نام رک رک کر لیا...... ذرا صبر...... ذرا صبر...... ذرا ٹھہرو تو۔ دم تو لو ......اچھا بس یہ شربت پی لو میں پھر تمہیں ساری بات بتاتی ہوں......

"ہرگز نہیں" میں پھر چلا اٹھا۔

"اچھا اچھا بتاتی ہوں یحییٰ غصہ نہ کرو۔"

خدیجہ کی آنکھیں نم ہو چلی تھیں۔

"ہشام ہمارے پاس نہیں ہے......

ہشام کہاں ہے یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔

میرے صبر کا پیمانہ چھلکنے کو تھا۔

المغربیہ کے محلے سے نکلتے ہوئے وہ وہیں تھا اسی گھر میں...... میں نے حیرت سے خدیجہ کو دیکھا......

ہاں میں قاسم اور ابتسام کے ساتھ گھر واپس آرہی تھی گھر میں ہشام اور چچا تھے۔ اسرائیلی فوجیوں نے مجھے واپس گھر نہیں جانے دیا۔ انہوں نے محلے کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ لوگوں کو گھر سے نکال نکال کر مار رہے تھے۔ ایک بھگدڑ تھی۔ افراتفری کے عالم میں میں نے قاسم اور ابتسام کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ انہیں اپنے ساتھ رہنے کا کہا۔ ورنہ اس بھگدڑ میں یہ بھی گم ہو جاتے۔

بھلا بتاؤ حسینی میں اس گھر میں دوبارہ جاسکتی تھی۔ اسرائیلیوں کا محاصرہ اور وہ خون کے پیاسے درندے......

پھر... چچا ہشام نے میرے بیٹے کی حفاظت کی... ؟؟

ہاں انہوں نے حفاظت کی...... حسینی جہاں تک وہ کر سکتے تھے۔ پھر...... پھر کیا ہوا؟؟

بس اس سے آگے مجھے کچھ خبر نہیں...... میرا لال، میرا شہزادہ ہشام یوسف کہاں ہے؟ ہے بھی یا نہیں؟؟

چچا ہشام کے ساتھ یہودیوں نے ہشام کو بھی پکڑ لیا تھا۔ معصوم پالنے کا قیدی...... اس وقت چھ ماہ کا ہی تو تھا۔

آنسوؤں کی نہ ختم ہونے والی برسات تھی جو ہم سب کی آنکھوں سے جاری تھی۔ کتنے ماہ گزر گئے لیکن یہ سب ابھی کل کی ہی بات لگتی ہے۔ زخم ایسا تھا کہ بھرتا ہی نہ تھا۔

کل خدیجہ ایک انوکھی خبر لائی۔

یہودیوں کا عید کا دن انہوں نے القدس کے قدیم شہر کے باسیوں کو وہاں کی زیارت اور داخلے کی اجازت دی ہے لیکن کوئی ثبوت لازم ہے اس بات کا کہ وہ قدیم شہر کے باسی ہیں

خدیجہ کے پاس قاسم اور ابتسام کا پیدائشی کاغذ تھا کیونکہ اس دن وہ انہیں اسکول کے داخلے کے لیے ہی لے کر نکلی تھی۔ خدیجہ کو یقین تھا کہ یہ ثبوت کافی ہوگا۔

بات صحیح نکلی...... اسرائیلیوں نے ہم دونوں کو کاغذ دیکھ کر داخلے کی اجازت دے دی... راستے بڑے انجان تھے۔ نئے محلے بن گئے تھے۔ جدید ترین سڑکوں اور ٹریفک اشاروں کے ساتھ ایک نیا انجان شہر تھا جس سے ہم واقف ہی نہیں تھے۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور جو شکل سے کچھ فلسطینی عرب لگ رہا تھا ہم نے اسے روکا اور محلہ المغربیہ جانے کے لیے کہا وہ فلسطینی ہی نکلا جو کسی اسرائیلی کی ٹیکسی کرائے پر چلاتا تھا۔ اس کا عبداللہ باسم تھا۔ المغربیہ کی بیرونی سڑک پر اتار کر وہ خوش دلی سے بولا واپسی کے لیے مجھے اس نمبر پر کال کر لینا۔

میں نے سر ہلایا۔

محلہ ابھی اتنا تبدیل نہیں ہوا تھا اگرچہ کافی جدید گھر بن گئے تھے ہماری گلی کا آخری گھر جو ہمارا تھا ابھی تک ویسا کا ویسا ہی تھا۔ موٹی دیواروں اور وسیع باغوں کے ساتھ لیکن صدر دروازہ بدل دیا گیا تھا۔ موٹی لکڑی کا تراشا ہوا ایک بڑا گلاب کا پھول صدر دروازے کے اوپر لگا تھا۔

خدیجہ نے جلدی سے اطلاعی گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔

کون ہے؟؟

ایک سیاہ حبشی چپٹی ناک والا دروازہ کھول کر باہر آیا......

کیا بات ہے کون ہو؟

ہم کو تمہاری ملکہ سے ملنا ہے۔

میں نے آگے بڑھ کر کہا

کون ہو تم؟؟

اپنی مالکہ سے کہنا ہم حکومت سے اجازت لے کر آئے ہیں اور اس گھر کے اصل مالک ہیں۔

حبشی نے غور سے ہم دونوں کو دیکھا اور گھونگھر بھرے سر کو کھجاتا ہوا چلا گیا "انگلیاں اس کی سر کی جلد تک پہنچ پاتی ہوں گی؟"

میں نے خدیجہ سے مسکرا کر کہا۔ اور یہ ہی میرا مقصد تھا۔ دباؤ سے آزادی۔

دروازہ کھٹ سے کھلا۔ وہی حبشی تھا۔ سیاہ ہونٹوں سے سفید دانت جھانک رہے تھے۔ شاید مسکرا رہا ہے...... میں نے سوچا...... ہم دونوں اندر داخل ہوگئے۔

دروازے کے سامنے والی دیوار خالی تھی۔ القدس کی سنہری جالیوں اور گنبد والی پینٹنگ وہاں سے ہٹالی گئی تھی۔

راہداری سے گزرتے ہوئے دریچے سے باغ کا منظر سامنے تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا۔ زیتون سیب اور آڑو کے درخت البتہ اب بوڑھے بوڑھے سے لگ رہے تھے۔ درمیان کا کنول نما فوارہ موجود تھا لیکن اس کی پتیاں موجود نہیں تھیں۔

دریچے کے سامنے گزرتے ہوئے ہم دونوں ہی کے قدم جم سے گئے۔ نظروں کے سامنے عماد دادا، ہشام چاچا اور بابا کی شکلیں گزر رہی تھیں۔ آرام کرسی پر بیٹھے دادا کی سفید براق داڑھی ہلتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

ہم عموماً اسے راہداری میں ہی رکھتے تھے اور پھر جہاں دادا کہتے تھے اسے پہنچا دیا جاتا تھا...... نئے مالکوں نے زیادہ تبدیلیاں نہیں کی ہیں......

آئیے جناب...... ڈرائنگ روم ادھر ہے۔

حبشی کی آواز سے ہم دونوں چونکے پھر اپنے خیالوں سے واپس آ گئے۔

ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہم نے غور سے ہر شے کو دیکھا۔ حبشی اب جا چکا تھا۔

فرنیچر کچھ تبدیل کیا گیا تھا لیکن ترتیب تقریباً ویسی ہی تھی۔ آتش دان کے سامنے چھوٹا سا ایرانی قالین بچھا تھا پرانا تو وہ پہلے ہی بہت تھا لیکن اب تو اس کے دھاگے نکل رہے تھے۔

خدیجہ عین اسی ایرانی قالین کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

"ارے کیا کر رہی ہو نیچے نہیں اوپر بیٹھو" میں یہ بات کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ میرے کہنے سے پہلے پیچھے سے آواز آئی۔

مڑ کر دیکھا۔

ادھیڑ عمر انگریز جو ظاہر ہے یہودی ہی ہوگا...... لیکن خدوخال کچھ فرق تھے۔ چہرے پر وہ درشتگی نہیں تھی۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے بڑھ کر تھام لیا۔ اس نے اپنا نام بتایا

تھامس ایڈورڈز...... آئیر لینڈ سے آیا ہوں۔

یحییٰ حسینی...... اس گھر کا قدیم مالک......

ہوں...... اس نے دلچسپی سے سنا اور سامنے پڑے دیوان پر بیٹھنے کا اشارہ کیا

خدیجہ ابھی بھی وہیں بیٹھی تھی۔ بوسیدہ قالین کے نکلے ہوئے دھاگوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر رہی تھی۔

یحییٰ! ہشام کو آخری دفعہ میں نے یہاں لٹایا تھا۔ اس قالین پر...... اب وہ مجھے کہاں ملے گا؟؟

یہ کس کی بات کر رہی ہے؟

تھامس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا

ہمارا بچہ جسے تم لوگوں نے چھین لیا...... خدا کے لیے بس یہ بتادو کہ وہ کہاں ہے؟؟ زندہ ہے یا مار دیا گیا؟؟ مجھ سے پہلے وہ بول اٹھی۔

خدیجہ کی دلگیر آواز نے ماحول کو بے حد سوگوار کر دیا تھا۔

اگرچہ حبشی گرم قہوہ کی یخنی مٹھائی اور زیتون رکھ کر گیا تھا یہ یہودی مہمان نواز ہے۔ شاید اس نے میرے بیٹے کو اچھی طرح رکھا ہو۔ میں نے سوچا۔

تھامس ابھی تک سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

دیکھیے جناب میری بیوی اپنے دو بچوں کے ساتھ باہر تھی جب اسرائیلی فوج نے اس گھر کا محاصرہ کیا یہاں ہمارا چھوٹا بچہ اور میرا چچا موجود تھا۔ ہمیں پھر یہاں آنے نہیں دیا گیا۔ چچا کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا جبکہ مجھے تو اس سے بہت پہلے جیل میں پھینکا ہوا تھا۔ اب ہم آپ سے اس گھر اور یہاں کی کسی چیز کے بارے میں سوال کرنے نہیں آئے ہمیں اپنے بیٹے کے بارے میں معلوم کرنے آئے ہیں۔ خدا کے لیے ہماری امیدوں کو خاک میں نہ ملائیے گا۔

اچھا تم مائیکل کے باپ ہو۔

یہ آواز ایک عورت کی تھی جو ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑی تھی اور اندر کے معاملے کا جائزہ لے رہی تھی۔

لیکن اب مائیکل ہمارا بیٹا ہے اور ایک یہودی ہے......

نہیں ہرگز نہیں...... وہ ہرگز یہودی نہیں ہو سکتا۔

خدیجہ ایک دم قالین سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سرخ انگارہ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں گر رہی تھیں۔

ہونہہ کوئی ماں باپ چھ ماہ کے بچے کو چھوڑ کر جا سکتے ہیں؟؟؟

"لیکن ان کا چچا اس کے ساتھ تھا"

سب ڈھکوسلہ ہے...... دراصل سارا قصور تمہارا ہے۔

گوری عورت نے اطمینان سے صوفے پر بیٹھ کر کہا۔

مائیکل گھر پر ہے؟؟

تھامسن نے بیوی سے پوچھا۔

اس کے جواب سے پہلے ایک اونچا لمبا لیکن دبلا پتلا لڑکا دروازے پر کھڑا تھا۔ سرخ آدھی آستین کی شرٹ اور سیاہ برمودا پہنے ہاتھوں میں اسنیکرز تھے جن کی ڈوریاں زمین کو چھو رہی تھیں۔

"مام مجھے زیتون کے اچار والے سینڈوچز پسند ہیں" آپ ہمیشہ اس کے بغیر بنا دیتی ہیں۔

"مائیکل ادھر آؤ...... ان سے ملو"

او کے...... مجھے جانے کی ذرا جلدی ہے اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

نہیں ٹھہرو۔ یہ ذرا اہم بات ہے۔

خدیجہ اور میری سانسیں الجھ رہی تھیں......

ہشام کے نقش اپنے بھائیوں سے مختلف تھے لیکن کھڑی مراکشی ناک ہو بہو چچا ہشام کی طرح تھی۔

مائیکل یہ تمہارا دعویٰ لے کر آئے ہیں۔

ہاں انہیں تمہارے ماں باپ ہونے کا دعویٰ ہے ہم نے مائیکل سے کچھ نہیں چھپایا ہے۔ تھامسن کی بھی آواز آئی جس نے ایک لمحے کو ہماری طرف بھی دیکھا جتا دینے کے انداز میں......

مائیکل ساکت ہو گیا چند لمحے بعد سنجیدگی سے بولا۔

مجھے پتہ ہے کہ مام ڈیڈ میرے اصل ماں باپ نہیں ہیں لیکن مجھے اپنے اصلی ماں باپ کی بھی ذرا پروا نہیں ہے...... کیونکہ انہوں نے میری ذرا پروا نہیں کی...... چھ ماہ کے بچے کو کوئی ماں چھوڑ کے جاتی ہے؟؟

اس نے خدیجہ کی آنکھوں میں جھانکا...... سرخ غم کی آگ میں دہکتی آنکھیں۔ مائیکل نے سر جھکا لیا۔

ہم خود چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے یہ اسرائیلی فوج تھی جس نے ہم کو واپس نہیں آنے دیا۔

"سب ڈھکوسلہ ہے!"

وہی رٹا رٹایا جواب تھا۔

ٹھیک ہے تم ہمارے ساتھ نہیں جانا چاہتے تو اپنے مام ڈیڈ کے ساتھ رہو۔ بس ایک بات کا تم سے وعدہ لینا ہے اسرائیلی فوج میں شمولیت اختیار نہ کرنا۔ ورنہ وہاں تمہیں اپنے دونوں بھائیوں کے مقابل آنا پڑے گا۔

خدیجہ کی سرخ آنکھوں میں ایک سرد مہری سی در آئی تھی۔

یہ ہشام نہیں مائیکل ہے۔ اس نے یقین کر لیا تھا۔

میں نہیں چاہتی کہ وہ تمہیں آگ کا ایندھن بنائیں۔ چلو یحییٰ ہماری تلاش ختم ہوئی۔ خدیجہ نے میرا ہاتھ پکڑا۔

میری بھی برداشت ختم تھی...... ہمیں واپس جانا چاہیے۔

ہم دونوں تیزی سے صدر دروازے سے باہر نکل گئے۔

فاصلے قدموں سے لپٹ رہے تھے۔ میں نے عبداللہ باسم کو کال ملائی۔ گلی کے اختتام پر ہم کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا...... خاموشی کا دبیز پردہ مزید دبیز ہوتا جا رہا تھا ہم دونوں ایک دوسرے سے آنسو چھپانا چاہتے تھے ٹیکسی میں ہم دونوں کھڑکی سے باہر نظریں جمائے ہوئے تھے اچانک موبائل کی گھنٹی نے خاموشی کا دبیز پردہ چاک کر ڈالا یہ عبداللہ باسم کا موبائل تھا۔ چند لمحے عبداللہ نے موبائل کانوں سے لگا کر مجھے دے دیا ''آپ کا فون ہے''

کون؟ میں حیران تھا......

میں ہوں آپ کا ہشام...... بابا...... ہام ڈیڈ کے سامنے ڈرامہ کرنا لازم تھا...... بھلا وہ اور اسرائیلی حکومت صحیح سالم آپ کے ساتھ جانے دیتی؟؟؟

میں ششدر سا رہ گیا پھر میرے منہ سے بے یقینی کے عالم میں نکلا تمہارے پاس عبداللہ کا نمبر کیسے آیا؟؟

اس کو میں جانتا ہوں اس کو یہ ٹیکسی ہام ڈیڈ نے ہی کرائے پر لے کر دی ہے۔ بس آپ جائیے اور اپنا اور مما کا خیال رکھیے انشاء اللہ

میں بھی جلد آپ سے ملنے آؤں گا...... اور پھر ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوں گا...''

اب میں سوچ رہا تھا کہ یہ اتنی بڑی خوشی کی خبر خدیجہ کو کس انداز میں سناؤں کہ اس کے اعصاب سلامت رہیں!!

ماں

نزہت عباسی

ماں کی ممتا ہے، ماں کی چاہت ہے
گھر میں خوشیاں ہیں ماں کی نعمت سے

ماں کے منصب بھی مقدس ہیں
ماں کو نسبت ملی ہے جنت سے

صبر، برداشت، حوصلہ، ہمت
ہے عطا ماں کو دستِ قدرت سے

ماں ہے نورِ سحر زمانے میں
صبحِ خنداں ہے اُس کی صورت سے

اپنے بچوں کی ماں نگہباں ہے
اُن کو رکھتی ہے وہ حفاظت سے

حق ادا ایک رات کا بھی نہیں
زندگی بھر بھی ماں کی خدمت سے

گھر ہے یا کائنات مادر ہے
وہ چلاتی ہے جس کو حکمت سے

ایک گہوارہ علم و دانش کا
قوم بنتی ہے ماں کی محنت سے

☆☆☆

خوشخبری

'سچی کہانیاں' پڑھنے والوں کو اگر پرچہ ملنے میں دشواری ہے تو 'سچی کہانیاں' کے دفتر فون کر کے مطلع کریں ہم آپ کو پرچہ آپ کے گھر کے پتے پر ارسال کریں گے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کا نام قرعہ اندازی کے لیے بھی شامل کر لیا جائے گا۔

پہلا انعام...... موبائل فون

دوسرا انعام...... 6 ماہ کے لیے 'سچی کہانیاں' جاری

تیسرا انعام...... 3 ماہ کے لیے 'سچی کہانیاں' کے ساتھ 'دوشیزہ' کی بھی اعزازی کاپی ارسال کی جائے گی۔

اس کے علاوہ آپ آن لائن بھی پرچہ منگوا سکتے ہیں' مزے سے گھر بیٹھے بٹھائے آپ کا پسندیدہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں......

pearlpublications@hotmail.com

ناولٹ

حرا احمد

بے رُخی

غرور اور اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنا ایک بیماری ہے۔
کاش شہیر کو بھی یہ بات سمجھ آ جاتی۔

رات گہری سے گہری ہوتی جا رہی تھی پر وہ ایک فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ مجھے اس رشتے کے لیے ہاں کرنی چاہیے یا نہیں۔ آج صبح ہی پھپھو اس کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ ماما، بابا سوچنے کے لیے اسے پوری ایک رات دی تھی جو کہ ان کے خیال میں کافی تھی اور جواب میں ہاں کے منتظر تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ انہیں اس سے پیار نہیں تھا ان کے لیے دادی کی کہی ہوئی بات زیادہ اہم تھی جو کہ انہوں نے مرتے ہوئے اپنے دونوں بیٹا، بیٹی سے وعدے کی صورت میں لی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد وہ اپنے بچوں کو اس رشتے میں باندھ کر ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔ یہ ماما، بابا کا بڑا پن تھا کہ انہوں نے اسے سوچنے کے لیے وقت دیا تھا نا بھی دیتے تو وہ تب بھی ان سے اتنا پیار کرتی تھی کہ ان کی خوشی کے لیے اپنی زندگی قربان کر دیتی۔

شہیر دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ کزن کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن اس نئے رشتے کے لیے خود کو تیار کرنا از حد مشکل تھا۔

شہیر کو پیار سے سب شاہ پکارتے تھے اور کیوں نہ پکارتے اس کی طبیعت شاہوں والی تھی۔ لمبا قد گندمی رنگت ستواں ناک اور مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا لیکن تھوڑا اکھڑ مزاج خودسر اور اپنی من مانی کرنے والا تھا شاید ہی کوئی دن ہو جب وہ اپنے کزنز سے بھی ہنس کر ملتا ہو اس کے باوجود شہیر کا رشتے کے لیے مان جانا کسی انہونی سے کم نہ تھا۔

''ماما آپ سے کتنی بار کہہ چکا ہوں میں شادی نہیں کرنا چاہتا اجالا سے آپ مجھے کیوں فورس کر رہی ہیں؟''

''شاہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ تم بہت خوش رہو گے اس کے ساتھ۔ اور پھر تمہاری دادی اماں کی آخری خواہش بھی تو ہے نا......''

''اوہ تو یوں کہیں نا کہ آپ کے لیے مرے ہوئے لوگوں کے فیصلے زندہ لوگوں سے زیادہ اہم ہیں چاہے وہ اپنی زندگی کتنی ہی ان چاہی گزاریں۔''

”شاہ تمہیں تو اب تمیز بھی بھول گئی ہے بڑوں سے بات کرنے کی بہت خودسر ہوتے جا رہے ہو دن بہ دن بالکل تمیز بھولتی جا رہی ہے تمہیں کان کھول کر سن لو جو ہم نے فیصلہ کرلیا ہے وہی حرف آخر ہے۔“

”ماما یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ اگر میرے راضی نہ ہونے کے باوجود رشتہ لے کر گئیں ماموں کے ہاں تو بعد میں مجھے ذمہ دار ٹھہرایئے گا۔“ وہ غصے میں کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

”رمیز شاہ بہت اکھڑ مزاج ہوتا جا رہا ہے اور رشتے کے لیے تو بالکل راضی نہیں ہو رہا مجھے اس کی بہت فکر ہو رہی ہے۔“

”بیگم آپ پریشان نہ ہوں کچھ نہیں ہوتا جب شادی ہو جائے گی، ذمہ داری پڑے گی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بس تاریخ طے کریں ہمیں منگنی نہیں ڈائریکٹ شادی کرنی ہے۔“

”چلیں ٹھیک ہے۔ آپ کہتے ہیں تو کل جاتی ہوں رضا بھائی کی طرف۔ اب شاہ کو آپ خود ہی دیکھیے گا۔“ صدف بیگم نے رمیز علی سنجیدگی سے کہا اور کمرے سے نکل گئیں۔

رضا دو بھائی اور ایک بہن تھے۔ دونوں بھائی ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے تھے بڑا بھائی سعد تھا جن کی پانچ بیٹیاں تھیں بڑی ردا اور فضا ان دو کی شادیاں ہو چکی تھیں، اجالا، زارا اور میرا یہ تینوں ابھی تک کنواری تھیں۔ سعد نے اپنے چھوٹے بھائی رضا کو جس کی کوئی اولاد نہیں تھی اپنی تیسری بیٹی گود دے دی تھی۔ رضا اور لاریب (رضا کی بیوی) نے بھی اجالا کو سگی اولاد کی طرح پالا۔ رضا کا اپنا میڈیکل اسٹور تھا اور سعد کے مقابلے میں کہیں زیادہ اچھا کماتا تھا۔ جبکہ سعد ایک کالج میں کلرک تھا اور اپنی تنخواہ میں ہی مشکل سے گزارا کرتا تھا۔ صدف ان کی اکلوتی بہن تھی اور اس کی دو بیٹیاں دعا، حیا اور ایک بیٹا شہیر تھا حیا سب سے بڑی تھی اس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ ملک سے باہر سیٹل تھی۔ پھر شہیر اور دعا تھے۔ دعا شہیر سے چار سال چھوٹی تھی اور اجالا کی کزن کے ساتھ بیسٹ فرینڈ تھی۔ اجالا بھی دعا کی ہم عمر ہی تھی دونوں نے ایک ساتھ ایک ہی کالج سے بی اے کیا تھا۔ شاہ نے ایف اے کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ رمیز صاحب کا اپنا ایک ذاتی جنرل اسٹور تھا اس کی دیکھ بھال شاہ ہی کرتا تھا۔ صبح سے شام تک اسٹور چلاتا تھا اس لحاظ سے شہیر اس خاندان کا اکلوتا لڑکا تھا اور اسی چیز نے اسے خودسر بنا دیا تھا۔

’اجالا آپی، اجالا آپی کہاں ہیں آپ یار؟ میری پیاری بہنیا بنے گی دلہنیا......“ میرا نے باآواز بلند کہتے ہوئے اجالا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اف توبہ ہے میرا تم آرام سے نہیں آسکتیں، اور یہ کیا اول فول بک رہی ہو؟“ وہ جو اپنا پسندیدہ ناول رومیو جیولٹ پڑھنے میں مگن تھی۔ ایک دم غصے سے چونک کر بولی۔

”ہاں بولو اب کیا ہو گیا ہے؟ ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی ہو۔“ اس نے برہمی سے میرا کو گھورتے ہوئے کہا ”اوہ آپی غصہ کیوں ہوتی ہیں خبر ہے ہی ایسی کہ آپ بھی سن کر اٹھ کھڑی ہوں گی۔“

”اب کچھ بولو گی بھی یا بس ٹرٹر کرتی رہو گی.“ اجالا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”اچھا چلیں آج کی تازہ خبر یہ ہے کہ نیچے پھوپھو اپنے اکلوتے نیک بخت کا رشتہ لے کر آئی ہیں، آپ کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو چکی ہے آپ نیچے تشریف لائیں تاکہ آپ کی رسم کی جائے“

”کیا؟ پھوپھو آئی ہیں کب؟ کدھر؟“ وہ واقعی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاہاہا اتنا بوکھلا کیوں رہی ہیں ڈیئر پھوپھو ہی ہیں کوئی بھوت تھوڑی نا...... دیکھا کہا تھا نا کہ آپ

بھی خبر سن کر بیٹھے سے اٹھ جائیں گی۔ چلیں اب واپس آجائیں اپنے حواسوں میں اور جلدی آجائیں سب نیچے انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ یہ کہتے ہوئے ہنستے ہوئے بھاگ گئی۔

”میرا رکو یار بات تو سنو......“ اجالا آوازیں دیتی رہ گئی پر میرا یہ جا وہ جا......

”رضا بھائی آج سے آپ کی اجالا ہماری ہو گئی۔“ صدف نے اجالا کا منہ میٹھا کرواتے ہوئے کہا۔ ”جی بہن ضرور اجالا آپ ہی کی بیٹی ہے۔ آج امی جان بھی کتنا خوش ہوں گی ہمارے اس فیصلے سے کہ آج ہم نے ان کی خواہش کو پورا کر دیا ہے۔“

”جی بھائی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ امی کے ذکر پر تینوں بہن بھائیوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”اوہ بس...... اتنی خوشی کے موقع پر کوئی رونے دھونے والا سین کریٹ نہیں کرے گا۔“ میرا کی بات پر سب روتے ہوئے ہنس پڑے۔ وہ تھی ہی ایسی پورے گھر کی رونق تھی۔ شہیر کی بھی وہ واحد فرد تھی کزنز میں جس کے ساتھ بنتی تھی۔ جب بھی اس گھر میں شاہ آتا اور کوئی اسے ہنستا پاتا تو سمجھ جاتا کہ وہ میرا کے پاس کھڑا ہے۔ ورنہ شاہ کو خاندان میں مسکراتا کم ہی دیکھا جاتا تھا۔

میرا کے مقابلے میں اجالا سنجیدہ مزاج اور اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی اس کے مزاج میں ایک سوبر پن تھا وہ خوش لباس، خوش گفتار اور خوش شکل تھی۔ صرف تھوڑا موٹاپا تھا جس کی وجہ سے میرا کے مقابلے میں تھوڑا کم تھی لیکن پھر بھی وہ اپنی شخصیت کی وجہ سے جاذب نظر تھی۔ میرا اس سے سات سال چھوٹی تھی لیکن ایک اسمارٹ اور خوبصورت لڑکی تھی۔ جبکہ زارا بھی اجالا کی طرح خاموش طبع لڑکی تھی اور عام شکل وصورت کی مالک تھی سب سے اہم بات جو تھی وہ گھر کا ماحول تھا جو بے حد اچھا تھا۔ سب ہی ایک دوسرے کی عزت اور محبت کرتے تھے کبھی ایک دوسرے کو کسی سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

”چلو بھابی جلدی سے ٹریٹ دو۔ آخر کو میں نے تمہیں اپنی بھابھی بنا ہی لیا۔“ دعا نے اجالا کو چھیڑتے ہوئے کہا جو شرم سے لال پیلی ہو رہی تھی۔ جب سے پھوپھو تاریخ طے کر کے گئی تھیں زارا اور میرا نے دعا کو زبردستی روک لیا۔ اب تینوں مل کر اس سے ٹریٹ مانگ رہی تھیں اور ساتھ اچھا خاصا ریکارڈ لگا رہی تھیں۔

”لو منہ میٹھا کرو۔ آج تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے اگلے مہینے کی دس تاریخ کو تمہاری بارات ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں کیونکہ آج تمہاری نانو بھی کتنا خوش ہوں گی نا شاہ!“

”کیا...... آپ تاریخ طے کر آئی ہیں۔ مجھے بتائے بغیر آپ ماموں کے ہاں گئی تھیں۔ میں نے آپ کو منع بھی کیا تھا۔“ شہیر نے غصے میں آگ بگولا ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہیں امی میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہ پاؤں گا، وہ میرے ٹائپ کی نہیں ہے اجالا کو میں نے کبھی اس رشتے کے لحاظ سے نہیں سوچا بلکہ میں نے تو اسے کبھی بھی اسے کسی لحاظ سے نہیں سوچا......“

”شہیر تو اب سوچ لو بیٹا۔“ صدف نے نہایت پیار کے ساتھ اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”امی کیا سوچ لوں اب۔ زندگی کے فیصلے اس طرح نہیں کیے جاتے اور وہ لڑکی اس سے تو میں نے زندگی میں کبھی سیدھے منہ سلام تک نہیں لیا اور آپ اسے میری زندگی میں شامل کرنے جا رہی ہیں۔ امی وہ اور دور تھا جب ماں باپ پوچھے بغیر رشتہ کر دیتے تھے اور بیچارا لڑکا نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی زندگی

روتے دھوتے گزار دیتا تھا۔" شہیر نے نہایت بے بسی سے اپنی ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا صدف بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"شاہ یہ کیا بدتمیزی ہے یہ کس طرح بول رہے ہو تم اپنی ماں سے......" رمیز صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دونوں ماں بیٹے کی گفتگو سن لی تھی۔

"معافی چاہتا ہوں بابا لیکن میں تو امی......"

"بس بہت ہوگئی تمہاری من مانی۔" رمیز صاحب نے ہاتھ کھڑا کر کے بولتے شہیر کو وہیں روک دیا۔ "اور تم نے کیا یہ، وہ لڑکی کی رٹ لگائی ہوئی ہے کچھ شرم کرو تمہارے ماموں کی بیٹی ہے اور تم سے تو ہزار درجے اچھی ہے۔"

شاہ باپ کے غصے کو اچھی طرح جانتا تھا اس لیے فوراً نرم لہجے میں بولتے ہوئے کہا۔

"اچھا بابا آپ چاہتے ہیں کہ میں ماموں کی بیٹی سے شادی کرلوں تو پھر آپ میرا کے لیے میرا رشتہ لے لیں مجھے کوئی اعتراض نہیں......" شاہ نے سر جھکاتے ہوئے اپنے دل کی بات کہی۔ میرا کے لیے شاہ کے دل میں کوئی خاص جذبات نہیں تھے پر وہ اجالا کے مقابلے میں نٹ کھٹ سی چھوٹی سی لڑکی اسے اچھی لگتی تھی۔

"کیا...... تم پاگل تو نہیں ہوگئے؟" رمیز صاحب کے تو پتنگے لگ گئے۔

"میرا کی ابھی عمر ہی کتنی ہے گیارہ سال چھوٹی ہے تم سے۔ ابھی بچی ہے تم ایسی بات سوچ بھی کیسے سکتے ہو۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے تمہاری ذہنیت پر...... ایک اتنی اچھی سمجھدار لڑکی کو تم اس چھوٹی بچی پر فوقیت دے رہے ہو۔ اجالا ہر لحاظ سے تم سے بہتر ہے۔ تمہارے پاس شکل وصورت کے سوا ہے ہی کیا ہاں؟ وہ تم سے زیادہ پڑھی لکھی ہے تم سے زیادہ میچور ہے۔"

"مجھے اس کی میچورٹی نہیں چاہیے جس سے دل نہ ملے اس کے سوبر پن کو کیا کرنا ہے آپ نے...... اور مجھے ویسے بھی شوخ چنچل لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ بابا آپ سمجھ نہیں رہے میری بات پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ" شاہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"بول لیا اب میری سنو۔ تمہاری نانو تمہارا رشتہ اجالا سے طے کر کے گئی ہیں اور تمہاری شادی اسی سے ہونی ہے اب میں دوبارہ تمہیں اس معاملے میں بحث کرتے نہ دیکھوں اب تم جا سکتے ہو۔" رمیز صاحب نے دوٹوک کہتے ہوئے بات ختم کردی۔

"ٹھیک ہے آپ نہیں سمجھ رہے تو نا سمجھیں اب جو بھی ہوگا نتائج کے ذمے دار آپ دونوں ہوں گے۔" وہ غصے میں تن فن کرتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"رمیز یہ کیا کہہ گیا۔ اتنا غصے میں تو میں نے شاہ کو کبھی نہیں دیکھا کہیں کچھ غلط نا کر بیٹھے۔"

"بیگم آپ خواہ مخواہ میں پریشان ہو رہی ہیں کچھ نہیں کرے گا وہ اور جب اجالا سے شادی ہو جائے گی تو دیکھنا پھر اس کے سوا اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا ہے جیسے ہمیں آپ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔" رمیز شرارت سے صدف کے قریب ہوتے ہوئے کہا صدف بری طرح جھینپ گئی۔

شادی کے دن جتنے قریب آتے جا رہے تھے اتنی ہی اجالا کی ٹینشن بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے بالکل! اندازہ نہیں تھا کہ شاہ اس رشتے پر خوش ہے یا نہیں۔ دعا کی تو خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ کئی بار دل چاہا کہ دعا سے ہی معلوم کرلے کہ شاہ بھی خوش ہے یا نہیں لیکن پھر چپ ہوگئی یہ سوچ کر کہ دعا یہ نہ کہہ دے کہ شاہ راضی ہوا ہے تو امی رسم کر کے گئی ہیں اور کہیں پوچھنے پر وہ ناراض ہی نہ ہوجائے اس لیے خود ہی کچھ کرنا تھا ڈیٹ فکس ہونے کے بعد سے اب تک اس کا سامنا شاہ سے نہیں ہوا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ وہ سامنے آئے اور اس کا ردعمل جان سکے۔ یہ موقع اسے زارا کی منگنی میں مل گیا۔ اگرچہ اجالا خود اس رشتے پر اپنے ماما، بابا کی خواہش پر راضی ہوئی تھی ورنہ شہیر سے کبھی اس کی ایسی جان پہچان نہ تھی کہ اس رشتے سے اس کی دلی جذباتیت ہوتی لیکن اس نے سوچا ہوا تھا کہ اپنی زندگی کی شروعات پوری سچائی اور ایمانداری سے شاہ کو ہمیشہ کے لیے اپنا آپ سونپ دے گی اور اس اکھڑ مزاج انسان کو محبت سے جیت لے گی۔

اجالا کی شادی سے پندرہ دن پہلے زارا کی منگنی طے ہوگئی۔ اچھا رشتہ تھا لڑکا دبئی کی فرم میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھا۔ کوئی ذمہ داری سر پر نہیں تھی اس لیے بڑوں نے منگنی میں دیر نہیں کی ایک اچھی اور بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔

"اوہ شاہ بھائی شکر کسی کو شکل تو دکھائی آپ نے...... اتنا تو اجالا آپ پردہ نہیں کر رہیں جتنا آپ کر رہے ہیں" شہیر ایک ٹیبل کے پاس کھڑا ایک ہاتھ میں کوک کا ٹن پکڑے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا کہ میرا کی بات پر اچانک چونک گیا اور بے ساختہ مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ "ہے بیوٹی فل گرل! کیسی ہو؟" میرا میرون فراک میں جس پر ڈارک گرین کلر کی ایمبرائیڈری ہوئی تھی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ "میں ٹھیک ہوں آپ سنائیں بڑے کم کم درشن کراتے ہیں۔ کہاں غائب ہوتے ہیں آج کل؟ آپ دونوں منگنی کروا کے کچھ زیادہ ہی بڑے نہیں ہوگئے؟ ایک وہ میری آپی ہیں مجال ہے جو کمرے سے نکلیں اور ایک آپ ہیں ایسے مہینوں بعد شکل دکھاتے ہیں جیسے شہزادہ چارلس ہیں۔"

"میرا تم اس گھر میں واحد فرد جس سے میرا دل کرتا ہے کہ میں ڈھیر ساری باتیں کروں اور کرتا رہوں۔" شاہ نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا ویسے میں شہزادہ چارلس سے کم بھی نہیں ڈیئر۔" اس نے میرا کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ دور کہیں دروازے میں کھڑا کوئی یہ سوچ رہا تھا کیا یہ شخص ہنستا بھی ہے؟ کیا یہ بندہ واقعی بدل چکا ہے؟ کیا وہ اس رشتے سے اتنا خوش ہے؟ شاہ کو ہنستے دیکھ کر اس کے دل میں سکون اتر گیا لیکن یہ سکون کچھ دیر کا ہی ثابت ہوا ہنستے ہوئے اچانک شاہ کی نظر دروازے کی اوٹ میں کھڑی اجالا پر پڑی جو گولڈن شرٹ جس پر بلیک ایمبرائیڈری ہوئی تھی کافی پیاری لگ رہی تھی اس کی ہنسی وہیں تھم گئی۔ اس نے سرد نظروں سے دیکھتے ہوئے فوراً رخ بدلا اور میرا کو ایکسکیوزمی کہتا وہاں سے ہٹ گیا۔ میرا کو سمجھ نہ آئی کہ شاہ بھائی کو اچانک ہوا کیا ہے۔ وہ چلتی اجالا کے پاس آگئی۔ "اجالا آپی ایک بات تو بتائیں؟ آپ کے ہونے والے مجازی خدا عجیب وغریب ہی بندے ہیں۔ اچھے بھلے باتیں کرتے ہوئے ایک دم سے سنجیدہ ہو کر یہ جا وہ جا۔ ان کے ایک دو اسکرو ڈھیلے ہیں کیا؟" میرا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ اجالا اس کے انداز پر ہنس پڑی جبکہ حقیقت میں خود اپنے اندر سکوت چھاتا محسوس کر رہی تھی۔ "کوئی کام یاد آگیا ہوگا چھوڑو تم کیوں ٹینشن لے رہی ہو ڈیئر! اچھا چلو آؤ زارا کے پاس چلیں دیکھیں دولہا میاں کے ساتھ بیٹھی نروس تو نہیں ہو رہی؟" اجالا نے بہانے سے بات بدلتے ہوئے میرا کو وہاں سے اٹھا دیا اور خود بھی بددل ہو کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

"شادی میں صرف دو دن رہ گئے ہیں رضا کوئی کام ہے تو بتاؤ؟" سعد نے بڑا بھائی ہونے کے ناتے پوچھنا اپنا فرض سمجھا۔ "نہیں سعد بھائی سب تیاریاں مکمل ہیں بس آپ کی دعا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے ہمیشہ اجالا کو اپنی سگی اولاد کی

طرح چاہا ہے۔ وہ اپنے گھر خوش رہے اس سے بڑھ کر میرے لیے کچھ نہیں۔ اور آپ کا بڑا احسان مجھ پہ کہ آپ نے اجالا کو مجھے سونپ کر کبھی احساس نہ ہونے دیا کہ میں بے اولاد ہوں۔"

"اوہ رضا کیسی باتیں کرر ہے ہو در حقیقت تو تم نے میرا بوجھ بانٹا ہے۔ ایسے مت کہیں بھائی مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آئیں اندر چلتے ہیں۔" وہ دونوں اپنے گھر کے بنے مشترکہ صحن میں کھڑے تھے۔ چلو رضا کے کاندھے پر ہاتھ مارتے دونوں اندر کی طرف بڑھ گئے۔

......☆......

آج بارات تھی۔ مایوں اور مہندی خوب بھلے گلے میں انجام پا گئی۔ شاہ کے کہنے پر اپنے اپنے گھروں میں مہندی کی رسم ادا کی گئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا رویہ مہندی پر ہی سب کے سامنے آ جائے اپنے امی ابو کو ہر طرح سمجھانے کے بعد وہ بظاہر بالکل خاموشی اختیار کر گیا تھا جبکہ اس کے اندر کیا لاوا ابل رہا تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔

شہیر رائل بلیو شیروانی اور آف وائٹ کلہ میں نظر لگ جانے کی حد تک پیارا لگ رہا تھا۔ کم اجالا بھی نہیں لگ رہی تھی ریڈ کلر کے لہنگے میں جس کے بارڈرز پر بلیو نفیس کام ہوا تھا کافی خوبصورت لگ رہی تھی۔ لیکن شاہ کی نظریں اجالا کی بجائے دور کھڑی میرا پر کی ہوئی تھی جو ہنس ہنس کر اپنی دوستوں کو کچھ بتا رہی تھی اور شہیر کے دل کو ہلا رہی تھی اسے ایک منٹ کے لیے بھی ساتھ بیٹھی اجالا میں ذرا بھی دلچسپی محسوس نہ ہوئی جسے چند منٹ پہلے شاہ نے اپنے نکاح میں لیتے ہوئے اس کی ہمیشہ کے لیے ذمہ داری اٹھائی تھی۔

"چلیں بس بہت ہو گیا اب ہماری باری ہے۔" زارا اور میرا دودھ پلائی کا گلاس اٹھاتے ہوئے اسٹیج پر چڑھ آئی۔ شاہ کے چہرے پر بیساختہ مسکراہٹ در آئی۔

"ہاں جی شاہ بھائی اب تو قابو آ ہی گئے ہیں جلدی سے یہ دودھ پئیں اور جیب ڈھیلی کر دیں پورے پچاس ہزار اگر دولہن لے کر جانی ہے تو......" میرا نے شوخ ہوتے ہوئے کہا سب ہی اس کی شرارتوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔

"کیا پورے پچاس ہزار؟ جانے دو یار اتنے کی تو دلہن بھی نہیں ہے تم ایسا کرو دلہن ہی رکھ لو مجھے نہیں لے جانی۔" شاہ نے ہنستے ہوئے اجالا پر چوٹ کی۔ ہال میں ایک دم سب کو سانپ سونگھ گیا میرا اور زارا کی شکل بھی دیکھنے والی تھی۔ اجالا کو تو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کہ یہ لفظ شاہ نے اس کے لیے کہے ہیں۔

فائزہ کی بیگم (اجالا کی امی) ایک دم غصے سے بولیں "یہ کیا فضول باتیں کرر ہے ہو شاہ ......؟

"ممانی جان میں تو صرف مذاق کرر ہا تھا۔"

"یہ کیا بیہودہ مذاق ہے؟"

"آپ اتنی چھوٹی سی بات کو سنجیدہ کیوں لے رہی ہیں بھابھی۔" بیگم صدف نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔ "تم نے دیکھا نہیں یہ شاہ نے کیا بات کی ہے۔ بھابھی چھوڑیں نا...... بچے ہیں آپس میں ہنسی مذاق کرر ہے ہیں۔ چلو لڑکیوں جلدی سے رسم کر کے فارغ ہو رخصتی کا ٹائم ہو رہا ہے۔" صدف نے بات سمیٹتے ہوئے کہا۔

دودھ پلائی کی وجہ سے اچھی خاصی بدمزگی پیدا ہو گئی۔ شاہ کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر بیٹھے۔ اس کے بعد رخصتی کا شور اٹھا۔ اجالا اپنوں کی دعاؤں میں رخصت ہو کر ہمیشہ کے لیے شہیر کے گھر آ گئی۔

ساری رسموں کے بعد دعا اور حیا نے اسے شہیر کے کمرے میں پہنچا دیا کمرے کو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا اجالا شاہ کے انتظار میں بیٹھی ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی وہ بیٹھی بیٹھی اکڑ گئی تھی کمر ایسے لگتا تختہ بن گئی تھی۔ انتظار تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ شاہ کو نہ آنا تھا نہ وہ آیا۔ اجالا بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ صبح کے چار بجے اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ شاہ کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے بیڈ پر اجالا بھی دروازے کی کھٹک سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ ڈگمگا گیا اجالا واقعی دلہن بنی خوبصورت لگ رہی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی خود پسندی عود کر آ ئی۔ جتنی مرضی پیاری لگے میرے تو پاسنگ بھی نہیں ہے اجالا کو دیکھ کر غصہ پھر سے عود کر آیا وہ جارحانہ انداز میں اجالا کی طرف بڑھا۔

"اوہ تو بڑے مزے سے سویا جار ہا ہے اتنی پرسکون نیند تو اسی کو آ سکتی ہے جسے کوئی کتنی چاہت سے بیاہ کر لایا ہو اور اپنی ساری چاہت نچھاور کرتے ہوئے اسے اپنی بانہوں میں سلا دے۔" شہیر نے سوتے سے اٹھ کر بیٹھتی اجالا کو دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اف اتنی بے ہودہ گفتگو کی اجالا کو شاہ سے توقع نہیں تھی۔ "وہ م...... میں اچانک آنکھ لگ گئی تھی تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" اجالا نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے شرمندہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"خیر چھوڑو تمہیں کیا فرق پڑتا ہے تم تو اللہ میاں کی گائے ہو جس نے جو چاہا تم سے منوا لیا تم اچھی طرح جانتی تھیں مجھے میں نے آج تک تم سے سیدھے منہ سلام تک نہ لیا تم سوچ بھی کیسے سکتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ خوش رہوں گا؟" شاہ نے طنزیہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اجالا کو تو چپ ہی لگ گئی تھی اس یہ یقین کرنے میں دو منٹ لگے کہ یہ خود پسند شخص اسی کا کزن ہے دو منٹ کی جامد خاموشی کے بعد وہ پھر مخاطب ہوا شاید کہ شاہ انتظار کر رہا تھا کہ وہ کچھ بولے گی...... پر وہاں بالکل سکوت تھا۔

"میں نے اتنی کوشش کی کہ کسی طرح یہ رشتہ رک جائے پر ہوا وہی جو تم اور تمہاری دادی چاہتی تھیں تم تو بہت خوش ہو گی نا آج کہ بیٹھے بٹھائے تمہیں ایک ہینڈسم لڑکا مل گیا ہے۔ نانو جاتے جاتے تمہارے ساتھ بھلائی کر گئی ہیں ہے ناں۔" شاہ نے سختی سے اجالا کی تھوڑی کو پکڑتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا

"تم بھی تو کوشش کر سکتی تھیں یہ رشتہ نہ ہوتا ہاں...... اوہ...... تم کیوں کرتی...... تم تو خود دوسروں کے ٹکڑوں پر پل رہی تھیں۔ تمہارے تو باپ نے بھی تمہیں نہیں رکھا۔" وہ غصے میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ اتنی بے رخی سے کہتے وہ اس کی ذات کے پرخچے اڑا گیا اجالا کو شاہ سے اس قدر ظالمانہ رویے کی توقع نہ تھی۔ جس کے لیے وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر آئی تھی وہ مسلسل اس کی ذات کی نفی کیے جا رہا تھا۔ لمحہ بھر میں اس کے ارمانوں کا محل زمیں بوس ہو چکا تھا اسے یقین نہ آیا کہ کوئی اپنا بھی اس قدر گرا ہوا ہو سکتا ہے۔ وہ دکھ سے کٹ کر رہ گئی اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

"اوہ...... ہیلو اب یہ خوامخواہ رو رو کے اپنی انرجی ضائع نہ کرو۔ مجھے تمہارے یہ آنسو کبھی بھی متاثر نہیں کر سکتے۔" اس نے ایک آنسو اجالا کے گال سے اٹھا کر اپنی انگلی پر سے اسے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو مجھے نہ تم میں پہلے کبھی دلچسپی تھی نہ اب ہے اور نہ ہی کبھی ہو گی۔ اب اٹھو جا کر چینج کرو اور مجھے سونے دو۔ مجھے تمہارا یہ روپ دل میں بسانے کا کوئی ارمان نہیں۔" شاہ نے بے حسی سے کہتے ہوئے انسانیت کی ساری حدیں توڑ دیں۔

وہ اٹھی اور خون کے آنسو پیتے ہوئے واش روم

میں چل دی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ باہر کہیں دور افق پر دن کا اجالا نمودار ہو رہا تھا اور اندر کا اجالا ماند پڑ رہا تھا۔

جب وہ واش روم سے آئی تو شاہ کو بے خبر سوتے پایا۔ ایسے شاندار انسان کی سوچ اتنی گھٹیا۔ کاش اس کی شکل اتنی اچھی نہ ہوتی دل خوبصورت ہوتا اسنے شاہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے تاسف سے سوچا۔ ساری رات اندر سوتی جاگتی کیفیت میں بیٹھی اکڑ گئی تھی۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا وہ ہلکا پھلکا میک اپ کرکے بناوٹی مسکراہٹ چہرے پر سجائے کمرے سے باہر آ گئی۔

''السلام علیکم۔'' اجالا نے صدف اور رمیز صاحب کو سلام کرتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم سلام جیتی رہو۔ سدا سہاگن رہو۔'' صدف نے اجالا کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''کیسی ہے ہماری بیٹی؟''

''جی ٹھیک ہوں۔ اجالا بیٹا شاہ اٹھ گیا ہے یا ابھی نہیں اٹھا؟''

''جی نہیں سو رہے ہیں۔''

''اسے بھی اٹھانا تھا نا اس کی بہت بری عادت ہے دیر تک سونے کی۔ جاؤ شاباش جا کر اٹھاؤ۔ بھابی لوگ ناشتہ لے کر آنے والے ہیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اجالا کو کمرے کا رخ کرنا پڑا۔

شاہ کو سوتا دیکھ کر اجالا کا دل نہ چاہا کہ ایسے شخص کو مخاطب بھی کرے جس نے رات اس کی ذات کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ اس کا دل ایک لمحے کے لیے چاہا کہ کاش شاہ نے اسے اتنا مان اور چاہت سونپی ہوتی تو وہ بھی اسے اپنی محبت کی چاشنی میں بھگو دیتی۔

اس سے پہلے کہ اجالا آگے بڑھ کے اٹھاتی شاہ نے اچانک کروٹ لی اور بیدار ہو گیا۔ ''محترمہ اگر جائزہ لے لیا ہو تو آپ جا سکتی ہیں مجھے اٹھانے کا قصد آپ نہ ہی کریں تو آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔''

شاہ نے اجالا پر چوٹ کی۔ اجالا کی تو سر پہ لگی تلوے پہ جا بجھی۔ ''مجھے کوئی شوق نہیں ہے آپ کو اٹھانے کا وہ پھوپھو نے کہا تھا کہ آپ کو جگاؤں ورنہ آپ سوئے ہی ٹھیک ہیں۔'' اجالا نے بھی جیسے رات کا تھوڑا بدلہ چکا دیا تھا اور پیر پٹختی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ باہر سب ناشتے پر منتظر تھے۔ اندر شاہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

آج ولیمے کی تقریب کافی بڑی اور شاندار تھی۔ رمیز صاحب کے اکلوتے چشم و چراغ کی دعوت ولیمہ تھی۔ شاہ بلیک پینٹ کوٹ میں کافی ہینڈسم لگ رہا تھا۔ اجالا نے لائٹ پنک کلر کی میکسی زیب تن کی ہوئی تھی جس کے بارڈر پر گولڈن کام ہوا تھا لیکن وہ مرجھائے اور اترے چہرے کے ساتھ اداس دکھائی دے رہی تھی اور وہ روپ غائب تھا جو پہلے دن کی دلہن پر ہوتا ہے۔ سب ہی نے اس کا یہ اداس چہرہ نوٹ کیا اجالا سے پوچھا بھی سب نے لیکن اس نے سر درد کا بہانہ کر کے ٹال دیا آج بھی شاہ کا وہی حال تھا کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ دونوں ایک دن کے دولہا دلہن ہیں نہ وہ شوخیاں نہ وہ شرارتیں اور نہ ہی وہ چھیڑ چھاڑ۔

''ماما میں آپ سے کہہ رہا ہوں میں کہیں نہیں جا رہا، اگر آپ کی بہو جانا چاہتی ہے تو بے شک چلی جائے مجھے کوئی اعتراض نہیں جتنے مرضی دن رہ آئے۔'' ولیمہ سے واپسی پر جب فائزہ بیگم نے جانے کی اجازت چاہی اور شہیر کو پتہ چلا کہ ان دونوں کو ساتھ جانا ہے تو وہ بتھے سے اکھڑ گیا۔ ''بیٹا ایسے نہ کرو یہ رسم ہوتی ہے ہر کوئی جاتا ہے اور ایک رات کی ہی تو بات ہے، کل ہم لینے آ جائیں گے۔'' صدف نے شاہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''رسم ہوتی ہوگی ان کو جو چاہت اور محبت سے بیاہ کر لاتے ہیں جن پر زبردستی مسلط کیا گیا ہو انہیں کسی رسم، کسی خوشی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اپنی ضد پوری کر تو لی ہے آپ دونوں نے اب آپ کیا چاہتی ہیں، میں کب تک آپ کے اشاروں پر ناچتا رہوں۔ سوری مجھ سے اب کسی قسم کی اچھی امید نہ رکھیے گا، آپ کی بات مان لی آپ کی ماں کی خواہش پوری کر دی کافی ہے آپ خوش ہیں اپنی ضد پوری کر کے میں خوش رہوں یا نہ رہوں کیا فرق پڑتا ہے؟ رہی بات ممانی کے گھر جانے کی تو آپ کو صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں میں خود ہی انہیں منع کر دیتا ہوں۔'' شہیر نے بدتمیزی کی حد کرتے ہوئے صدف بیگم کو حیران و پریشان کھڑے چھوڑ کر گاڑی کی طرف قدم بڑھا دیے پیچھے صدف آوازیں دیتی رہ گئیں۔

سب لوگ شاہ کا انتظار کر رہے تھے جو صدف کے ساتھ محو کلام تھا۔ اسے دور سے آتا دیکھ کر سب گاڑیوں کی طرف بڑھے ہی تھے کہ شاہ کی آواز سنائی دی۔ ''ممانی جان سوری میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا ایکچولی مجھے کسی ضروری کام سے جانا ہے، ہاں اگر آپ کو اجالا کو لے جانا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' شاہ نے سہولت سے انکار کر دیا۔ سب شاہ کے انکار سے دلگرفتہ ہوئے۔ ''شاہ بھائی شادی والے دن اپنی دلہن سے بڑھ کر کوئی کام نہیں ہوتا۔'' زارا نے پر جوش ہو کر شاہ کو ٹکڑا لگایا تو سب ہنس پڑے۔ شاہ کو اپنی ہتک محسوس ہوئی اس کے ماتھے پہ بل پڑ گیا ''میں نے کہا نا کہ مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔ میں نہیں جا سکتا۔'' اس نے سب کو نظر انداز کر کے اجالا کی طرف دیکھا۔ ''اجالا تم گھر چل رہی ہو یا ساتھ جا رہی ہو؟'' اس نے ڈائریکٹ اجالا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ اجالا ایک منٹ کے لیے گڑبڑا گئی امید نہیں تھی کہ شہیر سب کے سامنے اسے مخاطب کر لے گا ''نہیں میں بھی آپ کے ساتھ چل رہی ہوں۔'' اس نے بغیر سوچے سمجھے جواب دیا۔

''اچھا امی پھر کسی دن چکر لگا لیں گے۔'' اجالا نے سب کو ملتے ہوئے فائزہ بیگم سے کہا۔ ''اچھا بیٹا کوئی بات نہیں جہاں رہو خوش رہو۔ کل پرسوں چکر لگا لینا۔'' فائزہ بیگم نے شاہ کو پیار دیتے ہوئے کہا ''جی ضرور......'' شاہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہاں کہنا پڑا۔ سب گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔

''رضا آپ نے کچھ محسوس کیا شاہ کا رویہ پوری شادی میں بالکل اچھا نہیں رہا۔ اجالا بھی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ پہلے دودھ پلائی پر اس طرح بی ہیو کرنا اور پھر کل ہمارے گھر نہ آیا۔ مجھے تو لگتا ہے اسے کوئی کام نہیں تھا، وہ جان بوجھ کر نہیں آنا چاہ رہا تھا۔'' فائزہ بیگم نے فکر مندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں میں نے بھی محسوس کیا ہے لیکن ہو سکتا ہے شاہ کو کوئی ضروری کام ہو۔ ہمیں ایک دن میں کوئی رائے نہیں قائم کرنی چاہیے۔ ابھی ان کی نئی نئی شادی ہے۔ ایڈجسٹ ہونے میں تھوڑا وقت تو لگتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا۔'' رضا صاحب نے فائزہ بیگم کو تسلی دیتے ہوئے کہا جبکہ حقیقتاً وہ شاہ کے رویے سے خود بھی پریشان تھے۔

''بھابھی آؤ باہر چلتے ہیں تھوڑا گھومیں گے۔ ہوٹلنگ کریں گے۔ شاہ بھائی کے آنے تک واپس آ جائیں گے۔'' دعا نے اجالا کو بھابھی کہہ کر چھیڑتے ہوئے کہا۔ اس کو پتہ تھا اجالا چڑ جائے گی۔ اس لیے جان بوجھ کر کہہ رہی تھی۔ اور وہ واقعی چڑ گئی

''دعا تم انسان بن جاؤ۔ تمہارے منہ پر یہ بھابھی وابھی نہیں سجتا نہ مجھے تم سے کہلوانے کا شوق ہے۔ میں چاہتی ہوں ہم میں نند بھابھی سے زیادہ دوستی کا رشتہ ہی مضبوط رہے اور تم تو سب جانتی ہو نا۔ جب تمہارے بھائی نے مجھے بیوی ہی تسلیم نہیں کیا تو

تمہارے بھابی کہہ دینے سے حقیقت بدل تو نہیں جاتی۔ رہی بات باہر جانے کی تو میرا موڈ نہیں ہو رہا اور ویسے بھی اب مجھے وہ چیزیں جو پہلے خوشی دیتی تھیں اب اس طرح نہیں دیتیں اور جس چیز میں خوشی ہی نہ ہو وہ کر کے کیا کرنا۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو اجالا اتنی مایوس..... مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تمہارا یہ رویہ۔ ٹھیک ہے وقت بدل جاتا ہے لیکن انسان چاہے تو بعد میں بھی چیزیں اسے اتنی ہی خوشی دیتی ہیں جتنی کہ پہلے کیونکہ چیزیں آپ کو تب تک ہی خوشی دیتی ہیں جب تک آپ ان سے خوشی لینا چاہتے ہو۔ اور جب آپ مایوسی کے اندھیروں میں بھٹکنے لگ جاتے ہیں تو کوئی بھی خوشی آپ کو کبھی خوش نہیں کرسکتی چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ تم تو ایسی نہ تھیں یار۔ اور بھابھی تو میں تمہیں چھیڑنے کے لیے کہتی ہوں۔'' ''اچھا بابا اب نہیں کہوں گی۔ چلو ہنس کر دکھاؤ۔ تم اچھی طرح جانتی ہو میری تم سے بچپن سے صرف یہی لڑائی ہے اپنے اوپر بوڑھی اماؤں والی روح طاری کر لیتی ہو خود تو ڈرتی نہیں دوسروں کو ڈراتی رہتی ہو۔ ایسے تم میرے بھائی کو کیا قابو کرو گی لڑکی.....'' دعا نے بظاہر موڈ کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا جبکہ اندر سے وہ شاہ کے رویے پر بہت ہرٹ ہو رہی تھی کہ ایک پیاری سی لڑکی کو اپنے برے رویے سے مایوسیوں کے اندھیرے میں دھکیل دیا تھا۔ اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

''ہاہاہا..... تمہارا بھائی کسی عام انسان کے قابو میں آنے والا بھی نہیں ہے مائی ڈیر۔ اور بوڑھی اماں تم ہوگی میں کیوں ہوں ابھی تو میری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔'' اجالا نے ہنستے ہوئے اپنے رویے کو فوراً نارمل کرتے ہوئے کہا۔ وہ دعا کو بچپن سے جانتی تھی کہ جب تک اجالا ہنس کے نہ دکھاتی دعا نے کہاں باز آنا تھا، اس لیے عافیت اسی میں تھی کہ ہنس کر دکھا دیا جاتا۔ ''اوہ بھابی اب تم میرے اتنے ڈیشنگ بھائی کی شان میں گستاخی کر رہی ہو۔''

''تم ہی رکھو اپنے پاس اپنے ڈیشنگ بھائی کو۔'' اس بات پر دونوں کھلکھلا ہنس پڑیں۔ دعا نے شکر ادا کیا چلو کسی بہانے اجالا کے چہرے پر ہنسی تو آئی۔

دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ شاہ کا رویہ دن بہ دن بگڑتا جا رہا تھا۔ مصالحت کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا پہلے صرف اجالا سے الجھتا تھا اب گھر کے باقی افراد کے ساتھ بھی اس کا یہی حال تھا بہت بد لحاظ ہوتا جا رہا تھا اب تو رمیز صاحب کی دھمکیاں بھی کام نہ کر رہی تھیں۔ دونوں شاہ کے بدتر ہوتے رویے سے سخت پریشان تھے۔

شاہ پانی لاؤں پیو گے؟'' شاہ ابھی دوکان سے واپس آیا تھا۔ ''کیوں میں خود نہیں پی سکتا کیا؟!'' اس نے اجالا کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''شاہ تم ایسا بی ہیو کیوں کرتے ہو میرے ساتھ؟ ہم خوش بھی تو رہ سکتے ہیں۔ تھوڑا تم کمپرومائز کرو تھوڑا میں کرتی ہوں، مجھے یقین ہم اپنی زندگی کو اچھا بنا لیں گے۔ تمہارا دل نہیں چاہتا کہ ایک خوشیوں اور سکون بھری زندگی گزارو؟ تمہاری زندگی میں بھی کوئی تم سے محبت کرنے والا ہو؟ ہم مل کر ایک اچھی لائف گزار سکتے ہیں۔'' اجالا نے شاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم آخر کیوں اتنی اچھی بننے کی کوشش کر رہی ہو جبکہ تم جانتی ہو مجھے نہ تم سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ کبھی ہوگی۔ ہاں دل کرتا ہے، بہت دل کرتا ہے اچھی سکون بھری زندگی گزارنے کو پر اس کے ساتھ جسے میں پسند کرتا ہوں۔ جو زبردستی کسی پر مسلط کیا گیا ہو اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ اور تم تو میرے دل میں کہیں نہیں ہو دور دور تک اور نہ کبھی ہوگی۔ اس لیے اپنا اور میرا ٹائم ضائع نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔'' شاہ نے اجالا کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا اور پھر باہر نکل گیا اور اجالا کو سوچوں کے بھنور میں اکیلا چھوڑ گیا۔ باہر کھڑی دعا جو کسی کام سے اجالا کو بلانے آئی تھی ساری گفتگو اپنے کانوں سے سن چکی تھی اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کہ اس کا بھائی اس حد تک سنگدل ہے۔ اندر اجالا اپنی آنکھوں کے موتیوں سے اندھیرا کر رہی تھی اور باہر دعا افسردہ کھڑی ان دونوں کو دعاؤں کے حصار میں لیے ان کی زندگی کی دائمی خوشیوں کی متمنی تھی۔

دعا اجالا کی کزن سے کہیں بڑھ کر دوست رہی تھی اسے کسی طور بھی اپنی دوست کے ساتھ اس قدر ہتک آمیز رویہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اجالا کو بلانے کا ارادہ ملتوی کیا اور سیدھی باپ کے پاس پہنچ گئی۔ ''بابا مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے؟''

''آؤ بیٹا بیٹھو خیریت کوئی ضروری بات لگتی ہے، ہماری بٹیا اتنی پریشان کیوں دکھائی دے رہی ہے؟'' رمیز جو اخبار پڑھنے میں مصروف تھے اخبار سائیڈ پر رکھ کے دعا سے پوچھنے لگے ''جی بابا خیریت نہیں ہے میں بہت پریشان ہوں۔'' اور دعا نے اول سے آخر تک ساری گفتگو ان کے گوش گزار کر دی۔ ''آپ پلیز شاہ بھائی کو سمجھائیں کچھ بھی کریں میں اپنی دوست کے ساتھ اتنا برا سلوک برداشت نہیں کر سکتی مجھے پتہ ہوتا بھائی ایسا سلوک کریں گے اجالا کے ساتھ تو میں یہ شادی کبھی نہ ہونے دیتی۔''

''تم پریشان نہ ہو بیٹا میں آج شاہ سے بات کرتا ہوں۔'' دعا کو تسلی دیتے ہوئے حقیقتاً رمیز صاحب خود بھی پریشان ہو گئے تھے۔

آج اجالا کی سالگرہ تھی۔ ہر ایک کو اپنی سالگرہ کا انتظار ہوتا ہے۔ اجالا کے لیے بھی یہ دن بہت خاص تھا۔ میکے میں تو ہمیشہ سے بڑی اچھی مناتی آئی تھی لیکن سسرال میں یہ اس کی پہلی سالگرہ تھی۔ اجالا آج بڑے دنوں بعد دل سے تیار ہوئی تھی۔ ریڈ شیفون کی شرٹ جس پر بہت خوبصورت گولڈن کام ہوا تھا ساتھ میں چوڑی دار پاجامہ اور ہم رنگ دوپٹہ زیب تن کیا تھا۔ ہلکے سے میک اپ نے اسے دلکش بنا دیا تھا۔ آئینے میں آخری بار خود کو دیکھ کر کمرے میں چکر لگاتی بے چینی سے شاہ کا انتظار کرنے لگ گئی۔ آج تو اسے یقین تھا کہ اور کچھ نہیں تو شاہ اسے وش ضرور کرے گا اور وہ اتنے میں ہی خوش ہو جائے گی۔ اب تک گھر کے سب افراد اسے وش کر چکے تھے لیکن اسے جس کا انتظار تھا وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ شاہ صبح اسٹور کے لیے بھی جلدی نکل گیا تھا اجالا تب سو رہی تھی رات کے دس بجے شاہ کمرے میں داخل ہوا۔ ''السلام علیکم!'' اجالا نے لہجے کو بشاش بناتے ہوئے سلام کیا ورنہ شاہ کے خالی ہاتھ دیکھ کر دل تو اس کا کٹ کر رہ گیا تھا۔ ''وعلیکم سلام۔ اتنا تیار ہو کر رات کے دس بجے کہاں جانے کی تیاری ہے؟'' شاہ نے سجی سنوری اجالا کو دیکھ کر کہا..... ''وہ مم..... میں.....''

''دیکھو اگر کہیں جانے کا موڈ ہے اسپیشلی ماموں کی طرف تو یہ کوئی ٹائم نہیں ہے کہیں جانے کا۔ نہ مجھ سے امید رکھنا کہیں لے جانے کی اور میرے سامنے ایسے تیار ہونے کی ضرورت نہیں نہ مجھے شوق ہے تمہیں اس طرح سجا سنورا دیکھنے کا۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں مجھے سونا ہے اس لیے جاؤ یہاں سے میرا ٹائم ضائع نہ کرو۔'' شاہ یہ کہہ کر ابھی آگے بڑھا ہی تھا کہ اجالا نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا ''تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے جو تم مجھ سے ایسا برتاؤ کرتے ہو؟'' اجالا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ''اپنے سامنے تمہیں ہر چیز حقیر نظر آتی ہے۔ اتنا اونچا مت اڑو شہیر کہ منہ کے بل گرو

اور پھر ساری زندگی اٹھ بھی نہیں پاؤ گے، خود اپنے آپ سے نظریں بھی نہیں ملا پاؤ گے......'' اجالا نے بغیر لحاظ رکھتے اپنے دل کا سارا غبار نکال کر رکھ دیا۔

''اوہ...... یو...... تم مجھے گراؤ گی منہ کے بل ہاں؟ تمہاری اتنی ہمت......'' شاہ نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ ''اف شاہ... چھوڑو مجھے درد ہو رہا ہے'' اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا'' ہاہاہا...... درد...... تم کیا جانو درد کیا ہوتا ہے؟'' شاہ نے استہزائیہ اس کی طرف دیکھا اس کے بازوؤں پر شاہ کے ہاتھوں کی سختی زیادہ ہوتی چلی گئی...... آج پہلی بار وہ ظالم قریب آیا بھی تو کس انداز میں...... اف...... اجالا کے آنسو جھرنے کی طرح بہنے لگے۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں اجالا درد کیا ہوتا ہے؟''

جب کسی کی زندگی کو اس کے جان سے زیادہ چاہنے والے لوگ ہی جہنم بنا دیں تو درد ہوتا ہے......

جب اس کی زندگی میں ان چاہا شامل کر دیا جائے تو درد ہوتا ہے......

جب کسی کی بات کو اس کے جان سے پیارے ہی اہمیت نہ دیں تو درد ہوتا ہے......

جب کسی سے اس کی زندگی چھین لی جائے تو درد ہوتا ہے......

جب کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی سکون نہ ملے تو درد ہوتا ہے......

تم کہہ رہی ہو تمہیں درد ہو رہا ہے...... نہیں اجالا یہ وہ درد نہیں ہے جو میں دن رات سہہ رہا ہوں کیونکہ بظاہر درد نہیں ہوتا وہ تو تکلیف ہوتی ہے درد تو دل میں ہوتا ہے...... تکلیف برداشت ہو جاتی ہے درد برداشت نہیں ہوتا۔'' شاہ کی آنکھیں اذیت اور کرب سے سرخ ہو رہی تھیں ایسے جیسے ابھی ان میں سے خون بہہ نکلے گا...... اجالا کو ایک لمحے کے لیے خوف نے جکڑ لیا لیکن اگلے ہی لمحے وہ خوف اپنی تذلیل پر حاوی ہو گیا۔ اجالا نے جان لیا تھا کہ وہ کبھی بھی شاہ کے دل میں گھر نہیں کر سکے گی چاہے وہ اس کے لیے اپنی جان ہی کیوں نہ دے دے تو جو فیصلہ آج سے دس سال بعد بھی ہونا ہے کیوں نہ آج ہی ہو جائے......

''شاہ تم کہتے ہو تمہیں درد ہوتا ہے افسوس تمہارے پاس تو دل ہی نہیں ہے تمہیں درد کیسے ہو سکتا ہے؟؟ اور جس کے پاس دل ہوتا ہے وہ کسی بے گناہ کو رد کر کے کیسے خوش رہ سکتا ہے...... تم نے شادی کی ہے مجھ سے میں زبردستی تمہاری زندگی میں نہیں آئی اور مجھے بھی زبردستی تمہاری زندگی میں رہنے کا کوئی شوق نہیں...... تمہارے ہاتھوں روز روز ذلت اٹھانے سے بہتر ہے کہ میں ایک دفعہ ہی مر جاؤں۔ اگر تم میں اتنی ہمت نہیں تھی تو مجھے بتا دیتے میں انکار کر دیتی۔ اگر اپنے والدین کے ڈر کی وجہ سے مجھے اپنانے کا احسان کر رہے تھے تو اللہ اور اس کے رسول کو حاضر ناظر جان کر کسی لڑکی کو اپنی بیوی کے طور پر قبول کر کے پھر جانا کون سی مردانگی ہے؟ بولو، شاہ جواب دو؟؟'' اجالا نے چلا کے روتے ہوئے شہیر کا گریبان دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

''میں صرف تمہارے ماں باپ کے لیے اس رشتے کو گھسیٹ رہا تھا ورنہ کب کا تمہیں چھوڑ چکا ہوتا...... میں تمہیں پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں کہ میرے دل میں تمہارے لیے جگہ ہے اور نہ ہی کبھی ہوگی......'' شاہ نے اجالا کے ہاتھوں کو اپنے گریبان سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

''میرے ماں باپ کی وجہ سے؟ واہ کیا بات ہے مسٹر شہیر آپ کی...... کیا واقعی آپ میں اتنی انسانیت باقی ہے؟ کیا آپ کو واقعی رشتوں کا پاس

رکھنا آتا ہے؟؟؟ آپ تو اتنے گھٹیا انسان ہیں کہ...... چٹاخ......

''بکواس بند کرو اپنی تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے ایسے بات کرنے کی...... تم اس لائق ہی نہیں ہو کہ تمہیں ایک منٹ بھی برداشت کروں۔ میں اپنے سب تعلق تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے ہوش و حواس میں طلاق دیتا ہوں اجالا۔ طلاق دیتا ہوں...... طلاق دیتا ہوں۔''

شاہ نے ایک زوردار تھپڑ اجالا کے چہرے پر دے مارا اور زندگی کا ہر ناطہ ہمیشہ کے لیے توڑ لیا...... اجالا ابھی تھپڑ سے سنبھل نہ پائی تھی کہ شاہ کے اگلے لفظوں نے اس کے پیروں سے زمین کھینچ لی...... اس نے بے یقینی سے شاہ کو دیکھا۔ چہرے پر ناقابل یقین دکھ تھا...... اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی ایک زوردار چکر نے اس کے حواس سلب کر لیے اور وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر زمین بوس ہو گئی...... باہر سے گزرتی صدف نے جب تھپڑ کی آواز سنی تو شہیر کے کمرے کی طرف لپکیں ابھی دروازے پر ہی تھیں کہ شاہ کے اگلے الفاظ نے ان کے آگے بڑھنے کی طاقت سلب کر لی شہیر گری ہوئی اجالا پر ایک نظر ڈال کر غصے میں کمرے سے نکل گیا۔ صدف نے خود بے حال ہوتے ہوئے بے ہوش اجالا کو کسی طرح اٹھایا اور ہاسپٹل پہنچایا۔

''آپ لوگوں نے بالکل اچھا نہیں کیا میرے ساتھ ماما، بابا، مرے ہوئے کی خواہش پوری کرنے کے لیے آپ لوگوں نے زندہ لوگوں کو بھی مارنے سے گریز نہیں کیا کیا ملا آپ سب کو یہ کر کے میری زندگی سے کھیل کر؟ بتائیں جواب دیں؟ میں نے تین مہینوں میں ایک دن وہاں سکون سے نہیں گزارا، ایک دن بھی شاہ کی آنکھوں میں اپنے لیے چمک نہیں دیکھی۔ اس کے دل میں اپنے لیے محبت نہیں دیکھی۔ آپ نے جو کہا میں نے مان لیا کیا فائدہ ہوا اس سب کا میری زندگی تو تباہ ہو گئی نا......'' کل جب شہیر نے اسے طلاق دی تھی تب سے اب تک وہ ہسپتال میں بے ہوش پڑی تھی اور جب ہوش آتا ہذیانی ہو کر چلانے لگ جاتی تھی۔ کل اس کی سالگرہ تھی۔ اسے تو یقین تھا کہ شاہ اسے وش کرے گا۔ گفٹ دے گا اور ساری ناراضگی بھلا کر اسے گلے لگائے گا اور وہ بھی سب بھول کر اسے اپنا لے گی لیکن یہ کیا سب سے زیادہ خوشی دینے والے دن کو شاہ نے اس کی زندگی کا تلخ ترین دن بنا دیا تھا۔ سب لوگ اسے سنبھال کر تھک گئے تھے وہ تھی کہ شاک سے باہر ہی نہ آ رہی تھی۔ اب جب وہ شاک سے باہر آئی تھی تو بالکل خاموش تھی۔ آج اسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ آگے زندگی کیا تھی یا کیا ہونی تھی کچھ پتہ نہیں تھا۔

سعد اور رضا شدید غصے کی کیفیت میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ گھر میں ایسے خاموشی کا راج تھا ایسا لگتا تھا کوئی بندہ بشر یہاں رہتا ہی نہیں اور تو اور آج تو میرا کی شوخیاں شرارتیں بھی ماند پڑی ہوئی تھیں۔ اجالا اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ کھانا پینا چھوڑا ہوا تھا۔ ''سعد میں زندہ نہیں چھوڑوں گا شہیر کو، اس نے زندگی کو مذاق سمجھ رکھا ہے۔ کیا سمجھا ہماری اجالا کوئی لاوارث ہے''۔ دونوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شاہ کو جان سے مار دیں۔ ''رضا اب جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا ہے۔ میرے بھائی اجالا میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ میرا خون ہے۔ مجھے کتنی تکلیف ہو رہی ہے میں بتا نہیں سکتا۔ صدف کو اس کی بہت بڑی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس نے اچھا نہیں کیا ہمارے ساتھ۔'' سعد نے آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے رضا کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''شاہ تم نے ہم سے کس چیز کا بدلہ لیا ہے۔ تم

نے تو ہمیں خاندان میں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔" صدف نے شہیر کو بازوؤں سے پکڑ کے جھنجوڑ کے روتے ہوئے کہا۔ آج صبح سعد اور رضا نے صدف سے سارے رشتے ناتے توڑ کر اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ دو بھائیوں کی اکلوتی اور لاڈلی بہن سے ہمیشہ کے لیے رشتہ توڑ دیا تھا۔ صدف اس صدمے سے ہی ادھ موئی ہوئی جا رہی تھی۔

"شادی میری زندگی۔ خوشیاں میری...... اور فیصلہ کسی اور کا۔ نہیں ماما بابا نہیں...... ہر بار مہرہ والدین کے ہاتھ میں نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہیں جس رخ چاہیں اسے موڑ دیں۔ کبھی نہ کبھی وہ اولاد کے ہاتھ میں بھی آ جاتا ہے میں چاہتا تو اجالا کو ساری زندگی نہ چھوڑتا اور اسے کوئی حق بھی نہ دیتا لیکن نہیں میری لڑائی اس کے ساتھ نہیں تھی' میری لڑائی آپ لوگوں کے ساتھ تھی وہ بے چاری تو خود اس رشتے کے بندھن میں پھنسی ہوئی چڑیا تھی اور اس چڑیا کو پھنسایا آپ لوگوں نے تھا۔ اب پتہ نہیں ماموں کا میڈیکل اسٹور کے لالچ میں جو اجالا کا تھا یا پر واقعی آپ کو ماما اپنی ماں سے اتنی محبت تھی کہ آپ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی زندگی کی خوشیوں کی بھی پروا......" چٹاخ...... اس سے پہلے کہ شاہ اپنی بات مکمل کرتا صدف نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے چہرے پر دے مارا۔

"ماما آپ نے مجھے تھپڑ مارا......" شاہ کو یقین نہ آیا کہ اس کی پیاری ماں نے جس نے کبھی اسے ڈانٹا تک نہیں آج اپنی بھتیجی کے لیے تھپڑ کھینچ مارا۔ "تم میرے بیٹے نہیں ہو شاہ...... میں نے تمہاری تربیت ایسی نہیں کی تھی' تم میں اتنی خود پسندی کہاں سے آ گئی۔ میں نے کبھی تمہارے لیے برا نہیں چاہا۔ تم نے اچھا نہیں کیا اپنی ماں کے ساتھ...... میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی...... دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔

دعا کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا بھائی اس قدر خود پسند بھی ہو سکتا ہے۔ اسے یہی لگتا تھا کہ تھوڑے دن کی بات ہے دونوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب ہو جائے گا۔ اسے شاہ سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ وہ اپنی دوست کی حالت پر دکھ سے کٹ کر رہ گئی۔ شاہ کل کا گیا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ نہ ہی فی الحال کسی کو اس کا انتظار تھا۔ صدف بیگم تو اپنے بھائیوں کے چھٹ جانے کے صدمے سے ہی نکل نہ پا رہی تھیں۔ رمیز صاحب ایک ہفتے کے لیے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ تینوں ہنستے بستے گھر ایک چھوٹے سے غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

ماما نے مجھے تھپڑ مارا۔ زندگی میں پہلی بار اور گھر سے بھی نکال دیا۔ نہیں وہ اپنی بھانجی کے لیے اپنے سگے بیٹے کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں۔ کیا وہ مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگ گئی ہیں کہ میری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتیں۔ شاہ کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ کل سے بغیر کھائے پیے سڑکوں پر بائیک دوڑا رہا تھا۔ نہیں میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ماما کہ آپ مجھ سے نفرت کریں۔ ایک فیصلہ آپ نے کیا تھا ایک فیصلہ میں نے کر لیا ایسا کیا برا کیا میں نے؟ اگر آپ کو بیٹا نہیں چاہیے تو مجھے بھی اپنی زندگی نہیں چاہیے۔ نہیں چاہیے مجھے بھی اپنی زندگی...... اس کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی۔ تم نے اپنے ماں باپ کو دکھ پہنچایا ہے تمہیں مر جانا چاہیے شاہ...... ہاں...... تمہیں مر جانا چاہیے...... اجالا نے ٹھیک کہا تھا کہ کسی بے گناہ کو رد کر کے وہ کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ کل سے اب تک اسے ایک پل کے لیے بھی سکون نہیں ملا تھا اس کا ضمیر اسے بری طرح ملامت کر رہا تھا۔ وہ ہذیانی

انداز میں چلا رہا تھا ساتھ میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔ اس کی بائیک لڑکھڑا رہی تھی۔ اس کی ذہنی کیفیت بگڑ رہی تھی اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہو کر گرتا ایک تیز رفتار ٹرالے نے اس کی بائیک کو ٹکر دے ماری...... وہ لڑکھڑا کر بہت دور جا گرا۔ بائیک بھی بری طرح کچلی گئی۔ ٹرک ڈرائیور خون میں لت پت اس لڑکے کو دیکھ کر جس کے بچنے کے چانسز بہت کم تھے موقع سے ہی فرار ہو گیا۔

صبح کے چار بجے کا وقت تھا۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ کسی رحمدل انسان نے خون میں لت پت پڑے انسان کو دیکھ کر ایمبولینس کو فون کر دیا تھا اسے فوراً ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

رمیز آج صبح ہی گھر پہنچا تھا اور وہ گھر گھر نہیں رہا تھا سب کچھ تہس نہس ہو چکا تھا۔ محلے والوں سے پتہ چلا بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچا۔ صدف نے کتنے ہی فون سعد اور رضا کو کیے پر انہیں صدف سے نہ کوئی رابطہ رکھنا تھا نہ ہی انہوں نے رکھا۔ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ ان کی لاڈلی بہن پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے صدف کو رضا کے آخری الفاظ یاد آئے۔ تم ہمارے لیے ہمیشہ کے لیے مر گئی ہو۔ تمہارا، ہمارا اب کوئی تعلق نہیں۔ کوئی رشتہ نہیں۔ ہم سے کبھی دوبارہ رابطہ بھی کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ صدف نے تھک ہار کر فون دیوار پر دے مارا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"رمیز کچھ اچھا نہیں ہوا سب کچھ ختم ہو گیا۔ آپ نے کہا تھا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔ بھائی تو مجھ سے چھن ہی گئے ہیں میرے شاہ کو کچھ ہوا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔ ان سے کہو میرے شاہ کو بچا لیں۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔" صدف نے چلاتے ہوئے رمیز کو جھنجوڑا۔ اس کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت

آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑے تھے۔ اندر شاہ زندگی موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔ رمیز صدف کو تسلی دیتے خود بھی تھک گئے تھے۔ ان کی بھی اپنی حالت قابل رحم لگ رہی تھی۔

"ہم نے اچھا نہیں کیا رمیز...... بالکل اچھا نہیں کیا بچوں کی زندگی کے فیصلے ان کی مرضی کے خلاف نہیں کرنے چاہئیں...... اس نے ہمیں کتنا روکا تھا اس رشتے سے پر ہم نہیں مانے۔ ہم نے غلط کیا، بہت غلط کیا۔ دیکھیں اب کچھ بھی نہیں ہے میرے ہاتھ بالکل خالی ہیں۔" صدف نے رمیز کے آگے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ اس کی کیفیت اس دیوانے کی سی لگ رہی تھی جس کے پاس اب کھونے کے لیے کچھ نہ بچا ہو...... "بس کر دو صدف۔ خدا کے لیے بس کر دو...... پہلے ہی میں بہت اذیت میں ہوں مجھے اور تکلیف نہ دو...... میں نے ہی اپنے بیٹے کی زندگی برباد کی ہے...... میں نے ہی اسے فورس کیا تھا۔ میں نہ فورس کرتا اور نہ ہی یہ سب کچھ ہوتا۔ میں اپنے بیٹے کا مجرم ہوں۔" رمیز صاحب کی آنکھیں ضبط کی شدت سے سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

اس سے پہلے کہ رمیز کچھ اور کہتے ڈاکٹر انہیں نے انہیں اپنے روم میں آنے کو کہا۔

"جی تشریف رکھیں...... سوری مسٹر رمیز آپ کو یہ سن کے بہت دکھ ہوگا کہ آپریشن تو کامیاب رہا ہے آپ کے بیٹے کی زندگی تو بچ گئی ہے لیکن آپ کا بیٹا ساری زندگی کے لیے معذور ہو گیا ہے کبھی چل نہیں پائے گا۔" رمیز کے تو پیروں تلے زمین نکل گئی......

"نہیں ڈاکٹر صاحب وہ جی نہیں پائے گا ایسے۔ ایک غلط فیصلے کی اتنی بڑی سزا ملے گی اس نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔"

آج شہیر کو ڈسچارج کر کے گھر لایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے شاہ کے بارے میں جو بتایا وہ کوئی یقین نہ

کر پا رہا تھا۔ شاہ کو بھی جب اس حقیقت کے بارے میں پتہ چلا تو وہ دل دہلا دینے والے انداز میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور آخر کار خاموش ہو گیا۔

سب اس سے بول بول کے تھک گئے تھے۔ پر اس کی خاموشی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ صدف سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے شاہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''بیٹا ہمیں معاف کر دو...... ہم تمہارے قصوروار ہیں۔ پلیز شاہ کچھ تو بولو ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔ میں مر جاؤں گی بیٹا۔ میں نے تمہاری زندگی ایسے نہیں چاہی تھی شاہ......'' ماں کو تڑپتا دیکھ کر شاہ نہ چاہتے ہوئے بھی بول پڑا۔

''یہ میرے گناہوں کی سزا ہے ماما...... میرے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا...... مجھے میرے غرور کی سزا ملنا چاہیے تھی...... ماما آپ کو پتہ ہے اجالا نے ٹھیک کہا تھا کہ میں منہ کے بل گروں گا اور اٹھ بھی نہیں پاؤں گا۔ دیکھ لیں بالکل ایسے ہی ہوا ہے۔ مجھے اپنی وجاہت پر بڑا ناز تھا میرے ساتھ یہی ہونا تھا نا۔ میں نے اس کا دل دکھایا تھا مجھے سزا تو ملنی تھی نا...... ماما مجھے سمجھ آ گئی ہے جب کسی چیز کی مسلسل ناقدری کی جائے اللہ وہ آپ سے چھین لیتا ہے پھر آپ کو اس چیز کی قدر ہوتی ہے اور تب آپ کو پتہ چلتا ہے کہ جو اللہ نے آپ کے لیے لکھا تھا وہی بہترین تھا۔ آپ مت روئیں اور نہ معافی مانگیں مجھ سے۔ میں اپنی سزا کاٹ لوں گا......'' شہیر نے ماں کو شدت ضبط سے بے حال دیکھتے ہوئے کہا اور خود بھی رو پڑا۔

دعا اور رمیز بھی اس کی دل دہلا دینے والی باتوں پر آبدیدہ ہو گئے......

غزل

حامد علی سید

ہم بھی گزرے تھے ایک محشر سے
تم نے دیکھا تھا دیدۂ تر سے

تھی کبھی آرزو ہمیں تیری
اب یہ سودا نکل گیا سر سے

گھر کی خواہش میں جس نے دُکھ جھیلے
دُور ہونے لگا وہی گھر سے

جو تھے برفاب اپنی فطرت میں
جل گئے آج بادِ صرصر سے

ہیں بظاہر یہ پُرسکوں لیکن
لوگ ٹوٹے ہوئے ہیں اندر سے

گردشِ وقت یہ بتا ہم کو
کوئی محفوظ ہے ترے شر سے!

ہم نے حامد جنہیں چھپایا تھا
آج آنکھوں سے کیوں وہ غم برسے

ابھی امکان باقی ہے

قسط 17

ان کرداروں کی کہانی جو معاشرے میں بکھرے پڑے ہیں..... مگر جب یہ کردار امر ہو جائیں تو مزید کا بھی امکان باقی رہتا ہے...

☆.....☆

مجھے نہیں معلوم تھا کہ فائق نے انعم کو اس طرح تنگ کر رکھا ہے پتہ نہیں شارم بھائی کیسے خاموشی سے دیکھ کر آ گئے میں ہوتا تو اسے گریبان سے پکڑ کر پوچھتا ضرور۔'' اصم سے اپنا غصہ کنٹرول نہیں ہو رہا تھا اور پراگندہ مسلسل انعم کے حوالے سے اپنی پریشانی کا اظہار کر رہا تھا۔ ''اصم اکثر لڑکیاں اپنے مسئلے مسائل خود ہی حل کرنے کی کوشش کرتی ہیں تا کہ ان کے گھر والوں کو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو اور شوہر کی عزت پر بھی کوئی حرف نہ آئے۔''

''ہماری پریشانی اس کی خاموشی نے کم نہیں کی مزید بڑھائی ہے۔'' اصم نے اروی کی بات سن کر مزید سختی و تلخی سے کہا۔

انعم نے جو بھی کیا ہے۔ اب معاملہ سامنے آ گیا ہے تو آپ لوگ جا کر پوچھیں۔ انشاء اللہ کوئی بہتر حل نکل آئے گا۔ اروی نے شوہر کے موڈ کے مطابق بات کی تھی تا کہ وہ اس کی کسی بات کو نہ پکڑ لے۔ ''ہاں۔ وہ تو پوچھیں گے ہی جا کر...... انعم کو گھر سے نکال کر وہ خود سکون سے نہیں رہ سکتا۔'' اصم نے بھی گہری سانس لے کر جیسے خود کو سنا کر اطمینان دلایا۔ اروی مزید کیا کہتی۔ وہ گھر کے کسی بھی معاملے میں اپنی رائے دینے کی اہل نہیں تھی۔ اسے ابھی تک اپنے لیے یہی محسوس ہوتا تھا۔ اصم بھی مزید کچھ کہنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے خاموشی سے لیٹ گیا۔

☆.....☆

بلال درانی کافی دنوں بعد کھانے کے وقت گھر میں موجود تھے۔ لیکن فائق غائب تھا۔ کھانے کے کافی دیر بعد تک بھی وہ اس کا انتظار کرتے رہے تھے لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ تنگ آ کر وہ گیارہ بجے اپنے کمرے میں

آرام کرنے چلے آئے تھے۔ صالحہ کے پوچھنے پر بھی انہیں نے نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کا انتظار کیوں کررہے ہیں۔ صالحہ کو بھی فکر لاحق تھی کہ پتہ نہیں کیا بات ہے۔ آخر انہوں نے پوچھ ہی لیا۔ ''کوئی خاص بات ہے جو آج بیٹے کا اس شدت سے انتظار ہے۔''

''بات خاص ہے یا اہم یہ تو سمجھنے والے پر Depend کرتا ہے۔'' بلال درانی نے پائپ کو لائیٹر سے سلگاتے ہوئے ایک نظر بیوی کو دیکھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ الجھی ہوئی نظر آئیں۔

''اب تمہیں بھی مطلب سمجھایا جائے تو تمہارے ماں ہونے پر شک ہوگا'' بلال درانی کی سنجیدگی بڑھ گئی۔

ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟'' وہ اپنے اندیشوں سے ہراساں ہوکر بولیں'' تو اس میں غلط کیا ہے۔ آپ کی نظر اپنے بیٹے کے کسی فعل پر نہیں؟ وہ اپنی بیوی سے بدظن ہے اور دوسروں کی بیٹیوں کو لیے لیے گھومتا ہے آخر وہ چاہتا کیا ہے۔'' ان کی سنجیدگی میں دبا دبا غصہ تھا۔

''آپ کس کی بات کررہے ہیں؟'' صالحہ انجان بن کر بولیں

''تم اتنی بے خبر نہیں ہو اچھی طرح جانتی ہو میں کس کی بات کررہا ہوں۔'' انہوں نے ترشی سے کہا بھی اور دیکھا بھی۔

''وہ تو اس دن ہم سب اس کے ساتھ تھے سبرینہ ملنے آئی تھی مجھ سے ظاہر ہے شہری اور زیب نے بھی ساتھ ہی آنا تھا۔ ایسا کیا برا ہوگیا۔'' صالحہ نے فوراً صفائی دی۔

''برا یہ ہے کہ وہ صرف اس ایک دن نہیں بلکہ اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی شہری کے ساتھ ہی دکھائی دیا جاتا رہا ہے اور اب تو شریح نے بھی اعتراض کیا ہے اس بات پر۔'' بلال درانی بیٹھے سے اٹھ کر کمرے میں چکر کاٹنے لگے۔

''کیا......؟ ......شریح بھائی نے؟ لیکن انہیں اپنی بیٹی کے کسی عمل پر اعتراض نہیں ہے کیا؟'' صالحہ کے اندر یکدم ساس جاگ اٹھی'' ہمارا بیٹا اگر ادھر ادھر بھٹک رہا ہے تو اس میں بھی ان کی بیٹی کا قصور ہے۔ ان کی بیٹی کو نہ گھر سنبھالنا آیا ہے اور نہ ہی رشتے۔ انہیں صرف فائق پر نہیں اپنی بیٹی پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے۔'' وہ بیٹے کی حمایت میں تلخ ہوگئیں۔

''تو فائق کون سی اچھی مثال پیش کررہا ہے ہمارے سامنے گھر بنانے اور سنبھالنے کی ذمہ داری ایک فرد پر عائد نہیں ہوتی صالحہ۔ اسے کہو پسند کی شادی کی تھی تو اب ثابت قدم رہے۔'' بلال درانی کا رویہ صالحہ کے لیے ناقابل فہم تھا'' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ میرے کہنے کا اثر ہوجائے تو فائق سے کہو انعم کے ساتھ اپنی ریلیشن شپ کو ایک اور موقع دے۔'' وہ یکدم ٹھہر کر بیٹھ گئے۔ ''آپ کا کیا مطلب ہے میں نے یہ کوشش نہیں کی؟'' صالحہ نے پوری طرح جتایا'' کی ہوگی مگر اب دوبارہ سے کوشش کرو میں نے اس کے لیے ڈیفنس والی کوٹھی خالی کروالی ہے۔ اسے کہو کہ انعم کو لے کر وہاں شفٹ کرجائے۔ تاکہ دونوں کو ہی اپنی اپنی ذمہ داری کا احساس ہوجائے

''بلال درانی نے اس بار بہت نرمی اور تحمل سے بات مکمل کی۔ صالحہ کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ وہ ہمیں چھوڑ کر چلا جائے؟''

''وقت کا تقاضا یہی ہے صالحہ۔ اس کی اولاد ہونے والی ہے اس کا بھی کچھ فرض ہے انعم بھی وقت کے ساتھ ساتھ صحیح ہوجائے گی رہی ہمیں چھوڑ کر جانے کی بات تو وہ ہمیں پہلے کتنا ٹائم دیتا ہے۔ تم اسے سمجھاؤ۔'' بلال درانی کے لیے کہنا جتنا آسان تھا صالحہ کے لیے کرنا اتنا ہی مشکل......''

''اسے ماننا چاہیے۔ میں اس کی وجہ سے شریح سے اپنی دوستی خراب کرنا نہیں چاہتا۔'' بلال درانی نے اپنا فیصلہ تو سنا دیا تھا لیکن صالحہ کو کشمکش میں ڈال دیا تھا۔

☆......☆

فائق دیر گئے رات کو گھر لوٹ کر آیا تو بلال اور صالحہ سوچکے تھے باجی نذیراں بھی اپنے کوارٹر میں جاچکی تھی۔ آفس کے بعد دوستوں کے ساتھ ڈنر کے بعد مووی دیکھنے کا پروگرام بن گیا تھا۔ اس دوران پہلے شہرینہ کی کالز آتی رہیں اور بعد میں صالحہ کی مگر وہ دونوں کی کالز ہی نہیں سن سکا تھا اب گھر آکر چینج کرنے کے بعد بستر پر نیم دراز ہوتے ہوئے اس نے سب سے پہلا کام شہری کو کال کرنے کا کیا۔ وہ کال ریسیو کرتے ہی بیقراری سے بولی۔

''شکر ہے فائق تم نے فون تو کیا۔ کہاں تھے کیا کررہے تھے۔ خیریت تو تھی' وہ سوال پر سوال کرتی چلی گئی تو فائق اس کی بیقراری سے محظوظ ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

''مائی ڈیئر سانس تو لے لو تمہارے پیچھے کوئی فورس لگی ہوئی ہے یا کوئی گن پوائنٹ پر رکھے ہوئے ہے۔''

''تم میرا مذاق اڑا رہے ہو تمہیں معلوم ہے میں کتنی پریشان تھی تم کال پک نہیں کررہے تھے طرح طرح کے وہم آرہے تھے مجھے۔'' وہ بگڑ کر اپنی پریشانی کا اظہار کرتی فائق کو ہنسنے پر مجبور کررہی تھی۔ ''کیسے وہم......ہوا کیا ہے۔''

''You Know میں اپنے فرینڈز کے ساتھ ہوں تو ماما کی کال بھی نہیں سنتا۔'' فائق نے وضاحت کردی۔

''چاہے کوئی ایمرجنسی ہوجائے؟ کچھ بھی ہوجائے۔''

وہ سنجیدگی سے کہتے روہانسی ہوگئی۔

''تم صاف صاف بتاؤ ہوا کیا ہے۔'' فائق قدرے چڑ کر بولا۔

''وہی جس کا مجھے ڈر تھا۔ شارم بھائی نے ہم دونوں کو اکٹھے دیکھ لیا ہے۔'' وہ اپنے خوف اور اندیشے کو ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ ''So what ڈرنے کی کیا بات ہے تم میری کزن ہو۔ میرے ساتھ کہیں بھی جاسکتی ہو۔''

فائق نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے ریموٹ کنٹرول سے ایل ای ڈی کو آن کیا'' مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں ہے۔''

فائق تم سمجھ نہیں رہے ہو تمہارا اور رینا کا سسرال ایک ہی ہے میری تو چھوڑو تم دونوں کے لیے بہت

پرابلم ہو جائے گی۔“

شہری جیسے زچ ہو کر کسی بات کے لیے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”مجھے کیوں پرابلم ہوگی۔ میں اپنے کسی عمل کا کسی کے بھی سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔“ وہ بگڑ کر بولا۔

”انعم ابھی تک تم سے وابستہ ہے فائق، یہ بات کیوں بھول رہے ہو۔“ شہرینہ آج اس سے کچھ منوانا چاہتی تھی۔

”بس کچھ ٹائم کی بات ہے یہ وابستگی بھی ختم ہو جائے گی۔ ڈونٹ وری۔“ فائق کی بات میں واضح بیزاری تھی۔

”مجھے صرف تمہاری فکر ہے فائق۔ میری محبت تمہیں بکھرنے سے پہلے سمیٹ لینا چاہتی ہے تم مجھے کبھی بھی پکار لینا میں ہر دم تمہارے ساتھ ہوں۔“ شہری رات کے تیسرے پہر اپنے جذبات عیاں کرتے ہوئے بالکل بھی نہیں ہچکچائی۔

انعم نے ہمیشہ محبت کا اظہار مانگا تھا۔ اب اسے شہری سے اظہار مل رہا تھا محبت کا یہ ڈھب اس کے لیے نیا بھی تھا اور سرور انگیز بھی۔ وہ بہکتا نہیں تو کیا کرتا۔

☆......☆

اروی نماز فجر کی ادائیگی کے بعد نیچے آئی تو خلاف توقع و معمول نیلم پہلے ہی کچن میں کھڑی چائے بنا رہی تھی۔

”نیلم......! تم؟......“ نیلم کو دیکھ کر اروی نے بے ساختہ حیرت کا اظہار کیا ”بھابھی میں اپنے لیے چائے بنا رہی ہوں آپ پئیں گی۔“ نیلم نے مڑ کر دیکھا وہ بھی نفی میں سر ہلاتی آگے بڑھ آئی۔ ”نہیں پہلے میں بی بی جان اور بابا جان کے لیے چائے بناؤں گی۔“ اروی نے بات کرتے کرتے کیتلی میں پانی لیا اور چولہا جلا لیا ”تم آج اتنی صبح اٹھ گئی ہو کوئی ٹیسٹ وغیرہ ہے“ اروی نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”اروی بھابی مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے پلیز آپ مجھے کچھ ٹائم دیں۔“ نیلم نے بلا توقف اپنی بات کہی۔

”مجھ سے؟ اچھا میں ابھی تمہارے کمرے میں آتی ہوں۔“ شادو بھی کچن میں اٹھ کر آ گئی تھی اس لیے اروی نے اسے نہیں کریدا۔ نیلم بھی اپنے لیے چائے کا مگ لے کر کچن سے نکل گئی اروی سوچ میں تھی کہ وہ اس سے کیا بات کرے گی۔ اروی بی بی جان اور بابا جان کو چائے دینے کے بعد کچھ دیر ان کے پاس بیٹھی ان کی دلجوئی کرتی رہی۔ انعم کے حوالے سے ان کی پریشانی کو امید بھری تسلیوں سے تھپتھپانے کی کوشش کر کے وہ اٹھی تو اسے یاد آیا کہ نیلم اس کے انتظار میں ہوگی۔ وہ اس کے کمرے میں آئی تو وہ واقعی کمرے میں ٹہل رہی تھی۔

اروی کو دیکھ کر وہ تھم گئی ”بھابھی اتنی دیر؟“

”دیر......؟ میں تو جلدی آ گئی ہوں۔ تم بتاؤ کیا بات ہے“ اروی اس کا ہاتھ تھام کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گئی۔

”بھابھی کیا واقعی بی بی جان نے میرے لیے لڑکے دیکھنے شروع کر دیے ہیں۔“ اس کی بے چینی کھل کر سامنے آ گئی۔

”مجھے بھی نہیں پتہ ہے مگر میں نے سنا بھی ہے۔“

”بھابھی عامر کے گھر والے بھی آنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ میری ہیلپ کریں گی؟“ وہ بڑی آس سے پوچھ رہی تھی۔

”ہیلپ، کیسی ہیلپ؟“ اروی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس سلسلے میں اس سے مدد چاہتی ہے وہ اس کے لیے کیا کر سکتی ہے۔

”بھابھی۔ آپ کسی بھی طرح بی بی جان کو بتا دیجیے کہ میں عامر کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گی۔“

”کیا؟...... میں کیسے بتا سکتی ہوں وہ تو پہلے ہی انعم کے لیے پریشان ہیں اب تمہارے حوالے سے کوئی پریشانی انہیں ملے گی تو وہ کس قدر Tense ہوں گی سوچا ہے تم نے۔“ اروی بھی سن کر گھبرا گئی تھی۔

”بھابھی...... میں تو انہیں پریشانی سے بچانے کی بات کر رہی ہوں۔ اگر انہوں نے کوئی پروپوزل قبول کر لیا اور میں نے انکار کر دیا تو پھر سوچیں کیا ہوگا؟“ نیلم نے لاپرواہی سے اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔ اروی مزید حیران ہوئی۔

”نیلم...... تم ایسا کرو گی؟“ اروی نے بے یقینی سے دیکھا بھی۔

”بھابھی میں عامر کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ پلیز کسی طرح بھی بی بی جان تک یہ بات پہنچا دیں۔“ نیلم کے اٹل ارادے اس کے چہرے پر بھی رقم تھے۔

”نیلم میرے لیے یہ بہت مشکل ہے۔ تم ثمن بھابھی سے کہو وہ یقیناً زیادہ مناسب طریقے سے بات بڑھا سکیں گی۔“ اروی کو ہچکچاتا دیکھ کر وہ جھنجلا گئی۔ ”مجھے کسی پر اعتبار نہیں ہے مجھے آپ پر بھروسہ ہے کہ آپ کسی کو بتائے بغیر بی بی جان سے صاف بات کریں گی پلیز بھابھی یہ میری زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ میں کسی اور کے ساتھ خوش نہیں رہ سکوں گی۔“

”میں ان سے کیا کہوں گی کہ...... اور پھر تمہارے لیے تو بی بی جان اور بابا جان ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں نا۔“ اروی کو خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اسے کیسے سمجھائے۔

”انعم کے لیے بھی تو انہوں نے ہی فیصلہ کیا تھا۔ اس کا حال دیکھیں وہ کتنی ناخوش ہے یہیں آ کر بیٹھی ہوئی ہے۔“ اروی کو سن کر مزید حیرانی ہوئی وہ کس قدر بدگمان ہو رہی تھی۔

”نیلم۔ والدین اپنی اولاد کے لیے کبھی برا نہیں چاہتے۔ ہاں انسان خود اگر اپنے حالات سے نہ لڑ سکے تو اور بات ہے یا پھر مقدر کا لکھا ہم نہیں ٹال سکتے۔“ اروی نے نرمی سے سمجھایا۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے صرف یہی سمجھ آتی ہے کہ میں نے اپنے لیے صحیح بندے کو چنا ہے۔“ نیلم اپنی بات منوانے کا عزم ظاہر کرتی اروی کو مزید بولنے سے روک گئی۔

"ٹھیک ہے۔ میں بی بی جان سے موقع دیکھ کر بات کرنے کی کوشش کروں گی" اروی نے بالآخر ہار مان کر کہا۔ نیلم کے چہرے پر بھی اطمینان وخوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے لگتا تھا کہ یہ کوئی مشکل عمل نہیں ہے۔

☆......☆

صالحہ صبح سے بیٹے کے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ مگر وہ کمرے سے باہر ہی نہیں آیا تھا۔ بلال درانی بھی آفس جا چکے تھے۔ وہ بارہ بجے پوری تیاری کے ساتھ کمرے سے برآمد ہوا تو صالحہ کا لہجہ خود بخود طنزیہ ہو گیا
"آج پھر آفس نہیں جاؤ گے۔"

"نہیں...... میں کہیں لنچ پر انوائیٹ ہوں۔ لنچ کے بعد چلا جاؤں گا۔" وہ اپنے آپ میں مگن سا بولا۔ نظر موبائل پر مرکوز تھیں۔

"تمہاری یہ حرکتیں اب تمہارے پاپا سے بھی برداشت نہیں ہو رہیں۔ اسی لیے انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" صالحہ بہت چڑھ کر جھنجلا کر بول رہی تھیں "کیسا فیصلہ؟" وہ یکدم چونک اٹھا۔ نظر کا ارتکاز بھی بدلا تھا اور موبائل اسکرین پر حرکت کرتی انگلی بھی تھم گئی تھی۔

"وہ تمہیں الگ بزنس سیٹ اپ اور گھر دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔" صالحہ نے اس کے سر پر کوئی بم پھوڑ دیا تھا۔

"مگر کیوں......؟" وہ فوراً ہی ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

"کیسا فے......صلہ......؟ فائق کے تاثرات دیدنی تھے۔

"وہ تمہیں الگ بزنس سیٹ اپ اور گھر دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔" صالحہ نے بڑی ہمت جمع کر کے بیٹے کو شوہر کا فیصلہ سنایا۔

"مگر کیوں......؟" وہ فوراً پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔

"میں نے تو ان سے کوئی ڈیمانڈ نہیں کی اور نہ ہی میں آپ لوگوں کو چھوڑ کر کہیں جانا چاہتا ہوں اور نہ ہی میں جاؤں گا۔" وہ قطعی انداز میں بول اٹھا۔

"تم نے......نہ......نہیں کی لیکن......" صالحہ کی خفگی میں ذرا کمی آئی۔ وہ بات مکمل نہ کر سکیں۔ فائق نے جانچتی نظروں سے دیکھ کر پوچھا "لیکن کیا؟" آپ چپ کیوں ہو گئیں؟ بتائیں مجھے یہ ڈیمانڈ ادھر سے ہوئی ہے؟ ہے نا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟" وہ بولتے بولتے جوش میں آ گیا۔

"میں نہیں جانتی یہ ڈیمانڈ ادھر سے ہوئی ہے یا تمہارے پاپا کا فیصلہ ہے یہ...... بس وہ چاہتے ہیں کہ تم اپنی بیوی اور بچے کی ذمے داری خود اٹھاؤ۔" صالحہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہا "جب بچہ اس دنیا میں آئے گا تو اٹھالوں گا۔ میں اس کی ذمے داری بھی۔ رہا بیوی کا معاملہ تو انعم کی میری زندگی میں کوئی گنجائش ہے نہ جگہ۔" فائق کا انداز اٹل تھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو فائق...... تمہارے پاپا یہ کبھی نہیں ہونے دیں گے" صالحہ حیرت بھرے تاثر لیے کوفت سے بولیں۔

"میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا مما...... بلکہ میں ایک بات اور بھی کلیر کرنا چاہتا ہوں۔ میں جلد ہی دوسری شادی کرنے والا ہوں۔"

"کیا......؟" صالحہ مارے حیرت کے بول ہی نہیں پائیں۔ گویا جو وہ محسوس کر رہی تھیں وہ ہونے جا رہا تھا۔

"فا......ئق......تم......تم......شا......دی!"

"پلیز مما...... مجھے سمجھانے کی کوشش بے کار ہو گی میں بھی فیصلہ کر چکا ہوں۔" اس نے اپنی بات حتمی انداز میں کہی اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ صالحہ کو نئی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

☆......☆

بی بی جان ناشتے کے بعد اپنی معمول کی دوا لے کر کچھ دیر ستانے لیٹی تھیں۔ سبرینہ اور ثمن کچن میں دوپہر کے کھانے کی تیاری میں تھیں۔ اروی اصم کے کاموں سے فارغ ہو کر نیچے آئی تو بی بی جان نیلم کے حوالے سے بات کرنے کے لیے وہ ان کے کمرے میں چلی آئی۔ دستک دے کر وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو بی بی جان ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی بولیں۔ "آؤ آؤ بیٹا۔ میں ابھی تمہیں بلانے کا سوچ ہی رہی تھی۔"

"کوئی کام ہے آپ؟ جی بتائیے" وہ فوراً آگے آ کر پوچھنے لگی "کام تو کوئی نہیں ہے بس ایسے ہی جی چاہ رہا تھا۔ کسی سے بات کرنے کو" بی بی جان ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں

"بی بی جان آپ پریشان مت ہوں انشاء اللہ سب معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔" اروی جیسے ان کی کیفیت سمجھ رہی تھی۔

"اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔ اولاد کے دکھ اسی طرح بے چین رکھتے ہیں۔ انعم کے لیے دل پریشان رہتا ہے۔" بی بی جان نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا" "ظاہر ہے بی بی جان بیٹی کے لیے پریشان نہیں ہوں گی تو کون ہو گا۔ میں آپ کی حالت سمجھ سکتی ہوں بی بی جان!" اروی نے ان کی دلجوئی کی خاطر ان کے پاس بیٹھ کر ان کا ہاتھ بھی تھام لیا" "کاش یہ بات انعم کو بھی سمجھ میں آ جائے کہ اس کے یہاں آ کر رہنے سے نیلم کے لیے کتنی مشکلات پیدا ہو رہی ہیں اس کے لیے آنے والے رشتے انعم کی یہاں موجودگی کی وجہ پہلے جاننا چاہتے ہیں۔"

"کیا......" اروی پہلے تو بے ساختہ حیرت سے بولی۔ پھر یکدم خود کو سنبھال کر بولی "بی بی جان انعم کا یہاں میکے میں رہنا کوئی بڑا مسئلہ تو نہیں ہے کئی خاندانوں میں بیٹیاں اس کنڈیشن میں میکے میں آ کر رہتی ہی ہیں۔"

"رہتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن جب گھر کے معاملات کشیدہ ہو جائیں تو لوگوں کی نگاہوں سے کیسے بچ سکتے ہیں۔" بی بی جان کے چہرے پر ملال تاسف یکساں تھا۔

"آپ کی فکریں اپنی جگہ درست ہیں بی بی جان لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت سے بڑھ کر تو کچھ ہیں آپ اللہ پر اپنا بھروسہ رکھیں نیلم اور انعام کے مقدر میں انشاء اللہ خوشیاں ہوں گی۔" اروی نے پورے خلوص سے انہیں اطمینان دلانے کی کوشش کی "آمین۔ اللہ میرے سبھی بچوں کو خوش و آباد رکھے۔ مجھے اور زندگی میں کیا چاہیے" بی بی جان کو بھی جیسے ڈھارس ملی تھی اروی جو بات کہنے آئی تھی کہہ نہیں سکی۔ نیلم کا پیغام انہیں دے کے وہ انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆......☆

فائق بہت غصے میں جذباتی ہو کر گھر سے نکلا تھا انعم کی ضد ہٹ دھرمی اور برے رویوں کے باوجود اس

کے گھر والوں کی طرف سے الگ گھر کا مطالبہ اس کے خون کو گرما گیا تھا۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ ابھی جا کر انعم کو سبق سکھادے لیکن وہ فی الحال اپنے پاپا کے ہاتھوں بھی مجبور تھا۔ وہ انہیں خود سے متنفر نہیں کرنا چاہتا تھا اسے اب جو کچھ بھی کرنا تھا سوچ سمجھ کر کرنا تھا ڈرائیونگ کے دوران وہ جس قدر غصے میں تھا اپنے آفس میں بیٹھ کر وہ اسی قدر اطمینان سے غور وفکر کر رہا تھا۔ کہ اسے ان کے مطالبے یا پاپا کے جواب میں کیا کرنا چاہیے سو کچھ دیر آرام سے سوچنے کے بعد وہ انعم کو فون کر رہا تھا۔

انعم اس وقت بی بی جان کے پاس ان کے کمرے میں بیٹھی صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا اکٹھے کھانے میں مصروف تھی۔ جب اس کے پاس صوفے پر پڑا اس کا موبائل بجنے لگا۔ اسکرین پر فائق کا نام جگمگا رہا تھا انعم پہلے تو چونکی پھر اس کے چہرے پر تناؤ سا آ گیا پہلی بار اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ رنگ ٹون ایک بار بج کر بند ہو کر پھر بجنے لگی۔ بی بی جان اس کی جانب ہی متوجہ تھیں ''کس کا فون ہے۔ بات کیوں نہیں کر رہی ہو۔'' بی بی جان کو اس کے تاثرات سے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔

''مجھے نہیں بات کرنی اس سے'' انعم نے سرد مہری سے جواب دیا ''کیوں شوہر کا فون ہے' بات کیوں نہیں کرو گی تم۔ بات کرو اس سے نجانے وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔'' بی بی جان نے اسے ڈپٹ کر کہا تو انعم نے ہمت کر کے برے تاثرات کے ساتھ پراٹھے کا نوالہ پلیٹ میں رکھتے ہوئے فون اٹھایا اور بہت برے طریقے سے لیچنگ پوائنٹ کو رگڑ کر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف فائق بھی بھرا بیٹھا تھا۔ فوراً ہی بولا ''مجھے کوئی شوق نہیں ہے تم سے Contact کرنے کا لیکن تمہاری حرکتوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ یاد رکھو تم لوگ پاپا کے ذریعہ مجھ سے جو منوانا چاہتے ہو وہ میں ہرگز نہیں مانوں گا۔'' فائق نے سارا غصہ ساری بھڑاس اس پر نکال دی ''ہم نے کسی کو مجبور نہیں کیا اور تم سے کچھ منوانے کی مجھے کوئی خواہش نہیں' اپنی غلط فہمی دور کر لو تم ایک دفعہ مجھ سے Contact نہیں کرنا چاہتے میں کبھی بھی تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔'' انعم نے بھی پلٹ کر اسی کے انداز میں جواب دیا۔ بی بی جان اسے گھور کر اشاروں سے سمجھانے لگیں مگر اس نے انہیں ان دیکھا کر دیا'' ہونہہ..... تبھی تمہارے گھر والے کہہ رہے ہیں کہ میں تمہیں الگ گھر میں رکھوں۔ ان سے کہو یہ خواب دیکھنے چھوڑ دیں۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا لیکن اپنی ماں اور اپنا گھر نہیں اور انہیں یہ بھی بتا دو میں جلد ہی دوسری شادی کرنے والا ہوں۔'' فائق نے اپنی بات کہہ کر کال منقطع کر دی۔ فائق کو تو سکون مل گیا تھا مگر انعم بے یقین دم گم سم سی ہو کر بیٹھی رہ گئی تھی۔ بی بی جان اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر سہم گئیں۔ ''انعم..... کیا کہہ رہا تھا فائق بولو۔ جواب دو کیا کہا اس نے تم اس طرح کیوں بول رہی تھیں۔ میں نے تمہیں سمجھایا تھا نہ کہ شوہر سے ایسے بات نہیں کرتے۔'' بی بی جان اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئیں۔ اسے باقاعدہ جھنجوڑ کر متوجہ کیا تھا

''ہاں..... ساری نصیحتیں صرف میرے لیے ہیں۔ بی بی جان جو جس قابل ہوتا ہے میں اس سے اسی طرح بات کرتی ہوں۔ مجھے مت سمجھایا کریں۔'' ایک دم بگڑ کر بولی ''تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے تمہیں کسی کا احساس بھی ہے'' بی بی جان نے قدرے بگڑتے ہوئے تاسف سے کہا۔

''نہیں مجھے کسی کا احساس نہیں ہے اور جس کی عزت واحترام کا درس دیتی ہیں نا آپ مجھے دوسری شادی کرنے والا ہے۔ یہی اطلاع دینے کے لیے اس نے فون کیا تھا۔'' انعم نے اس بار چیخ کر کہا۔ بی بی جان بے یقینی سے گنگ رہ گئیں۔ انعم لاپرواہی سے کندھے جھٹک کر دوبارہ سے سامنے رکھے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

فائق نے انعم کو جو بتانا' جتانا تھا بتا دیا تھا۔ اب اپنے کہے پر عمل کرنے کے لیے اس کے ذہن میں ایک ہی نام تھا شہرینہ۔ اس کی زندگی میں دوست لڑکیاں تو بہت تھیں جن کے ساتھ وہ وقت گزارتا تھا لیکن ایسی کوئی نہیں تھی جس کے ساتھ وہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتا' سوائے شہرینہ کے شہرینہ خاندان کی لڑکی تھی اور گھر کی اہمیت اور رشتوں کا پاس کرنا جانتی تھی اور وہ اپنی محبت کا احساس بھی اسے بخش چکی تھی۔

تبھی اس نے لمحے بھر میں فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ اسے فون کر رہا تھا۔

☆.....☆

شہرینہ اپنے اسکول کے آفس میں بیٹھی اسکول ٹیچرز سے آنے والے کسی اسکول ایونٹ پر بات چیت کر رہی تھی۔ اسی لمحے فائق کی کال اس کے فون پر آنے لگی۔ ٹیچرز کی موجودگی میں وہ اس سے بات کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی ایک بار تو اس نے رابطہ منقطع بھی کر دیا۔ لیکن اگلے ہی پل پھر ٹون بجنے لگی ایک دو ٹیچرز کے چہرے پر اس نے معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر فوراً کال ریسیو کر لی۔

''میں ابھی ٹیچرز کے ساتھ میٹنگ میں ہوں بعد میں کال کرتی ہوں.....'' شہرینہ نے بہت مدہم لہجے میں کہا۔

''بھاڑ میں جائے تمہاری میٹنگ پہلے میری بات سنو۔'' دوسری طرف وہ نہایت غصے سے بولا تو شہرینہ ایک دم گھبرا گئی۔

''او کے..... او کے..... جسٹ اے منٹ!'' اس نے جیسے اسے ٹھہرایا ''پلیز ٹیچرز باقی ڈسکشن ہم کل کریں گے۔'' اس نے سبھی کو جانے کا اشارہ کیا۔ ایک دو ٹیچرز منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی نکلی تھیں۔ ٹیچرز کے جاتے ہی اس نے بے صبرے پن سے فائق کو فون پر پکارا ''فائق Are you there? فائق خیریت ہے نا فائق..... کیا ہوا؟''

''ابھی تک کچھ نہیں ہوا' مگر ہونے جا رہا ہے تم بس اتنا بتا دو Will yo marry me? فائق کی واضح بات پر بھی شہرینہ نے بے یقینی سے بولی

''کیا؟'' ''تم مذاق تو نہیں کر رہے فائق؟''

''مجھ سے یہ توقع کرتی ہو کہ میں تم سے اتنی بڑی بات مذاق میں کہوں گا'' وہ قدرے خفگی سے کہنے لگا تو وہ حز بڑا گئی۔

''نہ..... نہیں مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میری اتنی بڑی خواہش پوری ہونے جا رہی ہے'' شہرینہ کی آواز خوشی سے کپکپا رہی تھی۔

''تو تمہیں یقین دلانے کے لیے کیا کروں میں۔ اچھا اپنے اسکول سے نکلو نہیں میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔'' فائق نے بات ختم کرتے ہی رابطہ منقطع کر دیا اور گاڑی کی چابی کا چھلا سامنے میز سے اٹھا کر آفس سے نکلتا چلا گیا۔

شہرینہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا وہ بے خودی اپنی بکھری چیزیں سمیٹ کر بیگ میں رکھنے لگی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ یہ خبر سب سے پہلے اپنی مما اور سبرینہ کو پہنچا دے۔ اس کے لیے ایسا کرنا مشکل تو نہ تھا لیکن فائق کی آمد کسی بھی لمحے متوقع تھی اس لیے وہ اپنی خواہش دبا کر اپنی بے خودی میں ہی اسکول کی عمارت سے باہر

آ کر کھڑی ہوگئی۔

☆......☆

کالج کے دوسرے گیٹ کے باہر عامر اسد اپنی گاڑی لیے کھڑا تھا۔ نیلم نہ نہ کرتی بھی اس کی ناراضگی کے ڈر سے بالآخر کالج ٹائم میں باہر نکل آئی تھی۔ بلکہ سارا نے ہی اسے مجبور کیا تھا کہ وہ چلی جائے عامر جیسے اس کا منتظر ہی تھا۔ اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے گاڑی بڑھالی۔

''عامر روز روز اس طرح ملنا مناسب نہیں ہے۔ اس طرح میری پڑھائی بھی متاثر ہورہی ہے اور میرا امیج بھی'' نیلم نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے خفگی سے کہا۔ اروی کی باتیں اور فضہ کی نگاہیں اسے اپنے تعاقب میں محسوس ہورہی تھیں۔

''اچھا تمہیں اپنی پڑھائی اور امیج کی پڑی ہے اور میں اپنا وقت برباد نہیں کرتا تمہاری خاطر تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے سارا دن خوار ہوتا ہوں۔ اس کا احساس ہی نہیں ہے تمہیں۔'' عامر نے جوابی حملہ کیا تو وہ ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

''مجھے احساس ہے تبھی تو کہہ رہی ہوں۔ تم بھی اپنے گھر والوں سے کیا کیا بہانے کرتے ہوگے اگر کسی دن ہمیں کسی نے دیکھ لیا تو سوچو معاملہ بگڑ نہ جائے۔'' وہ اس کی ناراضگی سے ڈر جاتی تھی۔

''میرے گھر والوں کی تم فکر نہ کرو انہیں میں نے تمہارے بارے میں بتادیا ہے اور منا بھی لیا ہے' اب تو تمہاری طرف سے سگنل ملے گا تو ہم لوگ آجائیں گے۔'' عامر نے بھی اپنا لہجہ بدلا ''واقعی! تمہارے گھر والے مان گئے ہیں؟ انہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔'' نیلم خوشی سے پوچھنے لگی۔ یکدم اس کی اندرونی کیفیت بدل گئی تھی۔ ''میں نے کہا تھا ناں میرے گھر والوں کو میری خوشی چاہیے۔ وہ تو تم سے ملنے کو بے تاب ہیں۔ بولو چل رہی ہو گھر۔''

''میں...... اس طرح؟ تمہارے گھر؟ نہیں بھئی نہیں۔ میں اس طرح تو کبھی نہیں جاؤں گی البتہ وہ ہمارے گھر آئیں گے تو مل لوں گی۔'' نیلم نے جھٹ انکار کیا تو عامر کا منہ بن گیا۔

''ہاں بشرطیکہ تمہارے گھر والوں نے میرا پرپوزل Accept کرلیا تو بھی مل پاؤ گی میرے گھر والوں سے ورنہ یاد رکھنا تمہارے گھر والوں نے انکار کردیا تو میں خودکشی کرلوں گا۔'' عامر نے قدرے جذباتی ہوکر کہا تو نیلم سہم سی گئی۔

''ایسی باتیں کیوں کررہے ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا مان جائیں گے میرے گھر والے بھی۔ میں نے اپنی بھابھی سے کہہ دیا ہے کہ وہ بی بی جان کو بتادیں۔ پھر میں تمہیں بتادوں گی' تم بھیج دینا اپنے پیرنٹس کو۔'' نیلم نے بے اختیاری میں اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

''بس یار جو بھی کرنا ہے جلدی کرلو اب اور انتظار نہیں ہوتا'' عامر نے اس کا سر ہلکے سے تھپتھپایا۔

''ہوں میرا بھی یہی حال ہے'' نیلم نے کھل کر اعتراف کیا تو عامر کے لب مزید کھل اٹھے۔ آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

☆......☆

انعم بی بی جان کے کمرے میں تو لاپرواہی کا مظاہرہ کرکے آگئی تھی لیکن کمرے میں آتے ہی اس کا دل

ڈوبنے لگا تھا۔

فائق دوسری شادی کرنے جارہا ہے مطلب مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا فیصلہ کرچکا ہے۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بستر پر جیسے ڈھے گئی۔ اس کا وجود ہولے ہولے لرزنے لگا۔ سانس لینا بھی دشوار ہورہا تھا۔ اس کا ذہن مضطرب تھا۔ تو کیا اس کی محبت' اس کے وعدے بھی جھوٹے تھے۔ اس نے تو کہا تھا اس کی زندگی میں کوئی ایسی ہستی نہیں ہوگی جو میری جگہ لے سکے۔ پھر...... اب...... آخر وہ کون ہے...... میری جگہ لے رہی ہے ...... کون ہے...... وہ؟ انعم کا دل ڈوب رہا تھا جسم سے جیسے جان نکلتی محسوس ہورہی تھی۔ وہ ایک نئی اذیت سے گزر رہی تھی۔ اس کے وجود میں ایک اور وجود بھی سانس لے رہا تھا۔ آج پہلی بار اسے اپنے وجود کے اندر پلتے وجود کا احساس ہوا' یا اللہ...... میرا بچہ۔ اس کے اندر درد کی لہریں موجزن ہوگئیں جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ وہ جیسے تڑپنے لگی۔ اس کی نقل و حرکت سے بیڈ سائیڈ پر پڑا پانی کا خالی گلاس فرش پر گرا چھناکے کی آواز باہر تک سنائی دی تھی۔

☆......☆

اروی کمروں کے پیچھے لانڈری ایریا سے اصم کے کپڑے لے کر انعم کے کمرے کے سامنے سے گزری تو چھناکے کی آواز پر ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی۔ انعم کے کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ اک بار تو دل میں آیا کہ یونہی گزر جائے انعم کی تلخ نوائی سے ڈر لگتا تھا لیکن اندر سے آتی چیخ نے اسے بے اختیار اندر بڑھنے پر مجبور کردیا انعم کی حالت ناگفتہ بہ تھی وہ اصم کے کپڑے ایک طرف رکھ کر انعم کے لیے پریشان سی اس کی طرف بڑھ کر بولی

''انعم...... انعم کیا ہوا ہے؟''

''بی...... بی...... جا...... ن...... میں...... مرگئی'' انعم کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اروی اس کی حالت دیکھ کر گھبرا کر پلٹی اور تقریباً دوڑتی ہوئی کچن تک پہنچی۔

''ثمن بھابی...... ثمن بھابی...... انع...... م...... کو پتہ نہیں کیا ہوا ہے۔'' اروی کی گھبرائی ہوئی آواز پر ثمن ایک دم پلٹ کر دیکھنے لگی۔

''انعم کو...... اچانک؟...... چلو...... چلو میں دیکھتی ہوں۔''

ثمن چولہے بند کرتے ہی اروی کے ساتھ تیز قدموں سے لپکی۔ سبرینہ کچھ دیر تو کھڑی سوچتی رہی کہ انعم کو کیا ہوسکتا ہے سوائے ہائپر ہونے کے...... وہ اپنی سوچ جھٹکتی دوبارہ سے اپنی ڈش کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆......☆

انعم کو تڑپتے دیکھ کر ثمن اس کی کیفیت پر گھبرا گئی۔ ابھی اس کی ڈلیوری میں دو مہینے باقی تھے۔ اروی...... اروی تم حنیف چچا سے کہو گاڑی اسٹارٹ رکھیں۔ انعم کو فوراً ہاسپٹل لے جانا پڑے گا۔ اور...... اور شادو شمو کو بھی بھیجو۔ جلدی کرو......'' ثمن نے انعم کو جھک کر اپنی باہوں میں سمیٹا۔ اروی فوراً باہر لپک گئی۔

پل بھر میں گھر میں انعم کی طبیعت کی وجہ سے پریشانی پھیل گئی۔ بی بی جان بھی کمرے سے نکل آئی تھیں۔ ثمن انعم کو شادو اور شمو کی مدد سے پورچ میں کھڑی گاڑی تک لے آئی تھی۔ بی بی جان بھی گھبرا گئی تھیں۔ ثمن نے بمشکل انہیں ساتھ چلنے سے روکا۔ ''بی بی جان...... ابھی ہمیں جانے دیں آپ بعد میں آجایئے گا'' بی بی جان نے نفی میں سر ہلایا ''نہ...... نہیں...... نہیں اصم کو اروی کی ضرورت ہوگی۔ میں چل رہی ہوں بس'' بی بی جان

زبردستی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ بحث مباحثے کا وقت نہیں تھا سو وہ فوراً ہاسپٹل کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆......☆

شہرینہ جتنی دیر فائق کے انتظار میں کھڑی رہی۔ سبرینہ کو خوش خبری سنانے کی کوشش کرتی رہی لیکن سبرینہ اس کی کال ہی نہیں ریسیو کر رہی تھی۔ آخر فائق اسے لینے آ گیا تھا۔ سرخ پھولوں کے گلدستے کو فائق کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے شہرینہ کی آنکھوں میں نمی سی بھر آئی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑا دلآویز احساس تھا۔

''کہو......اب تو تمہیں یقین آ گیا ہے کہ میں نے تمہیں جو بھی کہا پورے ہوش و حواس میں کہا ہے۔''
فائق نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے بہت خوبصورت اور محبت بھرے لہجے میں استفسار کیا تو وہ سر ہلا کر آنکھوں کی نمی چھلکاتی مسکرانے لگی۔

''فا......ئے ق......تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تم نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی ہے۔ اس دن کی خواہش تو مجھے تب سے تھی جب تم انعم کی محبت میں گرفتار بھی نہیں ہوئے تھے اور...... اس کی آواز خوشی سے کپکپا رہی تھی۔
فائق نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سے ہٹا کر اس کا ہاتھ تھام لیا ''بھول جاؤ کہ کبھی میں نے کسی ''اور'' سے محبت کی تھی۔'' فائق نے اسے یقین بخشنے کی کوشش کی۔

''تم بھول جاؤ گے تو مجھے بھی یاد نہیں رہے گا فائق۔'' ''میں بھول گیا ہوں تبھی تو تمہاری طرف بڑھا ہوں شہرینہ کے خوف کو فائق نے بڑی خوبصورتی سے زائل کیا تھا وہ اسے وہاں سے سیدھا ایک بڑی جیولری شاپ میں لے آیا تھا۔ شہرینہ کو سبھی کچھ خواب لگ رہا تھا۔ فائق نے اس کے لیے اسی کی پسند کی منگنی کی انگوٹھی خریدی تھی۔ اور پھر ہوٹل کی لابی میں ہی بیٹھ کر وہ انگوٹھی اسے پہنا دی تھی شہرینہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ خود کو آسمان پر اڑتا محسوس کر رہی تھی اس کی محبت آج خود اس کے سامنے سرنگوں ہوئی تھی اسے اور کیا چاہیے تھا۔

☆......☆

گائنا کالوجسٹ انعم کی حالت دیکھ تشویش میں تھی اس کا کیس تو نارمل تھا لیکن اچانک صورت حال بدل گئی تھی۔ الٹرساؤنڈ رپورٹ کے تحت بچی کو جلد از جلد آپریشن کے ذریعے پیدا کرنا ضروری تھا۔ ڈاکٹر نے انہیں پہلے نہیں بتایا تھا کہ انعم بیٹی کی افزائش کر رہی ہے۔ بی بی جان اور ثمن ڈاکٹر کے کمرے میں ہی بیٹھی تھیں جب ڈاکٹر نے آ کر انعم کے شوہر کے بارے میں سوال اٹھایا۔

''مسز زبدہ خان۔ آپ انعم کے ہزبینڈ کو فوراً بلائیں۔ انعم کا آپریشن ہونا بہت ضروری ہے ورنہ بچی اور ماں دونوں کو خطرہ ہے۔ وہ ساتھ کیوں نہیں آئے۔'' ڈاکٹر رافیہ نے عجلت میں کہا۔ بی بی جان کے چہرے پر پریشانی بڑھ گئی۔ فائق کیسے آتا۔ اسی نے تو آج یہ ستم ڈھایا تھا جو اس کی بیٹی موت و زندگی کی کشمکش میں تھی۔

''ڈاکٹر رافیہ وہ نہیں آ سکتا ...میرا مطلب ہے وہ ملک سے باہر ہے۔ انعم میری بیٹی ہے۔ لائیے میں پیپرز سائن کرتی ہوں۔'' بی بی جان نے اس وقت بڑے حوصلے سے کام لیا تھا۔ ثمن کہتے کہتے چپ ہو گئی تھی۔ ''بی بی جان نے ایسا کیوں کہا فائق تو اسی شہر میں ہے۔'' یہ سوال حیرت بنا اس کے چہرے پر بھی تھا۔ بی بی جان نے اس سے نظریں چرا کر جلدی سے کاغذات پر دستخط کیے'' دعا کیجیے ہم دونوں کی جانُ بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔'' کمرے سے نکلتے ہی ڈاکٹر رافیہ نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی ثمن نے بی بی جان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں دلاسہ دیا'' بی بی جان آپ فکر نہ کریں انشاء اللہ دونوں ٹھیک ہوں گی۔ آپ کہیں تو میں فائق کو کال کر کے بلا لوں۔ وہ آ جائے گا۔''

''اس نے آنا ہوتا تو آج انعم کی یہ حالت نہ ہوتی۔ وہی اس کا ذمہ دار ہے۔ آج......اگر وہ اپنی دوسری شادی کی اطلاع نہ دیتا تو......انعم خطرے میں نہ پڑتی......'' بی بی جان بیٹی کے دکھ سے رو پڑیں۔ ثمن کو مزید حیرت ہوئی۔

''کیا......فائق دوسری شادی......؟ وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ انعم نے ایسا کر دیا ہے جو وہ اس انتہا پر پہنچ گیا ہے''

''پتہ نہیں......انعم کا کیا جرم ہے۔ میری بیٹی کا نصیب بگڑ گیا ہے۔
فائق کی محبت نفرت میں بدل گئی ہے۔ کیا ہو گا میری بچیوں کا''

''بی بی جان روئیں نہیں۔ بابا جان' ضیغم بات کریں گے فائق سے۔ اتنی آسانی سے وہ دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ اپنی بیٹی سے وہ کیسے منہ موڑ سکتا۔ آپ اللہ سے دعا کریں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' بی بی جان ہولے ہولے سسکتی رہیں۔ ثمن دلاسے دیتی رہی۔ انہیں انعم کے لیے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ جانے آگے کیا ہونے والا تھا۔ ان کا دل ڈر رہا تھا۔

اروئی نے اصم کو جا کر انعم کی طبیعت بگڑ جانے اور اسپتال لے جانے کا بتایا تو وہ بھی پریشان ہو کر نیچے لاؤنج میں آ بیٹھا۔

''انعم کی حالت اس قدر خراب تھی کہ ہاسپٹل لے جانا پڑا......اور مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں'' سبرینہ اپنے کمرے سے نکل کر آ کر ان کے درمیان بیٹھی تو شکوہ کیے بنا نہ رہ سکی۔ ''ربینا بھابھی......اتنا ہوش کسے ہو گا...... وہ تو شکر ہے انعم بروقت ہاسپٹل پہنچ گئی۔ ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔'' اصم نے اس کے شکوے کا جواب سنجیدگی سے دیا تو وہ دل ہی دل میں تلملائی مگر ظاہری بناوٹ سے بولی'' صحیح کہہ رہے ہو......اس وقت کسے ہوش ہو گا ثمن بھابی کا فون آیا......کوئی خیر خبر دی انہوں نے۔''

''جی بھابھی......میں نے بات کی تھی۔ انعم کا میجر آپریشن کرنا پڑ رہا ہے۔ بی بی جان کہہ رہی تھیں سب دعا کریں۔''

اروئی نے ہچکچا کر بتایا۔ ''کیا......؟ میجر آپریشن؟ ابھی تو بہت ٹائم تھا اور......انعم بھی......'' سبرینہ کو بھی سن کر دھچکا لگا۔ آج دوپہر تک تو وہ بالکل نارمل نظر آ رہی تھی'' ے......میں ثمن بھابی سے تفصیل سے پتہ کرتی ہوں۔'' سبرینہ اٹھی اور وہاں سے دوبارہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

سبرینہ نے اپنے کمرے میں آ کر اپنا موبائل چارجنگ سے اتار کر دیکھا تو شہرینہ کی مس کال آئی ہوئی تھیں۔

''نہ جانے شہری کیوں کال کر رہی تھی؟ اسے کیا کام ہو گا؟ ابھی پہلے ثمن بھابی کو تو کال کر لوں۔ پھر پوچھتی ہوں شہری سے۔'' خود کلامی کرتے ہوئے سبرینہ نے ثمن کو فون کیا۔ ثمن نے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو وقتی طور پر وہ بھی پریشان ہو گئی۔ انعم کی حالت خطرے میں تھی یہ بات قابل تشویش تو تھی ''ثمن بھابی میں بھی آ جاؤں۔''

''نہیں بی بی جان کہہ رہی ہیں ابھی تم گھر پر ہی رکو۔ شارم اور ضیغم کو ہم نے بلا لیا ہے۔ انعم کے لیے بلڈ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' ثمن نے سبرینہ کو آنے سے روکا تو وہ دل میں جھنجلائی ثمن بھابی کو تو سب کی نظر میں

رہنے کا موقع چاہیے۔ وہ مجھے کہاں برداشت کریں گی۔ یہ سوچ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور شہرینہ کو کال کرنے لگی۔ لیکن اب وہ اس کی کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ آخر تھک کر وہ کمرے سے نکل آئی۔ کچھ بھی تھا۔ ابھی گھر اس کی ذمہ داری تھا۔

☆......☆

نیلم شام سے پہلے گھر واپس آئی تھی۔ اسے عامر ہی گھر سے کچھ فاصلے پر اتار کر گیا تھا اس نے ڈرتے ڈرتے گھر میں قدم رکھا۔ گھر میں عجیب سی خاموشی کا راج تھا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف دبے پاؤں بڑھ رہی تھی تبھی سبرینہ بھی اپنے کمرے سے برآمد ہوئی ''تم اب آئی ہو کالج سے'' سبرینہ نے مشکوک انداز میں دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں......وہ......میں فضہ کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی تھی'' وہ گڑبڑا کر بولی تو سبرینہ نے مزید تفتیشی انداز میں کہا'' فضہ کے گھر ایسا کیا ہے جو تم روز روز وہاں جانے لگی ہو۔'' سبرینہ نے بغور اسے سر سے پیر تک دیکھا بھی۔

''آپ کے کہنے کا مطلب کیا ہے بھابھی......میں بی بی جان کی اجازت سے وہاں جاتی ہوں۔'' نیلم کا لہجہ خود بخود تیز ہو گیا۔

''میں نے کوئی اتنی مشکل بات بھی نہیں کہی جس کا مطلب سمجھ میں نہ آئے۔ تم بہنوں کی وجہ سے بی بی جان کتنی پریشان ہیں۔ سارے بھائی انعم کی وجہ سے مشکل میں ہیں اور اب تم وقت بے وقت گھر سے غائب رہنے لگی ہو۔ سب خاموش ہیں تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ تم آزاد ہو گئیں۔'' سبرینہ نے خوب اچھی طرح جتایا تھا۔ نیلم کی حرکات و سکنات گویا اس کی نظر میں بھی تھیں۔ نیلم نظریں چرا گئی'' آپ پتہ نہیں کیا کہہ رہی ہیں۔ میری وجہ سے کوئی کیوں پریشان ہے۔ میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ چڑ کر بولی اور مزید کچھ سنے بغیر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ دروازے کو آواز کے ساتھ بند کر کے اس نے اپنا غصہ ظاہر کیا تھا۔ سبرینہ کا مزاج بھی بگڑ گیا تھا۔ نیلم اس کے ساتھ کبھی اس طرح نہیں بولی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نیلم کو اس نے سمجھانے کی کوشش کی ہے جو کہ اس کا فرض تھا۔ اسے نیلم پر آج کل شک ہونے لگا تھا۔

☆......☆

اروی مغرب کی نماز پڑھ کر اصم کے لیے چائے بنانے کچن میں آئی تھی تبھی نیلم بھی وہاں چلی آئی۔

''اروی بھابی......بی بی جان کہاں ہیں۔ گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے؟'' وہ سبرینہ کی شکایت لگانے بی بی جان کے کمرے میں گئی تھی۔ انہیں وہاں نہ پا کر اسے تشویش ہو رہی تھی۔

''وہ اور ثمن بھابھی انعم کے ساتھ ہاسپٹل گئی ہیں'' اروی نے ابلتے پانی میں چائے کی پتی ڈالتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''ہاسپٹل......؟ کیا ہوا ہے انہیں......؟'' اس کی فکر دیدنی تھی۔ اسے اب سبرینہ کا رویہ بھی سمجھ آیا

''انعم کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دعا کرو وہ خیریت سے فارغ ہو جائے۔'' اروی نے بات کرتے کرتے کیبن سے چائے کے مگ اور ٹرے وغیرہ نکال کر سلیب پر رکھے۔

''انعم اتنی جلدی ہاسپٹل... میرا مطلب ہے ابھی تو......''

''ہاں......ابھی تو ٹائم تھا ڈلیوری میں مگر جو اللہ کی رضا اور حکمت......تم چائے پیو گی؟'' اروی نے مختصر کہہ کر پوچھا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ بہن کے لیے اس کی پریشانی فطری تھی۔

اروی نے ایک نظر اسے دیکھ کر تسلی دی۔

''فکر نہیں کرو......ہماری دعاؤں سے انعم اور اس کی بے بی خیریت سے ہوں گے۔ انشاء اللہ۔'' نیلم بس سر ہلا کر رہ گئی۔ دل میں کچھ نادم بھی ہو رہی تھی۔ آج سارا دن عامر کے ساتھ بہت خوشگوار گزرا تھا اور اس کے گھر میں اتنی بڑی پریشانی آ گئی تھی۔ ''اچھا میرا ایک کام کر دو شمو پتہ نہیں کہاں ہے تم سبرینہ بھابھی کو چائے دے آؤ۔'' اروی نے سب کے لیے الگ الگ ٹرے میں چائے کے مگ کے ساتھ بسکٹ اور سینڈوچ بھی رکھ دیئے کسی نے بھی دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس نے ہاسپٹل لے جانے کے لیے بھی چائے کا تھرماس تیار کر لیا تھا وہ حنیف چچا کے ہاتھ بھجوانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ''سوری بھابھی......میں نہیں جاؤں گی۔ ان کا آج میرے ساتھ بہت برا رویہ تھا۔'' وہ بچوں کی طرح ٹھنک کر بولی۔

''کیوں کیا ہوا؟'' اروی نے چونک کر پوچھا تو وہ مزید ناراضگی سے بتانے لگی'' مجھ سے عجیب طرح بات کر رہی تھیں۔'' میرے دیر سے آنے پر اتنا لمبا لیکچر دیا ہے انہوں نے۔ کیا آپ نے انہیں بھی میرے بارے میں بتا دیا ہے'' اس نے اروی کو بدگمانی سے دیکھا

''میں......میں نے تو بی بی جان کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ اصم کو نہیں بتایا تو انہیں کیوں بتاؤں گی'' اروی کو دھچکہ لگا تھا۔

''پھر......؟'' یہ سوال تھا یا الجھن واضح نہ ہو سکا۔

''پھر یہ کہ جب انسان کو اپنی خبر نہیں رہتی تو دنیا کو اس کی خبر ہونے لگتی ہے تمہیں کسی کی بات کا برا منانے سے پہلے اپنے عمل پر غور کرنا چاہیے۔ میں چائے دے کر آتی ہوں تم اپنے لیے چائے لے لو۔'' اروی سبرینہ کو چائے دینے چلی گئی۔ نیلم کھڑی سوچ میں گم رہ گئی

☆......☆

شارم اور ضیغم آپریشن تھیٹر کے باہر بے چینی سے ٹہل رہے تھے انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ فائق کی وجہ سے انعم کی کیفیت بگڑ گئی ہے شارم بھی بمشکل غصے پر قابو پا رہا تھا۔

''بی بی جان آخر آپ کیوں منع کر رہی ہیں۔ میں ابھی جا کر اس سے بات کرتا ہوں۔ وہ انعم کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر سکتا۔'' شارم زچ ہو کر بے بسی سے ان کے قریب بیٹھ کر بولا ''موقع کی نزاکت کو سمجھو بیٹا۔ مناسب وقت پر بات بھی کر لیں گے ابھی بہن اور اس کی بچی کی زندگی کے لیے دعا کرو۔'' بی بی جان نے بڑے ضبط سے کام لے رکھا تھا۔

بیٹے کو رسانیت سے سمجھاتے ہوئے انہوں نے ضیغم کو بھی اشارہ کیا وہ بھی ان کے بائیں طرف بیٹھ کر بولا'' بی بی جان ٹھیک کہہ رہی ہیں انعم کی صحت یابی کے بعد اس سے پوچھ لیں گے کہ اس کے کیا ارادے ہیں؟ جواب میں ثمن کچھ کہنا چاہتی تھی اسی لمحے نرس نے آ کر انہیں خوشخبری دی آپریشن کامیاب ہو گیا تھا البتہ بچی کی قبل از وقت پیدائش کی وجہ سے اسے انتہائی نگہداشت میں رکھ دیا گیا تھا جبکہ انعم بھی آئندہ چوبیس گھنٹے تک بے ہوش رہنے کا امکان تھا۔ بی بی جان تو اسی بات پر شکرانہ بجا لائی تھیں کہ ان کی بیٹی موت کی دہلیز سے پلٹ آئی تھی اور اس کی بچی بھی۔ وہ لوگ اسی بات پر خوش تھے۔ ثمن نے فوراً گھر اطلاع دے دی تھی۔ بی بی جان نے صالحہ

بیگم کو بھی اطلاع دینے کی ہدایت کی۔ ثمن فون لے کر احتیاط سے کمرے سے نکل آئی مبادا ایسی کوئی بات ہو جائے تو مصلحتاً شارم اور ضیغم کے کان میں نہ پڑے۔ سبرینہ، اروی، اصم اور نیلم حنیف چاچا کے ساتھ ہاسپٹل آ گئے تھے۔ بابا جان بھی آفس سے سیدھے چلے آئے تھے سبھی بے حد خوش تھے۔

☆......☆

صالحہ عشا کی نماز پڑھ کر ابھی اٹھی ہی تھیں کہ ان کا موبائل بجنے لگا۔ جاء نماز تہہ کر کے رکھتے ہوئے انہوں نے اپنا موبائل اٹھا کر دیکھا کال ریسیو ہونے سے پہلے رابطہ منقطع ہو گیا۔ اسی لمحے رنگ ٹون پھر بجنے لگی ''السلام علیکم آنٹی...... میں ثمن بات کر رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے فوراً تعارف کرایا گیا تو صالحہ کے ماتھے پر فکر کی لکیر نمودار ہوئی ''وعلیکم سلام...... جی بیٹا...... خیریت؟'' ثمن کا رابطہ کرنا انہیں کسی خطرے کی گھنٹی محسوس ہوا تھا ''خیریت ہی ہے اب تو کچھ دیر پہلے تک ہم سبھی کے سر پر کوئی ان دیکھی تلوار لٹک رہی تھی۔''

''ثمن کیا بات ہے...... صاف صاف کہو۔'' وہ متوحش ہوئیں۔

''صالحہ آنٹی...... فائق سے کافی دیر سے رابطہ کر رہے ہیں لیکن اس نے ہماری کال ریسیو نہیں کی۔''

''فائق کے کسی فعل کے اب ہم ذمے دار نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ جو بھی طے کرنا ہے وہ آپ لوگ خود طے کر لیں'' صالحہ کا رویہ سرد ہو گیا۔ دوسری طرف کمپاؤنڈ میں کھڑی ثمن کو شدید دھچکا لگا صالحہ کا رویہ اسے سمجھ نہیں آیا تھا۔

''پھر تو آپ کو کوئی اطلاع دینی ہی فضول ہے۔''

''کیسی اطلاع......'' صالحہ یکدم چونک کر پوچھنے لگی۔ اپنے رویے کا انہیں ملال بھی ہوا تھا۔ اسی لمحے بلال درانی بھی کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

''فائق کو بتا دیجیے گا انعم اس کی وجہ سے آج اپنی زندگی ہارتے ہارتے بچی ہے۔'' ثمن قدرے جذباتی ہو کر بولی۔

''میں سمجھی...... نہیں...... انعم کو...... کیا...... ہوا......'' صالحہ کا لہجہ لڑکھڑا کر رہ گیا ''انعم کو تو جو ہونا تھا ہو گیا...... اس کی Premature بچی پیدا ہوئی ہے۔ اگر آپ لوگ اس سے اپنا کوئی تعلق سمجھتے ہیں تو آ جائیے گا۔ اللہ حافظ۔'' ثمن دکھ سے کہہ کر رابطہ منقطع کر چکی تھی۔ صالحہ ہاتھ میں فون لیے کچھ دیر سکتے کی حالت میں کھڑی رہ گئی۔ بلال درانی جو اندر آ کر اپنا کوٹ وغیرہ اتار چکے تھے اپنا موبائل والٹ وغیرہ رکھتے ہوئے تشویش سے پوچھنے لگے ''انعم کو کیا ہوا...... کس کا فون تھا؟''

''آں...... ہاں۔'' صالحہ بیگم چونک کر متوجہ ہوئیں پھر گہری سانس لے کر بستر پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ''ثمن کا...... انعم کی بھابھی نے خبر دی ہے ہماری پوتی دنیا میں آئی ہے لیکن......'' وہ بولتے بولتے رک گئیں۔

''لیکن؟...... لیکن کیا؟'' بلال درانی کے چہرے پر الجھن و پریشانی نمایاں تھی۔ ''انعم اور بے بی کی کنڈیشن شاید ٹھیک نہیں ہے وہ بڑی مجبور ہے اور فائق نے......'' صالحہ فائق کا نام لیتے ہوئے ہچکچا گئیں۔

''اللہ خیر کرے گا تم تیار رہو۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔ ہم ابھی چلتے ہیں۔'' بلال درانی نے تحمل سے کہہ کر قدم واش روم کی طرف بڑھا دیے۔ صالحہ کشمکش میں تھیں کہ وہ کس منہ سے جائیں۔

☆......☆

شہرینہ کو فائق ڈنر کے بعد اس کے گھر ڈراپ کرنے آیا تھا ''آج کی شام میری زندگی کی یادگار شام بن گئی ہے فائق...... اور یہ رات میرے خوابوں کی تعبیر بن کر میری آنکھوں میں نئے خواب سجانے کی اجازت لے کر آئی ہے۔ پلیز...... فائق میرے خواب سجے رہنے دینا۔'' گاڑی سے اترنے سے پہلے شہرینہ نے بہت دلآویز لہجے میں بولتے ہوئے فائق کا ہاتھ تھام لیا۔ اقرار وفا تو ہو چکا تھا تجدید اقرار شہرینہ نے کر دی تھی فائق کے لب بے ساختہ مسکرا دیے۔

''Dont Worry ہمارے خواب ہم مل کر سجائیں گے۔'' وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا اسی لمحے صالحہ کی کال اس کے موبائل پر آنے لگی۔ شہرینہ اس کی بات مکمل ہونے کے انتظار میں اسی کی جانب متوجہ تھی ''ماما کی کال......؟'' فائق کو کچھ حیرت بھی ہوئی۔ مسلسل بجتی گھنٹی پر فائق نے کشمکش کے ساتھ کال ریسیو کی ''ماما......''

''کہاں ہو تم......؟'' صالحہ نے شوہر کے کہنے پر اسپتال کی طرف جاتے ہوئے اسے مجبوراً کال کی تھی۔

''وہ...... میں......'' وہ چاہ کر بھی سچ نہیں بتا سکا۔

''تم جہاں بھی ہو وہاں سے ہاسپٹل پہنچو ہم بھی وہیں جا رہے ہیں۔'' صالحہ سمجھ گئی تھیں کہ وہ شہرینہ کے ساتھ ہے۔

''ہاسپٹل......؟ کیوں؟ کیا ہوا؟ پاپا تو ٹھیک ہیں ناں؟'' وہ یکدم فکر مند ہو کر پوچھنے لگا۔

''تمہاری نومولود بچی Intensive care میں ہے فوراً پہنچو۔'' صالحہ نے مزید بات کیے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ یکدم خاموش ہو گیا۔ شہرینہ کو اس کی خاموشی کھل رہی تھی۔ ''فائق...... کون ہے ہاسپٹل میں۔'' شہرینہ کو خود اپنی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''وہ...... انعم...... میرا مطلب ہے۔ بے بی Intensive care میں ہے۔'' فائق نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

''تو کیا تم وہاں جاؤ گے؟'' شہرینہ نے جانچتی نظروں سے دیکھا۔

گاڑی کے اندر کی روشنی بہت ناکافی تھی۔ وہ اس کے جذبات و تاثرات کا اندازہ نہیں لگا پا رہی تھی۔ فائق کو بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا جواب دے۔ ''تمہاری خاموشی کا کیا مطلب ہے فائق؟ تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اب انعم سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے۔'' شہرینہ نے جوش بھرے لہجے میں اسے وعدہ یاد دلایا تو وہ جیسے موم کی طرح پگھلتے دل کے جذبے کو اپنی نئی نویلی محبت کی ٹھنڈک سے ٹھہراتے ہوئے بولا۔

''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ انعم سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے Trust me'' فائق نے اس کا ہاتھ تھام کر بھرپور یقین دلانے کی کوشش کی۔ شہرینہ اسے جانے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے زبردستی اسے اندر آنے پر مجبور کر دیا۔

☆......☆

''کیا کہا صاحبزادے نے...... کہاں ہے وہ؟ کتنی دیر میں پہنچے گا؟'' بلال درانی نے ڈرائیور کی موجودگی میں پچھلی سیٹ پر اپنے ہمراہ بیٹھی صالحہ کو فون بند کر کے پہلو میں رکھتے دیکھ کر پوچھا انداز و لہجہ دھیما تھا۔

''یہ تو نہیں پتہ وہ کہاں ہے۔ میں نے بتا دیا ہے کہ پہنچ جائے گا وہ ہاسپٹل۔'' صالحہ نے اپنے طور پر تسلی دی۔

''ہوں...... اسے تو ہم سے پہلے ہاسپٹل ہونا چاہیے تھا۔ پتہ نہیں کن ہواؤں میں ہے آج کل۔ دوپہر سے آفس سے بھی غائب ہے۔'' بلال درانی نے ٹھنڈی سانس لے کر شکوہ بھی کیا۔

''اچھا......!!'' وہ اپنی حیرت وخیالات برملا ظاہر نہ کرسکیں۔

بلال درانی اور صالحہ کی آمد نے بی بی جان کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔ کچھ دیر پہلے دل میں اٹھتے وسوسے دم توڑ گئے تھے۔ فائق کے ماں باپ آگئے تھے تو وہ بھی آجائے گا۔ یہ آس، یہ امید پھر سے جاگ گئی تھی۔ وہ آبدیدگی سے بلال درانی اور صالحہ کا شکریہ ادا کررہی تھیں۔

''شکریہ صالحہ بھابی...... آپ لوگ آئے ہماری بیٹی اور اپ کی بیٹی کو آپ لوگوں کی شفقت کی ضرورت ہے۔''

''ہم اپنی کوتاہی پر شرمندہ ہیں زبدہ بھابی...... ہمیں اس سے پہلے آجانا چاہیے تھا۔'' بلال درانی نے صالحہ کے بجائے کہا تو وہ دونوں انہیں دیکھ کر رہ گئیں انعم بے ہوش تھی اور باقی افرادخانہ ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

''بھائی شرمندگی کیسی۔ ہم بھی حالات کے آگے بے بس ہیں ہمارے بچے اب یقیناً اپنے بچپنے سے نکل آئیں گے۔''

''فائق نے میرا فون ریسیو نہیں کیا۔ اسے کہیے گا ہمارے لیے نہ سہی اپنی بیٹی کو تو دیکھنے آجائے۔'' زبدہ نے رسانیت سے کہا۔ صالحہ قدرے شرمندہ سی ہوگئیں'' زبدہ بھا...... بھی...... وہ آئے گا...... آئے گا کیوں نہیں بلکہ وہ آتا ہی ہوگا۔''

''بالکل اب تو آنا ہی پڑے گا۔ اللہ نے اس کے گھر رحمت بھیجی ہے۔ اللہ کی رحمت سے منہ تو نہیں موڑ سکتا۔''

شریح خان بھی کمرے میں چلے آئے تھے۔ انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ بھی مسکرادیے معصوم گڑیا سی پوتی کو انکیوبیٹر میں دیکھ کر صالحہ کا دل نہ صرف پسیج گیا بلکہ وہ آبدیدہ بھی ہوگئیں۔ چند گھنٹوں کی بچی مصنوعی تنفس اور ماحول میں بے بس پڑی تھی۔ انہیں یکدم فائق کا خیال آگیا۔

اس کے ارادے اور فیصلے اس بچی کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہونے والے تھے وہ سوچ کر ہی گھبرا گئیں اور پھر فوراً سب سے معذرت کرکے لوٹ آئیں۔

☆......☆

''مجھے فائق سے یہ امید نہیں تھی۔ بچی کا سن کر بھی وہ نہیں آیا۔'' بی بی جان کب سے لب سیے ہوئے تھیں گھر آکر اپنے کمرے میں آتے ہی انہوں نے شوہر کے سامنے اظہار خیال کیا۔

''آجائے گا...... آجائے گا...... جوان خون ہے ذرا ٹھنڈا ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا۔'' شریح خان نے دفاعی انداز میں کہا۔

''ایسا بھی کیا غصہ کہ اپنی اولاد کے لیے بھی تڑپ پیدا نہیں ہوئی۔'' بی بی جان کا شکوہ اور ناراضگی اپنی جگہ برقرار تھی۔

''میری شریک حیات غصے کو اسی لیے تو ہمارے مذہب میں حرام کہا گیا ہے کہ اس میں نہ اپنا بھلا نظر آتا ہے اور نہ دوسرے کا۔'' شریح خان نے ان کے ذہن کو اس طرف ہٹانے کی کوشش کی۔ بہرحال میرا مشورہ ہے آپ خود اس سے جاکر مل لیں وہ انعم کو دوسری شادی کی دھمکی دے چکا ہے اسے سمجھائیں کہ اس کے عمل سے اس کی بیٹی کی زندگی بھی متاثر ہوگی۔ زبدہ نے دل کی بات بالآخر کہہ دی وہ اب تک بے خبر تھے۔

''اچھا!!'' انہیں حیرت ہوئی'' وہ اس حد تک سوچ رہا ہے!'' ان کی آواز خود بخود مدہم ہوگئی۔ ان کے چہرے پر بھی پریشانی سمٹ آئی تھی۔ زبدکو ان کی پریشانی بھلی نہ لگی'' انشاء اللہ بیٹی کا سن کر وہ اپنی سوچ بدلنے پر مجبور ہوجائے گا۔''

''آمین...... اللہ ہمارے بچوں کے حق میں جو بھی ہو بہتر ہو اگر وہ آجائے تو انعم کو سمجھایئے گا کہ پرانی باتیں نہ دہرائے۔ مرد کی انا کو بار بار ٹھیس لگے گی تو پھر وہ کسی رشتے کا لحاظ نہیں رکھتا۔'' شریح خان کا تفکر چہرے سے عیاں تھا۔ زبدہ کیا کہتیں۔ وہ خود بھی آگاہ تھیں۔

لیکن بیٹی کو سمجھانے کے معاملے میں وہ بھی بے بس تھیں۔

☆......☆

''اصم اب سو جائیں۔ صبح آپ کا پلاسٹر اترنے والا ہے ہمیں وقت پر ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔'' رات کے دو بج رہے تھے۔ اصم کوشش کے باوجود سو نہیں پارہا تھا۔

''کیسے سوؤں۔ نہیں آرہی مجھے نیند...... تم نے دیکھا ہے نا...... سب کس قدر پریشان تھے۔ انعم اس کی بچی۔ کس قدر اذیت میں ہیں وہ دونوں۔ اور وہ شخص آیا تک نہیں۔'' وہ اروی پر جھنجلایا۔

''انعم اور بچی انشاء اللہ جلد ٹھیک ہوجائیں گے۔ آپ فکر نہیں کریں اور فائق بھائی نہیں آئے تو شاید کہیں پھنس گئے ہوں اب تک آگئے ہوں گے۔ آخر وہ کیسے رہ سکتے ہیں۔'' اروی نے اپنے طور پر اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔

شام سے وہ اپنی بہن کے لیے جل کڑھ رہا تھا۔ فائق پر اسے رہ رہ کر غصہ آرہا تھا'' ہاں...... شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو فائق انعم سے لاکھ ناراض سہی اپنی بیٹی سے تو دور نہیں رہ سکتا۔ آگیا ہوگا'' اصم بہت دیر بعد اس بات پر متفق ہوا تھا ورنہ وہ اروی سے بات بات پر الجھ رہا تھا۔ اروی نے شکر ادا کیا کہ وہ سمجھ گیا تھا۔

☆......☆

اذان فجر کے ساتھ فائق کی گھر آمد ہوئی تھی۔ صالحہ نے رات اس کے انتظار میں سوتی جاگتی کیفیت کی بےچینی میں گزاری تھی۔ انہوں نے کئی بار رابطے کی کوشش کی تھی مگر اس کا نمبر بند جارہا تھا۔ وہ جانتی تھیں اس نے دانستہ ایسا کیا ہے۔ وہ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی خود بھی اس کے پیچھے چلی آئیں۔ ''کہاں سے آرہے ہو اس وقت؟'' فائق یکدم چونک کر پلٹا۔ اسے ان کی آمد کی توقع نہیں تھی۔ ''ماما...... آپ جاگ رہی ہیں؟''

''ظاہر ہے مجھے نیند کیسے آسکتی ہے جب تم گھر سے باہر ہو۔ تمہارا سیل کیوں آف تھا۔ کیا ہاسپٹل گئے تھے؟'' صالحہ نے جان بوجھ کر اسے کریدا۔ وہ نظریں چرا گیا۔

''نہیں...... میں آپ کو بتا چکا ہوں میں اب انعم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔'' نیند سے بوجھل آنکھوں میں انعم کے لیے تنفر پل بھر میں واضح ہوگیا۔

''اور اپنی بیٹی سے؟ اس سے کیسے تعلق توڑ سکتے ہو۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی فائق۔ تم اپنی معصوم بچی کو نہیں دیکھنے گئے۔ تمہیں ذرا احساس نہیں کہ وہ دنیا میں آکر بھی ابھی دنیا کا حصہ نہیں بن سکی۔'' صالحہ نے انتہائی

دوشیزہ 231

دکھ اور ملال کے ساتھ بیٹے کو احساس دلانے کی کوشش کی وہ ان کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے ان کے سامنے سے ہٹ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ صالحہ بھی اس کے سامنے صوفے پر ٹک سی گئی۔ ''ماما اس کی کنڈیشن کا میں ذمے دار نہیں ہوں۔''

''تم نہیں ہو تو کون ہے؟ تم نے اسے اپنی دوسری شادی کی دھمکی دی تھی اس کے بعد پری میچیور ڈلیوری کا الزام تمہارے سر ہی لگتا ہے فائق۔'' صالحہ نے بیٹے کو کڑے تیوروں سے دیکھا ''آپ کا مطلب ہے میں ان کے مطالبے مان لیتا۔ ہرگز نہیں۔ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا میں آپ لوگوں سے الگ نہیں ہوں گا۔'' وہ جذباتی ہو کر بولا۔

''الگ تو تمہیں ہونا ہی پڑے گا کیونکہ جس سمت میں تم جارہے ہو فائق وہاں ہم تمہارے ساتھ نہیں ہوں گے۔'' صالحہ فیصلہ سناتیں فائق کو حیران کر کے کمرے سے نکلنے لگیں۔ پھر دروازے میں ٹھہر کر بغیر پلٹے مزید بولیں ''اور ایک بات اب اپنے ہر جذباتی فیصلے کے تم خود ذمہ دار ہو گے۔'' صالحہ بیگم اپنی کہہ کر نکل گئیں۔ وہ گم صم سا بیٹھا اپنی ماما کی باتوں کے معنی اور مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ ایسا کم فہم تو نہیں تھا جو ان کی واضح باتیں بھی سمجھ نہ پاتا۔

☆......☆

اروی بی بی جان اور بابا جان کے لیے چائے لے کر آئی تو وہ کچھ مضمحل تھیں۔ اروی ان کی دلجوئی کرنے لگی۔ ''بی بی جان...... انعم ٹھیک ہو جائیں گی...... آپ پریشان کیوں ہیں۔ ہم سب انعم اور بے بی کا خیال رکھیں گے۔ وہ جلد از جلد نارمل ہو جائیں گی آپ بالکل فکر نہیں کریں۔''

''انشاء اللہ بیٹا میں بھی رات سے یہی سمجھا رہا ہوں کہ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔'' بابا جان نے بھی باہر سے اندر آتے ہوئے مداخلت کی۔ بی بی جان آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھے گئیں ''مجھے اللہ کی مصلحتوں کا یقین ہے مگر فائق کے نہ آنے کا دکھ تو ہے نا۔ وہ اس قدر بیگانہ ہو گیا ہے کہ اس نے ایک فون کر کے بھی نہیں پوچھا۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ سے دعا کرو۔'' بابا جان نے نرمی سے تسلی دی اروی نے باری باری دونوں کو دیکھا وہ دونوں کی اندرونی کیفیت سمجھ سکتی تھی ایک بیٹی کے لیے والدین کتنے فکرمند ہوتے ہیں اس کا اسے اندازہ تھا وہ ان کا دھیان بٹانے لگی۔ بی بی جان آج اصم کا پلاسٹر کھلنا ہے۔ میں کہنے آئی تھی کہ ہم اس کے بعد انعم کے پاس ہاسپٹل چلے جائیں گے۔'' بی بی جان کو بھی یکدم یاد آ گیا۔ انعم کی پریشانی میں وہ بالکل بھول گئی تھیں۔

''ہاں...... ہاں پہلے تم اصم کے ساتھ ہی جانا۔ کوئی بات نہیں۔ میں سبرینہ سے کہتی ہوں وہ ناشتے کے بعد ہاسپٹل چلی جائے تاکہ ثمن گھر آ کر آرام کر سکے۔ کل سے وہ ہاسپٹل میں ہے۔'' بی بی جان کو یکدم اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ ''جی ٹھیک ہے میں ناشتے کی تیاری کرتی ہوں۔'' وہ چائے کے برتن سمیٹ کر کچن میں چلی آئی۔ بی بی جان بھی تسبیح مکمل کرنے کے بعد سبرینہ کو نئے پروگرام کے حوالے سے بتانے کے لیے اٹھ گئی۔ پہلے یہ طے تھا کہ صبح کو اروی جائے گی۔

سبرینہ کو کل سے کچھ بے چینی نے گھیرے رکھا تھا۔ صالحہ اور بلال درانی کو دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی تھی اور یہ اندیشہ بھی لاحق تھا کہ فائق بھی کھنچا آیا ہوگا۔ وہ تو رات ثمن وہاں ٹھہر گئی تھی ورنہ تجسس اسے وہاں رکنے پر مجبور کر رہا تھا۔ شہرینہ کی کال ریسیو نہ کرنے کا اسے قلق تھا۔ گھر آ کر وہ مسلسل شہرینہ سے رابطے کی کوشش کرتی رہی تھی مگر اس کا فون بھی بند جا رہا تھا۔ شارم نماز فجر کے بعد ایکسرسائز کے لیے گھر کے اندر موجود جم میں تھا۔ تبھی اسے موقع مل گیا تھا کہ آسانی سے شہرینہ سے بات کر سکے۔ کئی بار کوشش کے بعد شہرینہ نے کال ریسیو کی اس دوران سبرینہ مسلسل جھنجلاہٹ کا شکار رہی۔

''کہاں ہو تم؟'' رات سے تمہارا موبائل بند ہے۔ مما نے بھی مجھے نہیں بتایا کہ کیا بات ہے؟'' سبرینہ نے شہری کے ہیلو کے جواب میں چڑ کے جھنجلاہٹ سے کہا تو دوسری طرف سے شہری نیند سے بھاری آواز میں بولی ''افوہ...... فون بند تھا تو کوئی وجہ تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہمیں کوئی ڈسٹرب کرے۔'' سبرینہ کو بہن کے انداز و رویے پر حیرت ہوئی۔

''میں تم لوگوں کو ڈسٹرب کرتی ہوں؟'' وہ ایک دم برانگیختہ ہوئی۔ ''ایک تو تم ہر بات پر ناراض ہو جاتی ہو۔ میں نے بھی کل تمہیں کتنی کالز کی ہیں لیکن تم تو اپنی نند صاحب کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھیں۔'' شہری نے اسے جتایا۔

''تمہیں کس نے بتایا کہ...... انعم......'' سبرینہ حیران رہ گئی۔ ''کیا صالحہ خالہ نے بتایا ہے کہ انعم......''

''نہیں...... فائق نے...... جب صالحہ خالہ نے اسے بتایا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہی تھی۔'' شہرینہ نے اسے جیسے جھٹکا دیا ''کیا...... فائق کے ساتھ...... تم۔''

''ہاں...... میں یہی بتانے کے لیے تو تمہیں فون کر رہی تھی۔''

''کیا واقعی...... فائق تمہارے ساتھ تھا؟'' سبرینہ سن کر بھی بے یقین تھی۔ ''اس کا مطلب ہے وہ ہاسپٹل نہیں گیا!''

''کیسے جاتا...... میں نے اسے جانے ہی نہیں دیا...... اور تمہیں پتہ ہے فائق نے مجھے پرپوز بھی کیا ہے ہم جلد ہی شادی کرنے والے ہیں۔'' شہری کی آواز خوشی سے کھنک رہی تھی۔ ''رینا مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا۔ فائق کل دوپہر سے آج صبح تک میرے ساتھ تھا۔ سچ پوچھو تو مجھے یہ ایک خواب لگ رہا ہے۔ اس نے مجھے وہ سب دینے کا وعدہ کیا ہے جو وہ انعم کے لیے چاہتا تھا۔''

''سنو شہری! اس کے زبانی کلامی وعدوں اور دعووں پر یقین مت کرنا۔ جب تک وہ انعم کو طلاق نہ دے دے۔ تم شادی کے لیے رضامندی مت دینا۔'' سبرینہ نے ساری بات سن کر بہن کو مشورہ دیا۔ اس کے کمرے کے دروازے کی ہتھی پر ہاتھ رکھے بی بی جان کے قدم جیسے جم کر رہ گئے تھے۔ ان کی سماعتوں میں ایسے دلخراش الفاظ اتر رہے تھے اور انہیں پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب سبرینہ کہہ رہی ہے۔

''میں سمجھی نہیں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔'' دوسری طرف سے شہری نے ناسمجھی سے پوچھا ''فائق نے مجھے یقین دلایا ہے کہ......''

''دیکھو انعم کی محبت کو تو ابھی وہ فراموش کر رہا ہے لیکن انعم اور بچی کی وجہ سے وہ کسی سمجھوتے پر مجبور ہو گیا تو پھر کیا کرو گی۔'' سبرینہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اسے آئندہ کی فکر دلائی۔ ''میری بات اچھی طرح سمجھ لو

صالحہ خالہ اور انکل بلال اسے مجبور کر سکتے ہیں مجھے ان کے ارادے کچھ اچھے نہیں لگ رہے۔ آئے تھے کل رات ہاسپٹل۔ ان کی ہمدردیاں جاگ رہی ہیں ایسا نہ ہو تم خواب دیکھتی رہ جاؤ۔'' بی بی جان کا صدمے سے برا حال تھا پلٹ کر جانا مشکل ہو رہا تھا۔ اروئی بھی سبرینہ سے ناشتے کے حوالے سے کچھ پوچھنے آئی تھی بی بی جان کو اس طرح دروازے پر کھڑا دیکھ کر وہ بھی ان کے پیچھے ہی ٹھہر گئی تھی۔ سبرینہ کی آواز واضح طور پر ان کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ اروئی بھی حیران ہو رہی تھی سبرینہ کے اندر اس قدر حسد اور جلن بھری ہوئی تھی اور وہ بھی انعم کے لیے۔ اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس سے پہلے بی بی جان سنبھل نہ پاتیں وہ ان کے شکستہ قدموں کا سہارا بن کر ان کے کمرے تک لے آئی۔

بی بی جان کی نظروں میں کیا کچھ نہیں تھا؟ دکھ، ملال، شکستگی ان کا اعتماد ان کا بھروسہ ان کا مان ایک پل میں کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ ''اروئی ک...... کسی سے...... کچھ مت کہنا کسی سے بھی نہیں...... بس مجھے تنہا چھوڑ دو ......تم جاؤ اپنا کام کرو'' بی بی جان ملتجی تھیں یا حکم دے رہی تھیں اروئی ناسمجھی سے دیکھے گئی۔ ''مگر...... بی بی جان...... آپ کی طبیعت......'' وہ کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

''کچھ نہیں ہوگا مجھے...... اتنی کمزور نہیں ہوں میں۔ کہ کسی کا چہرہ بدلتے ہوئے نہ دیکھ سکوں...... میں کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہوں...... تم جاؤ۔'' بی بی جان کی آواز بلند ہو گئی۔ سبرینہ کمرے سے نکل کر آئی تھی مگر اپنے دل کے چور کی وجہ سے واپس پلٹ گئی۔ اس نے اروئی کو مشکوک نظروں سے دیکھا بھی۔ وہ سر جھکا کر بی بی جان کے کمرے سے نکل رہی تھی۔

☆......☆

ناشتے پر سبھی موجود تھے سوائے بی بی جان کے انہوں نے اروئی سے منع کر دیا تھا کوئی بھی انہیں آ کر تنگ نہ کرے۔ بابا جان کو بھی انہوں نے نہ جانے کیا کہا تھا۔ وہ بھی متفکر تھے۔ ایسا کیا ہوا کہ جو زبدہ اتنی پریشان ہیں انعم کی وجہ سے؟ وہ دل میں یہی سوچ رہے تھے۔ سبرینہ اپنے معمول کے رویے میں بے چینی دکھاتی اروئی سے پوچھ رہی تھی۔ دونوں کچن میں کھڑی تھیں۔

''اروئی...... تم صبح گئی تھیں نا ان کے کمرے میں کیا ہوا؟ انہوں نے تمہیں کچھ کہا ہے۔'' اروئی یکدم حیرت کے ساتھ متوجہ ہوئی ''مجھے...... مجھے انہوں نے کیا کہنا تھا البتہ وہ آپ کو ہاسپٹل جانے کے لیے کہنے گئی تھیں...... آپ ابھی تک گئی نہیں ہاسپٹل؟'' اروئی نے اصم کے لیے ہاف فرائی انڈا پین سے نکالتے ہوئے جواباً کہا اور کچن سے نکل گئی۔ سبرینہ چونک اٹھی ''بی بی جان مجھے کچھ کہنے؟ مگر! اوہ کہیں بی بی جان نے میری اور شہری کی باتیں تو نہیں سن لیں! اف اب کیا ہوگا...... یہ تو غضب ہو گیا۔ یا اللہ اب کیا کروں؟ نہ...... نہیں...... بی بی جان کیسے سن سکتی ہیں! وہ آتیں تو اب تک ایک ہنگامہ اٹھ چکا ہوتا' وہ گہری سوچ میں تھی۔ ثمو نے اسے متوجہ کیا ''بھابی جی! چائے ابل گئی ہے۔''

سبرینہ اپنے خیالات سے باہر آئی تو چائے کافی ابل کر جل رہی تھی ''نہ تو تم کس مرض کی دوا ہو۔ چائے ابل رہی تھی تو بند کر دیتیں چولہا۔ چلو اب تم یہ چائے لے کر آؤ...... اور یہ سب بھی صاف کر دو۔'' وہ اس پر غصہ دکھاتی' الجھتی بگڑتی ناشتے کی ٹیبل پر آ بیٹھی۔ ''بیٹا...... تم میرے ساتھ چلو ہاسپٹل' حنیف تمہیں ڈراپ کر کے ثمن کو لے آئے گا۔'' بابا جان نے شفقت سے کہا۔

''ج...... جی...... جی بابا جان۔'' اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا پھر وہ اپنی الجھی ہوئی سوچوں کے ساتھ ہاسپٹل کے لیے روانہ ہو گئی۔

☆......☆

''یا اللہ...... مجھے یہ دن بھی دیکھنا نصیب ہونا تھا۔ میں تو اپنی بہوؤں کو بیٹیوں کی طرح چاہتی ہوں۔ میری بہو میری بیٹی کا گھر اجاڑنے کا سوچ رہی ہے۔ ایسی منافقت۔ کیا کروں میرے اللہ...... کیا کروں...... بی بی جان صبح سے اسی کیفیت میں تھیں۔ سبرینہ کی باتیں ان کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ کئی کڑیاں مل رہی تھیں۔ ''میں تو سبرینہ کو اپنی بیٹی کا ہمدرد سمجھتی رہی اور وہی اسے درد دینے کے درپے ہے۔ یا اللہ میں سمجھ نہیں پائی وہ کب اور کیسے بدل گئی۔ وہ اپنی بہن کی خاطر میری بیٹی کی زندگی برباد کر رہی ہے۔ میں...... اپنی بیٹی کے لیے اپنے بیٹے کے گھر میں آگ کیسے لگاؤں۔ کیسے بتاؤں سب کو کہ انعم کا اصل مجرم کون ہے۔ بی بی جان رو رو کر اللہ کے حضور فریاد کر رہی تھیں۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کریں تو کیا کریں ان کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

☆......☆

انعم کو ابھی ہوش نہیں آیا تھا۔ ثمن رات بھر بے آرام رہی تھی سبرینہ آئی تو اس نے شکریہ ادا کیا۔

''اچھا ہوا تم آ گئیں...... اروئی کو ابھی کہاں تجربہ ہے ان معاملات کا'' ثمن کا اپنا نرم سا لہجہ و انداز تھا۔

''ہاں...... میں بھی یہی سوچ کر آئی ہوں۔ انعم کا خیال ہمیں ہی تو رکھنا ہے۔ وہ محترمہ تو گھر کے کسی کام کی نہیں ہیں۔'' سبرینہ نے اپنا بیگ ایک طرف رکھ کر چادر تہہ کرتے ہوئے بلاوجہ تنقید کی ''کیوں؟ کیا ہوا...... ناشتہ وغیرہ تو بنا لیتی ہے وہ۔ آہستہ آہستہ سنبھال لے گی'' ثمن نے اپنی چادر اور گھر لے جانے والا سامان سنبھالا ''کئی مہینے تو ہو گئے اور پتہ نہیں کتنا وقت لگے گا۔ ابھی تک وہ کسی کے مزاج آشنا تو ہوئی نہیں۔'' سبرینہ نے برا سا منہ بنایا۔

''ہوا کیا ہے......؟ کسی کو شکایت ہوئی ہے اس سے'' ثمن فکرمند ہوئی۔ ''بی بی جان سے جا کر پوچھیے گا...... کہ ہوا کیا ہے۔ وہی صبح غصے سے اسے کمرے سے نکال رہی تھیں۔'' سبرینہ نے ثمن کی فکر مزید بڑھا دی۔ وہ کیا کہتی۔ کیا وجہ کیا مسئلہ تھا۔ بی بی جان اروئی سے ناراض تھیں! وہ بھی الجھ گئی تھی۔

☆......☆

اروئی صبح سے خاموش تھی۔ اصم کو اس کی خاموشی کھل رہی تھی۔ وہ ہاسپٹل جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا اور اروئی اس کی مدد کرتی ہوئی بھی جیسے اس کے ساتھ موجود نہیں تھی۔

''کیا بات ہے اروئی...... تم صبح سے خاموش ہو۔ کوئی پرابلم ہے۔ کسی نے کچھ کہا ہے؟'' اصم نے اپنا کالر درست کرتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام کر تشویش سے پوچھا ''نہیں کسی نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے بس انعم کا خیال آ رہا ہے وہ کس قدر Tense رہی ہے۔ کیا فائق بھائی شروع سے ایسے ہیں۔'' وہ ذہن میں مچلتا سوال بلاآخر کر بیٹھی۔

(اس دلچسپ ناول کی اگلی قسط آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے)

افسانہ

عائشہ شفقت

پچھتاوا

سرد گرم تو ہر جگہ ہو جاتا ہے جہاں دو لوگ ہوتے ہیں وہاں اختلافات کہیں نہ کہیں ضرور ہو جاتے ہیں اور دنیا میں ایسے کوئی میاں بیوی نہیں جہاں یہ معمولی رنجشیں نہ ہوتی ہوں مگر...

''بس چاچو میں نے واپس نہیں جانا، مطلب نہیں جانا۔ وہ گھر اس لائق نہیں ہے کہ میں وہاں رہوں۔'' شگفتہ نے چاچو کے ساتھ بدتمیزی کرتے ہوئے کہا تو شگفتہ کے والد نے بیٹی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بھائی سے کہا۔

''جب میری بیٹی نہیں جانا چاہتی تو تم کیوں پیچھے پڑے ہو۔ نظر نہیں آتا میری پھول جیسی معصوم بچی کا کیا حال کر دیا ہے ان لوگوں نے۔''

''مگر بھائی جان اب ایسا نہیں ہوگا۔ شگفتہ کو اب میں اپنی ذمے داری پر لے جا رہا ہوں۔ ایک آخری کوشش کر کے تو دیکھیے۔'' چاچو اپنی بھتیجی کا گھر بچانے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے اور جن کی بیٹی کا گھر برباد ہو رہا تھا وہ اب بھی سکون سے بیٹھے تھے۔

''بس کر دو یہ لاحاصل بحث' شگفتہ گھر نہیں جانا چاہتی تو تم کیوں مجبور کر رہے ہو۔ دس سال...... انہوں نے دس انگلیاں آگے کر کے دکھائیں، دس سال سمجھوتا کیا ہے میری گڑیا نے اس جاہل گھرانے میں مگر اب میں اس پر کی گئی زیادتیاں برداشت نہیں کروں گا۔''

''ہاں تو جب دس سال گزار دیئے ہیں تو ایک اور موقع دے دو اور پھر تین بچوں کے بعد علیحدگی کا فیصلہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے بچوں کی ذمے داری کون لے گا؟''

''کون لے گا کیا مطلب؟ میں ہوں نا۔ میں اٹھاؤں گا بیٹی اور نواسے نواسیوں کی ذمے داری اور پھر شگفتہ کا بھائی ہے بہن کے سر پر ہاتھ رکھنا فرض ہے بھائیوں کا۔''

شگفتہ کے ابو نے مان بھری نظروں سے اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھا اور سامنے سے بھی اثباتی فرماں برداری سے جواب ملا۔

''جی ابو...... بھائی ہی تو بہنوں کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔''

کیوں آپ لوگ کیوں اٹھائیں گے میں خود پڑھی لکھی ہوں خود کما سکتی ہوں اور بچوں کی دیکھ بھال بھی کر سکتی ہوں۔'' شگفتہ نے غرور بھرے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا۔ تم ماشاء اللہ پڑھی لکھی ہو جاب کر سکتی ہو مگر بچوں کے سر پر ماں کے ساتھ ساتھ باپ کا سایہ ہونا بھی بہت ضروری ہے اگر دونوں میں سے ایک کا سایہ سر اٹھ جائے بچوں کی زندگی میں کبھی نہ پورا ہونے والا خلا رہ جاتا ہے اور پھر......''

''بس چاچو میں اتنی دیر سے کہہ رہی ہوں کہ میں نے نہیں جانا تو آپ کو سمجھ کیوں نہیں آتا۔ جب مجھے میرے ماں باپ فورس نہیں کر رہے تو پھر آپ کیوں اور کس حق سے میرے ساتھ زبردستی کر رہے ہیں۔'' شگفتہ انتہائی بدتمیزی سے جواب دے کر پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

☆.....☆

شگفتہ بی ایڈ کر رہی تھی اور شائستہ نے بی اے کے پیپرز دیے تھے جب ان کی خالہ اپنے دونوں بیٹوں کے لیے سوالی بن کر آئیں بچیوں کے رشتے وقت پر آ جائیں تو اس سے بڑھ کر والدین کے لیے کوئی بات خوشی اور طمانیت کا باعث نہیں ہوتی دیکھے بھالے لڑکے تھے سو ہاں کرنے میں اعتراض تو کوئی نہ تھا مگر پھر بھی چھوٹے بھائی نے دونوں رشتے یکدم کرنے سے منع کیا۔

''پہلے بڑی کی کر دیں پھر حالات کا رخ دیکھ کر مناسب لگے تو چھوٹی بیٹی کا کرنا۔''

بات تو مناسب تھی مگر اپنے حالات دیکھ کر انہوں نے دونوں کی ہی کرنا مناسب سمجھا اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق جلد از جلد دونوں کو اپنے اپنے گھروں کو رخصت کیا۔

بظاہر تو ان کی زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی مگر سسرال کسی کی بھی اچھی نہیں ہوتی یقیناً ان دونوں کو

بھی اپنے سسرال والوں سے کچھ نہ کچھ شکایتیں تو ضرور ہوں گی مگر انہوں نے کسی کو بھی ظاہر نہ کیا' آل انڈویل کے مصداق زندگی کے دس سال گزر گئے۔ وقت نے شگفتہ کے آنگن میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا جبکہ شائستہ کی گود میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی کا تحفہ عنایت کیا اور ان دونوں بہنوں کی فیملی مکمل ہوگئی۔

شادی کے دس سال بعد جب شگفتہ حسب سابق چھٹیاں گزارنے اپنے میکے گئی تو اچانک وہاں جا کر اسے خیال آیا کہ وہ اپنے گھر میں خوش نہیں ہے اور یہ کہ وہ احمر کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ ماں کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ احمر نہ صرف اسے خرچہ نہیں دیتا بلکہ اسے مارتا بھی ہے۔ شگفتہ کے والدین اس کی اس بات پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آئے دوسری طرف سسرال والوں کو جب پتہ چلا کہ شگفتہ نے آنے سے انکار کر دیا ہے تو وہ خود لینے آ گئے لیکن شگفتہ نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو اس نے الزامات کا دفتر کھول دیا۔

''وہ مجھے مارتا ہے، ہاتھ اٹھاتا ہے مجھ پر۔''

''تمہارا نانا بھی تو تمہاری نانی پر ہاتھ اٹھاتا تھا تو کیا نانی نے گھر چھوڑ دیا اپنا گھر۔''

''گالیاں دیتا ہے۔''

''تمہارا دادا نہیں دیتا تھا۔''

''آمدن نہیں ہے۔''

''تمہارے پھوپھا کا کون سا ذریعہ آمدن تھا۔

اُن سب نے اِن سب باتوں کے باوجود نہ تو گھر چھوڑا اور نہ ہی طلاق کا شوشہ' ان سب باتوں کے باوجود نہ صرف گھر بسایا اپنے بچوں کو پالا پوسا انہیں پڑھایا لکھایا اپنے اپنے گھروں کا کیا آخری وقت تک شوہر کی خدمت کی۔ بیماری میں بھی نہ چھوڑا۔

ان سب باتوں کا جواب جس انداز میں شگفتہ نے دیا سننے والے انگشت بدنداں رہ گئے۔

''وہ زمانہ اور تھا جب عورتیں ایسے مردوں کے ساتھ ساری زندگی قید خانوں میں گزار لی تھیں، تب عورتیں جاہل تھیں خود کو شوہر کے ہاتھ کٹھ پتلی سمجھتی تھیں، میں سب کی طرح جاہل نہیں ہوں جو ایسے انسان کے ساتھ زندگی برباد کروں۔''

''ساری باتیں ایک طرف اگر یہی مسائل تھے تو تم شادی کے شروع دنوں میں فیصلہ کیوں نہ کر سکیں، شادی کے دس سال بعد تین بچوں کا ساتھ۔ اب اچانک تمہیں کیوں یاد آیا کہ تم اس شادی سے فرار چاہتی ہو۔''

''میں اس ماحول میں، اس جاہل گھرانے میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔''

''اگر وہ گھرانہ جاہل ہے تو تمہاری بہن وہاں کیسے خوش ہے اسے کوئی مسئلہ کیوں نہیں۔''

یہ اور ایسے بہت سے سوالات تھے جو کہ خاندان میں اٹھائے جا رہے اور ہر سوال کا ہر جواب شگفتہ کے پاس موجود تھا۔

یہ تمام مسائل ختم نہیں ہو رہے تھے اور بچوں کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا اس لیے انہیں باپ کے پاس بھیجنا پڑا۔

بچے باپ کے پاس آ تو گئے مگر باپ کی قربت ایک طرف مگر ماں کی کمی ماں سے دوری انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔ جب جب خالہ اپنے بچوں سے لاڈ کرتی ان کے دل دکھتے ذرا سی کوتاہی پر پڑنے والی ڈانٹ انہیں برے طریقے سے اندر ہی اندر تکلیف پہنچاتی، دادا، دادی خالہ، چاچو پھوپھیاں، باپ جتنا بھی پیار کر لیں نخرے اٹھالیں ماں کے پیار کی ٹھنڈک اور ماں کے غصے کی گرمی انہیں پروان چڑھانے کے لیے از حد ضروری تھی۔

بچی ماں کو یاد کر کے روتی دادا سے کہتی۔

''ابو جی بس ایک دفعہ مما سے بات کروا دیں میری، میں انہیں بلاؤں گی تو وہ ضرور آ جائیں گی۔''

مگر ماں نے اپنی معصوم بچی کا بھی مان نہ رکھا۔

''بیٹا میں نہیں آ سکتی میری مجبوری ہے آپ نہیں سمجھ سکتے۔''

''بچی چھوٹی تھی، کیا سمجھتی کہ مجبوریاں کیا ہوتی ہیں۔''

''مما تبریز پڑھتا نہیں ہے اس کی کمپلینز آ رہی ہیں، میں اسے ڈانٹتی ہوں تب بھی نہیں پڑھتا۔ مجھ سے بھی نہیں پڑھا جاتا ہر ٹیسٹ میں ''ویری پوز'' دیتی ہیں۔ ڈانٹتی ہیں مجھے کہتی ہیں آپ کی مما کو آپ کی کوئی فکر نہیں ہے۔''

اس سنگدل ماں نے بچی کے لہجے میں چھپے درد، اس کے وقت سے پہلے جاتے بچپن اور آتی سمجھداری کو بھی محسوس نہ کیا۔

کوئی ماں ایسی سنگدل تو نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ ماں ہی کب تھی۔ اس نے بچوں کو جنم تو دے دیا مگر ان کی ماں نہ بن پائی ماں ب کے لیے صرف بچوں کو جنم دینا اور پرورش کرنا ہی کافی نہیں ہوتا اپنی ''میں'' قربان کرنی پڑتی ہے، اپنی ذات کی نفی کرنا پڑتی ہے ہر دکھ برداشت کرنا پڑتا ہے محض اپنی اولاد کے لیے مگر وہ اپنی ذات کے زعم میں مبتلا ہو کر اپنی ''میں'' اور ''انا'' کو برقرار رکھنے کے لیے اپنا گھر ختم کر رہی تھی اپنی ممتا کو خود اپنے ہی ہاتھوں مار رہی تھی۔

بچوں کے فائنل ایگزامز ختم ہوئے تو انہیں ماں سے ملنے بھیج دیا گیا، ماں سے مل کر اس کے سینے سے لگ کر بچوں کو سکون ملا۔ خوش ہوئے چھوٹی عالیہ چند ماہ کی تھی جب سے شگفتہ بیگم میکے بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں بچوں نے ننھی گڑیا کے ساتھ وقت نہ گزارا تھا۔ اب اس گڑیا کے ساتھ کھیل کے خوش تھے۔ بچوں کا رزلٹ آیا تو پہلے رزلٹس میں بہت فرق تھا۔ نمایاں کامیابی سے کامیابی اور ناکامی کے درمیان آ گئے تھے۔

بچوں کے رزلٹ اور ان کی ذہنی حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے باپ اور دادا نے بچوں کو واپس نہ لانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا سارا سامان اور کھلونوں کے ساتھ اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ بھی بھجوا دیا۔ شگفتہ نے بھی ذرا آسرا نہ کروایا۔ فوراً دیں کے اسکول میں داخلہ کروا دیا۔

بچے وہاں ماں کو یاد کر کے روتے تھے یہاں انہیں اپنا گھر دادا دادی پاپا سب یاد آ رہے تھے حالات نے دونوں بہن بھائیوں کو ایک دوسرے کا رازدار بنا دیا تھا۔

''آپا مجھے گھر بہت یاد آ رہا ہے۔'' تبریز نے زویا سے اپنا درد بانٹتے ہوئے کہا

ابھی بھی تو ہم گھر میں ہی ہیں۔'' زویا نے سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا دھیان بٹانا چاہا۔

''مجھے اپنا گھر یاد آ رہا ہے۔ ابو جی والا گھر۔ یہ گھر تو نانو اور ماموں کا ہے۔ یہاں پاپا نہیں ہیں، ابو جی، امی جی نہیں ہیں۔ مجھے وہ سب یاد آ رہے ہیں بہت زیادہ۔'' تبریز نے روہانسا ہو کر کہا۔ ''میں مما سے کہوں گا ہمیں واپس لے جائیں ہم نے واپس جانا ہے اور یہ بھی کہ مما بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ وہ ضرور مانیں گی میری بات۔''

''نہیں بھائی۔ مما سے یا کسی سے مت کہنا وہ ہمیں ڈانٹیں گے کہیں گے کہ جب وہاں رہنا تھا تو یہاں کیوں آئے۔''

''اور مما نہیں جائیں گی ہمارے ساتھ میں نے ایک دو دفعہ کہا مگر مما نے منع کر دیا۔''

''تو ہم اکیلے چلتے ہیں نا آپا۔''

''نہیں بھائی ہم اکیلے نہیں جاسکتے اگر ہم گم ہوگئے یا کوئی اور ہمیں اٹھا کر لے گیا تو ہم مما اور پاپا دونوں سے الگ ہوجائیں گے اور دوسرے ہم سے پیار نہیں کرتے۔'' زویا نے بڑی بن کر بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''پیار تو مما بھی نہیں کرتیں ہم سے۔ اگر کرتیں تو ہم مما پاپا دونوں کے ساتھ رہتے جیسے سارے بچے رہتے ہیں۔'' تبریز نے روتے ہوئے جواب دیا۔

وہ اپنے آنسوؤں کو روکے بڑی ہمت سے ماں کی طرح بھائی کو گلے لگا کر چپ کروا رہی تھی مگر اس دن ماں کے خلاف پہلی بات ان کے کچے ذہنوں میں نقش ہوگئی۔

اور وہ نقش وقت کے ساتھ ساتھ ہلکا ہوتا گیا جیسے کچی مٹی پہ بنا نقش وقت کے ساتھ ساتھ پکا ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہ وہ پہلا نقش تھا جو ان کے معصوم ذہنوں پر بنا تھا۔

وقت کا کمہار ان کے ذہنوں پہ اور کون کون سے نقش بناتا ہے یہ تو وقت گزرنے کے ساتھ پتا چلنا تھا۔

☆......☆

''امی۔ میں کالج جارہی ہوں۔ عالیہ کی طبیعت ذرا ٹھیک نہیں ہے ذرا خیال رکھیے گا۔ دونوں بچے کالج جاچکے ہیں میرا ایک ضروری لیکچر ہے ورنہ میں چھٹی لے لیتی۔ پلیز عالیہ کا خیال رکھیے گا میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔'' شگفتہ نے کالج جانے سے پہلے امی کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

''بیٹا آتے ہوئے میری شوگر کی دوائی لیتے آنا۔''

''امی آپ بہرام کو کہہ دیں نا۔''

''بیٹا اسے کہے ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا ہے لاتا ہی نہیں۔ رمشہ کچھ منگوائے تو بستر مرگ سے اٹھ کر لادے گا مگر بستر مرگ پر پڑے ماں باپ کی دوائی لاتے ہوئے موت آتی ہے۔'' امی نے بیٹے بہو کے خلاف محاذ کھولنا چاہا۔

''اچھا امی لے آؤں گی۔'' شگفتہ یہ کہہ کر چلی تو گئی مگر اس کے پیچھے بھابھی رمشہ نے نیا محاذ کھول دیا۔

ناشتے کی ٹرے بہرام کے آگے پٹختے ہوئے کہا ''ناشتہ کرلو ورنہ تمہارے ناشتہ نہ کرنے کا الزام بھی تمہاری ماں میرے کھاتے میں ڈال دے گی۔''

''ہوا کیا ہے سویٹ ہارٹ؟'' بہرام نے بہت پیار سے بیوی کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو زخمی ناگن کی طرح پھنکار رہی تھی۔

'تمہاری ماں تمہاری بہن سے میری شکایتیں کررہی تھی۔''

''کیا ہوا بیٹا۔ صبح صبح اتنا شور کیوں ہورہا ہے؟'' شور کی آواز سن کر امی بھی وہاں آگئیں۔

''آیئے، آیئے آپ کی کمی رہ گئی تھی مزید کوئی شکایتیں لگانی ہیں تو لگایئے نا میں بھی تو سنوں۔''

''کون سی شکایت؟ میں کوئی شکایت کرنے نہیں آئی بس شور کی آواز سن کر آئی ہوں۔''

''واہ واہ! اداکاریاں تو دیکھیں ابھی جو کچھ اپنی بیٹی سے فرما رہی تھیں ذرا یہاں بھی ارشاد ہوں وہ جو حکمنامے جاری کرکے گئی ہے وہ بھی سنائیں۔''

''تمہیں تو کچھ نہیں کہا نا مجھ سے کہہ کر گئی ہے۔''

''ہاہا...... رمشہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ آپ نے کون سا کرلینا ہے سارا دن بستر پر پڑی رہتی ہیں کام تو سارے مجھے کرنے ہوتے ہیں۔ اور وہ آپ کی بیٹی روز تیار ہوکے پرس جھلاتی ہوئی ٹھمکتی ہوئی چلتی بنتی ہے اپنے بچوں کو میرے گلے ڈال کر۔''

''نوکری کرتی ہے وہ۔ اپنا اور اپنے بچوں کا' بلکہ ماں باپ کا خرچہ بھی اٹھاتی ہے۔ تمہارے میاں سے کچھ نہیں لیتی۔''

''یہ بھی اچھی کہی آپ نے۔ بچوں کی آیا گیری میں کروں اور تنخواہ مہارانی صاحبہ خود رکھیں۔ سال میں ایک سوٹ میرے اوپر احسان کرتی ہے۔''

''خود تو عیش نہیں کرتی گھر کے بہت سے کام اس کی تنخواہ سے ہوتے ہیں اپنی ذمے داری خود اٹھاتی ہے۔''

''ہاں تو اپنی ذمے داری خود اٹھا کے احسان نہیں کرتی، میاں کے ساتھ ہوتی تو ذمہ داری نہ اٹھانی پڑتی۔''

''تم ہوتی کون ہو میری بیٹی پر نکتہ چینی کرنے والی، انداز تو ایسے ہیں جیسے اس گھر کی ملکہ ہو۔''

''ہاں تو ہوں ملکہ شوہر سلامت ہے میرا اور عورت کا راج شوہر کے دم سے ہی ہوتا ہے۔ مگر آپ کی بیٹی یہ بات نہ سمجھ سکی۔ اپنی سلطنت خود اجاڑ کر آگئی میرے سینے پر مونگ دلنے۔'' رمشہ اپنی زبان بند کرنے پر کسی طور رضامند نہ تھی اور بہرام جس نے بہن کی ذمے داری اٹھانے کی بات بڑے غرور سے کہی تھی، اب اس بہن کی حمایت میں ایک لفظ تک نہ بول رہا تھا۔ دنیا والوں سے بچانے کی باتیں کرنے والا بھائی اپنی گھر والی سے بہن کو نہ بچاسکا۔

بیٹی کے ماضی کا اس انداز سے ذکر ماں کو لمحہ بھر کے لیے تو چپ کرا گیا خود کو سنبھال کے غصے سے کہا

اپنی زبان کو لگام دو۔ اس لمبی زبان سے گھر نہیں بسا کرتے۔''

''ہاں مجھے گھر بسانے کا گر بتارہی ہیں اگر اتنے ہی گر آتے تھے تو اپنی بیٹی کو کیوں نہ بتائے۔ مجھے گھر بسانا آتا ہے آپ کی بیٹی کی طرح بھابیوں کی زندگی حرام کرنے نہیں بیٹھی ہوئی اپنے گھر میں ہوں۔ ہونہہ۔ آئیں بڑی مجھے گھر بسانے کے گر بتانے والی۔'' بہو بیگم تماشہ کرنے کے بعد جھٹکے سے مڑی اور پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔

☆......☆

خاندان کے بڑوں نے شگفتہ کو بہت سمجھایا بہت کوشش کی کہ گھر نہ ٹوٹے مگر وہ طلاق لینے پر بضد تھی۔ ہر حربہ' ہر کوشش کرکے دیکھ لی گئی مگر اس نے گھر نہ بسانا تھا نہ بسایا اور دو سال ماں باپ کی دہلیز پر گزارنے کے بعد وہاں مستقل ڈیرہ ڈال دیا۔ وہ جس نے بارہ سال پہلے دلہن کا زیور پہن کر ماں باپ کی دہلیز پار کرکے سسرال کی چوکھٹ پر قدم رکھا تھا اب طلاق کا جھومر ماتھے پر سجائے واپس ماں باپ کی دہلیز پر آگئی۔

سرد گرم تو ہر جگہ ہوجاتا ہے جہاں دو لوگ ہوتے ہیں وہاں اختلافات کہیں نہ کہیں ضرور ہوجاتے ہیں اور دنیا میں ایسے کوئی میاں بیوی نہیں جہاں یہ معمولی رنجشیں نہ ہوتی ہوں مگر گھر بسانے والیاں ہر حالات میں سروائیو کرتی ہیں۔ گھر نہیں چھوڑتیں، رشتہ نہیں توڑتیں، ان وجوہ کو ختم کرتی ہیں جو رشتہ توڑنے کے سبب بن سکتے ہیں نہ کہ وجوہات برقرار رکھتے ہوئے رشتہ ختم کرتی ہیں میاں بیوی کو چاہیے کہ اختلافات اور وجوہات ختم کرکے اپنا گھر اور رشتہ بچائیں کہ صرف یہ ایک گھر بچانا نہیں ہوتا بلکہ بچوں کی صورت پوری نسل کو بچانا ہوتا ہے۔

طلاق لینے کے بعد شگفتہ نے ماسٹرز کیا اور کالج میں لیکچرار لگ گئی۔

وقت نہ کبھی کسی کے لیے رکا اور نہ رکے گا۔ ان کی زندگی کے پل تلے وقت کا بہت سا پانی تیزی سے گزر گیا۔ بچے ہو گئے۔ شگفتہ کے بچے بھی بڑے ہو گئے۔ چھوٹی اسکول جبکہ دونوں بڑے کالج پہنچ گئے تھے۔

زویا کا گریجویشن مکمل ہونے والا تھا اور وہ ہر ماں کی طرح شگفتہ کو بھی اس کی شادی کا خیال ستا رہا تھا اور جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر بھی آتے ہیں زویا کے بھی کئی رشتے آ چکے تھے مگر وہ مسلسل انکار کر رہی تھی۔ دباؤ اس لیے نہیں ڈالا کہ کوئی بھی رشتہ دل کو چھونے والا نہ تھا۔ مگر ارسلان کا رشتہ ہر لحاظ سے قابل غور تھا، اچھا پڑھا لکھا برسر روزگار اور خوبرو نوجوان تھا اور خاندان بھی اچھا رکھ رکھاؤ والا تھا اور اس کے گھر والوں کو شگفتہ کے طلاق یافتہ ہونے پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ جب زویا سے پوچھا گیا تو اس نے ہمیشہ کی طرح انکار کر دیا، ماں نے بہت سمجھایا نانی نے بھی کوشش کی مگر اس کی ناں کسی طور ہاں میں نہ بدلی۔

☆......☆

اس دن زویا اپنے کمرے میں بیٹھی اپنا کام کر رہی تھی جب تبریز اس کے کمرے میں آیا۔

''آپا! میں آ جاؤں؟'' تبریز نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے پوچھا۔

'' ہاں، ہاں ضرور آؤ نا۔'' زویا نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا ''کہاں غائب ہو آج کل۔ مجھے تو نظر ہی نہیں آتے۔''

''بس آپا گھر پر رہنے کا دل نہیں کرتا پہلے مجبوری تھی چھوٹے تھے ہم مگر اب بس دل نہیں کرتا۔'' تبریز نے بیزار لہجے میں کہا۔

''ہاں تم تو جا سکتے ہو میں تو اس ماحول سے نکلنے کے لیے کہیں اور نہیں جا سکتی نا جیسے تمہیں اس گھر سے وحشت ہوتی ہے مجھے بھی ہوتی ہے دم گھٹتا ہے میرا۔ زویا نے بھی دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے کہا۔

ماں باپ کے درمیان بڑھتی دوریوں نے ان دونوں کے درمیان کی ساری دوریاں ختم کر دی تھیں۔ انہیں ایک دوسرے کا راز دار بنا دیا تھا۔

''آپا ایک بات پوچھوں؟ تبریز پرسوچ انداز میں بولا

''ہاں ضرور تمہیں کب سے اجازت لینے کی ضرورت پڑ گئی۔'' زویا نے ذرا مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''تم شادی سے انکار کیوں کر رہی ہو؟''

تبریز کے سوال نے زویا کو لمحے بھر کے لیے چپ کروا دیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بھائی اس سے شادی کی بات اس طرح کرے گا۔

''تم سے مما نے کچھ کہا؟'' زویا نے خود کو نارمل کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... مما کے خیال میں ہم ابھی تک بچے ہیں اور بچوں سے ایسی باتیں نہیں کی جاتیں۔'' تبریز نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

''بچے...... درد بھری ہنسی زویا کے لبوں پر آ گئی ''مما اتنی بے خبر ہیں کہ وہ ابھی تک یہ بھی نہ جان پائیں کہ ہم تو اسی دن بڑے ہو گئے تھے جب مما پاپا کو چھوڑ کر یہاں آ گئی تھیں۔''

''ہم تو ایک دوسرے سے اپنے خیالات، وہ وقت، وہ درد، وہ محرومیاں بانٹ لیتے ہیں کچھ دل ہلکا کر لیتے ہیں مگر عالیہ۔ عالیہ کس سے کہے۔ کس سے اپنا دکھ اپنی محرومیاں بانٹے ہم تو ایک دوسرے کے دکھ اور محرومیوں کے گواہ ایک دوسرے کے درد کو محسوس کرنے والے ایک ایک دوسرے سے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں مگر عالیہ...... وہ تو چھوٹی تھی باپ تک کو تو وہ جانتی نہیں۔ وہ کیا جانے باپ کی محبت، ددھیال کا لاڈ، سب سے انجان ہے وہ تو۔ ہم نے تو پھر بھی ان رشتوں سے محبتیں سمیٹی ہیں مگر وہ یہ سب کیا جانے۔ کیا جانے جب ابو جی گھر آتے ہی ہمیں گود میں اٹھاتے تھے جب ہم پاپا کے کندھے پر چڑھ کر اپنی فرمائشیں، اپنی ضدیں ان سے منوایا کرتے تھے وہ کس سے کہے یہ سب، کس سے پوچھے ان رشتوں کی قیمت۔''

زویا بات کرتے ہوئے نجانے کہاں تک پہنچ گئی مگر یہ بھی ایک سچ ہی تھا کہ وہ جہاں بھی جاتے سبھی راستے انہیں ان کے ماضی سے دور رکھنے میں ناکام ہوتے۔

''چھوڑو آپا میں کیا بات کر رہا تھا اور آپ کہاں پہنچ گئیں۔''

''میں چاہوں نہ چاہوں وہ سب خود میرے سامنے آ جاتا ہے۔''

اچھا میں کچھ پوچھ رہا تھا۔ انکار کیوں کر رہی ہو آپ؟''

''شادی ایک فضول کام ہے۔ مجھے اس پر بلیو نہیں ہے۔ شادی صرف نقصان ہی کرتی ہے۔''

''کس کا؟''

''سب کا!''

''آپا۔ یہ تم مما کی شادی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہہ رہی ہو؟''

''جو تم سمجھو۔''

''آپا ہم تو نہیں جانتے نا کہ کس کی غلطی تھی۔''

''جس کی بھی تھی زندگی تو ہماری برباد ہوئی نا۔ بھائیوں سے ایسی باتیں نہیں کرتے مگر میں کل کو مزید زویا تبریز اور عالیہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ اپنی وجہ سے تو بالکل بھی نہیں۔''

''تو کیا تم مما کی طرح گھر چھوڑ آؤ گی؟؟؟''

تبریز نے بے ساختہ پوچھا۔ زویا نے اس سے زیادہ بے ساختگی سے جواب دیا۔

''ہرگز نہیں...... میں نے ایسا تو نہیں کہا۔''

''پھر......؟ لگ تو یونہی رہا ہے جیسے تم نے سب کچھ پہلے سے سوچ رکھا ہو۔''

''نہیں میں نے کچھ نہیں سوچا بس یہ سوچا ہے کہ جیسی زندگی ہم نے گزاری ہے ویسی کوئی اور نہ گزارے۔ اور پھر کیا ارسلان کے گھر والے مما کی طلاق کے بارے میں نہیں پوچھیں گے؟ طعنے نہیں دیں گے؟؟ ویسے بھی جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں وہاں کے لوگوں کے مطابق جب ماں گھر نہ بسا سکی تو بیٹی کیا جانے گھر بسانے کے گر۔''

''آپا۔ ارسلان کے گھر والوں کو سب پتا ہے۔ انہوں نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا ان کے لیے تم ضروری ہو مما کا ماضی نہیں۔

''ماں کا ماضی ہو یا حال بیٹی کی زندگی سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کل کوئی بھی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں......'' زویا سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ بات کیسے کرے اس کی یہ مشکل تبریز نے حل کر دی۔

''آپا...... اگر کبھی بھی کوئی بھی ایسی ویسی بات ہوئی تو تم بس مجھے بتانا مما کو یا نانو...... کسی کو بھی نہیں اگر تم نے مما کو بتایا تو جس طرح پیرنٹس نے ان کا گھر خراب کیا شاید مما بھی تمہارے ساتھ وہی کریں۔ اگر نانا، نانو چاہتے تو مما کا گھر بسا سکتے تھے وہ...... تم بس مجھے بتانا...... میں وہ مسئلہ ختم کر دوں گا انشاء اللہ۔ تمہارا گھر نہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ زویا نے جیسے گھٹنے ٹیکتے ہوئے کہا۔

''میں مان بھی جاتی ہوں مگر۔'' زویا نے بات دانستہ ادھوری چھوڑ دی۔

''مگر؟؟ تبریز نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''مگر میں پاپا کے بغیر کیسے رخصت ہو جاؤں

......"زدیا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپا...... جیسے بچپن سے اب تک تم نے ماں کی طرح میرے آنسو پونچھے۔ میرے ہر برے وقت، تکلیف میں مجھے اکیلا نہ چھوڑا ویسے ہی میں تمہیں رخصت کروں گا پاپا کی کمی تو میں پوری نہیں کرسکتا مگر کوشش تو کرسکتا ہوں نا......" تبریز نے حقیقتاً باپ کی طرح اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ بھی ننھے بچے کی طرح اس کے گلے لگ گئی جیسے بچپن میں پاپا کے گلے لگتی تھی۔

"پھر...... تیاری کروں تمہیں گھر سے نکالنے کی" تبریز نے مذاقاً کہا تو دونوں کھلکھلانے لگے۔

دونوں نے ایک دوسرے سے اپنا حال کہہ کر اپنا دل ہلکا کرلیا مگر ان کی باتوں سے باہر کھڑی شگفتہ پہ منوں وزنی بوجھ آن پڑا۔ وہ نجانے کب سے وہاں کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ شگفتہ کو یکدم بہت سے پچھتاووں نے آن گھیرا۔ غلطی بھلے سے اس کی نہیں تھی مگر مائیں اولاد کے لیے کیا کچھ قربانیاں نہیں دیتیں۔ اگر تب اپنی انا اپنی میں قربان کردیتی تو آج حالات بہت مختلف اور خوشگوار ہوتے۔ آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں نے منظر دھندلا دیا۔ عجیب بات ہے نا...... برسوں پہلے انا نے اس کی بینائی چھین لی...... اور اب جب جھوٹی انا نے سب چھین لینے کے بعد بینائی لوٹا دی تو پچھتاوے منظر دھندلانے لگے۔ انہیں دھندلی آنکھوں سے جب وہ پلٹی تو اسے احساس ہونا چاہیے تھا کہ جس موڑ سے اسے پلٹنا چاہیے تھا وہ موڑ بہت پیچھے رہ گیا۔ اب واپسی کے سب دروازے بند ہوچکے ہیں اور واپسی کے سب دروازے وہ خود بند کرکے آئی تھی۔

غزل

تشنہ بریلوی

ہم نے جب کشتی میں اک طوفان برپا کردیا
بادباں نے جُھک کے موجوں کو اشارہ کردیا

دیکھ میرے عشق نے جادو یہ کیسا کردیا
عام سی لڑکی کو بھی رشکِ زُلیخا کردیا

سر میں ہم نے سجائیں بجلیاں مہکائے پھول
پھر چُرا کر زلفِ شب تیرا سراپا کردیا

میں نے اپنی ذلتوں کا خود کیا ہے اہتمام
کون کہتا ہے مجھ کو تو نے رُسوا کردیا

بات تو جب تھی اُٹھاتے ہم کوئی طوفانِ نوح
کیا ہوا ہم نے اگر قطرے کو دریا کردیا

میں بہت خوش تھا بھری محفل میں سب کے درمیاں
تو نے آکر بزم میں کیوں مجھ کو تنہا کردیا

ہاں کسی کو دیکھ کر اک بار دھڑکا تھا یہ دل
بس یہی تھا عشق اپنا کیوں فسانہ کردیا

یہ نشور و ثاقب و حسرت کا فیضِ خاص ہے
شاعری کے فن میں تشنہ تجھ کو یکتا کردیا

افسانہ

ماہ وش طالب

زمین کے آنسو

جیسے ہر چمکتی شے سونا نہیں ہوتی اسی طرح ہر مرد اور عورت کا رشتہ گناہ آلود نہیں ہوتا... بس سمجھنے کی بات ہے!

موجوں کی روانی سے جب سمندر میں گرج پیدا ہوتی ہے تو وہ غضب اور تڑپ سے اچھل کر سب کو نگل لینے کی چاہ کرتا ہے یہ چاہت جب جنوں بن جاتی ہے تو بعض اوقات بھرپور شدرت کے باوجود یہ

لہریں خالی پلٹ جاتی ہیں اسی طرح کبھی لاحاصل کو پانے کی تڑپ اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ انسان اس کی خاطر ہر حد پار کرنے کو تیار رہتا ہے اور اپنے ضمیر کو روتا بلکتا چھوڑ کر نفس کو ہنسانے کی تگ و دو کرتا ہے مگر لاحاصل کا ''لا'' نہیں جاتا اور نفس کی تڑپ نہیں جاتی مگر ضمیر کو صبر آ جاتا ہے پھر اسے چپ لگ جاتی ہے۔

☆......☆

شام کے دھندلکے سائے گہرے ہونے کو تھے وہ دونوں تھکے ماندے لوٹ رہے تھے تھکن اور بیزاری دونوں کے چہروں سے عیاں تھی۔ وہ دونوں کلاس فیلو رہ چکے تھے اور اتفاق سے میڈیا رپورٹنگ کے مشترکہ شوق نے دونوں کو پھر سے ملوا دیا۔ ایک سال کے عرصے میں دونوں کی بے تکلفی غیر معمولی حد تک بڑھ چکی تھی اور اسی غیر سنجیدہ رویے کے باعث ان کی نوکری خطرے میں پڑ چکی تھی۔ باس نے انہیں وارننگ جاری کر دی تھی یہی وجہ تھی کہ اب دونوں کسی ایسے منظر کی تلاش میں تھے جسے پکڑ کر، تیکھی خبر بنا کر باس کے سامنے پیش کر کے ڈائریکٹر کو خوش کر کے نوکری بحال رکھی جا سکے۔ دراصل وہ دونوں ایک غیر معروف چینل کے لیے کام کرتے تھے۔

☆......☆

وہ دونوں تیز تیز قدم چلا رہے تھے مبادا کسی شناسا سے سامنا نہ ہو جائے اسی خطرے کے پیش نظر نوجوان لڑکی سر سے پیر تک سیاہ عبایہ میں چھپی تھی جبکہ پچاس کے پیٹے میں داخل ہوتا مرد کندھے پر رکھے رومال سے اپنا آدھا چہرہ چھپائے ہوئے تھا اس نے سرمئی رنگ کی سلوٹ زدہ میلی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اس کا چہرہ بن کہے اپنی بدبختی کی کہانی سنا رہا تھا۔ منزل پر پہنچ کر آدمی نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے تسلی کی اور پھر دونوں اطمینان سے لکڑی کا داخلی دروازہ پار کر گئے۔

☆......☆

آج وہ دونوں ایک نئی امید لیے نکلے تھے اسی لیے کافی پرعزم تھے انہوں نے شہری علاقوں کی بجائے پسماندہ علاقوں کی گلیاں چھاننے کو ترجیح دی کہ وہاں کے لوگوں کو بے وقوف بنانا بھی نسبتاً آسان ہوتا ہے۔

یہ ایک بارونق علاقہ بلکہ بازار تھا رنگا رنگ لوگوں اور اشیاء سے بھرا، گول گپوں اور دہی بھلوں سے پیٹ بھرنے کے بعد وہ دونوں اصل مقصد کی جانب گامزن ہوئے۔

مہنگائی، جیب تراشی، خواتین سے بدتمیزی، ٹریفک حادثات وغیرہ تو پرانے موضوعات تھے لہٰذا ان سب سے ہٹ کر کی تلاش میں تھے۔

یار کیا مصیبت ہے دوپہر ختم ہونے کو ہے آج بھی مگر کچھ ہاتھ نہیں آیا

شرجیل مایوس ہونے لگا وہ قبول صورت اور مناسب قد کاٹھ کا مالک تھا اس کے باپ کا جنرل اسٹور تھا مگر اسے دوکانداری سے سخت نفرت تھی پورے خاندان میں سے کچھ انوکھا کرنے کی خواہش اسے یہاں لے آئی تھی وہ اتنا لینڈ لارڈ نہیں تھا جتنا بننے کی کوشش کرتا تھا اس وقت بھی بائیک پر خواری کے باوجود اس نے پیلے رنگ کی پولو، نیلی جینز اور معیاری شوز پہنے ہوئے تھے خود کو بنا سنوار رکھنے کے باعث وہ چینل کے باقی رپورٹرز میں سب سے ممتاز نظر آتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ندا اکرم کا پورے ڈیپارٹمنٹ میں ایک وہی منظور نظر ٹھہرا تھا۔ چونکہ شرجیل کا معاشی پس منظر کم و بیش انہی جیسا تھا لہٰذا ندا کو کوئی احساس کمتری بھی نہیں تھا۔ ندا والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے باعث کچھ بگڑی ہوئی تھی ابو اس کے یوں نگری نگری پھرنے کو معیوب سمجھتے تھے مگر اسے پھرنے پھرانے، بائیک اور اسکرین کے سامنے بولنے کا بے حد شوق تھا۔

تو کیا ہوا، دن تو ختم نہیں ہوا۔ حوصلہ رکھو دراصل تمہیں بھوک لگی ہے، اس لیے ہمت جواب دے رہی ہے چلو پہلے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہیں۔

ندا نے مقامی ہوٹل جس کی پیشانی پر ویسی چسکا کا بوسیدہ بورڈ آویزاں تھا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا خود اعتمادی ہمیشہ ہی سے دبلی پتلی تیکھے نین نقوش والی ندا کی شخصیت کا حصہ ٹھہری تھی۔

کچھ لمحوں بعد ہی وہ ریسٹورنٹ کے اندر بیٹھے بریانی اور کولڈ ڈرنک کا آرڈر دے رہے تھے۔

☆......☆

دیکھ سوہنی گھبرا نہ، میں ہوں تیرے ساتھ۔

نوجوان لڑکی مسلسل ناخن سے انگلیاں کتر رہی تھی اس کے بیٹھنے کا انداز بھی اضطرابی تھا۔ اچھا اب بتا کیا کھائے گی۔ وہ اس کی فرمائش پوچھ رہا تھا۔

بول بھی میری رانی لڑکی کے خاموش رہنے پر وہ اسے اکسانے لگا۔

جو بھی تیرا دل کرے میں اتنی مشکل اور سب سے چھپ چھپا کے یہاں کھانے نہیں آئی وہ تو سوکھا سڑا مجھے وہاں بھی مل جاتا ہے میں تیرے ساتھ وقت گزارنے آئی ہوں۔

تو بتا تیرے پاس میرے لیے وقت کیوں نہیں ہوتا، وہ تیری سوتیلی زیادہ اہم ہے تیرے لیے بول.... لڑکی کا نقاب ڈھیلا ہو چکا تھا اور وہ ایک سانس میں شکوہ کرتی چلی گئی۔

نہ نہ، ایسی بات نہ کر، تو مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے، کہتے ہوئے آدمی نے اس کے ہاتھ تھام لیے اس دوران لڑکی کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

☆......☆

بریانی کی دھواں اڑاتی پلیٹیں ان دونوں کے سامنے تھیں شرجیل لبوں سے زبان تر کرتے ہوئے کھانے سے پورا انصاف کرنے لگا جبکہ ندا کی مرکز نگاہ سامنے کا منظر تھا دماغ میں کوندا لپکا اور اس نے اپنا آئی فون کیمرہ اس منظر پر فوکس کر دیا کردار اور مرکزی خیال اس کے سامنے تھے، کہانی بنانا اب ندا اور شرجیل کا کام تھا۔

فوڈ پوائنٹ، بے حیائی کا اڈہ..... ڈاکومنٹری کا موضوع وہ سوچ چکی تھی۔

کیا ہوا کھا کیوں نہیں رہیں؟ آدھی پلیٹ ختم کرنے کے بعد اسے ندا کا خیال آیا جواباً اس نے اس کی توجہ نگر مگر سامنے کے ٹیبل کی جانب کرائی، جہاں وہ آدمی اس لڑکی کو سینے سے لگائے بہلا رہا تھا

''آئندہ میں تیری سوہنی آنکھوں میں یہ آنسو نہ دیکھوں۔'' آدمی اب انگلیوں کی پوروں سے اس کے آنسو پونچھ رہا تھا۔

ندا اور شرجیل نے معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا اور اس پوز کی تصویریں لینے لگے۔

واپسی پر دونوں کافی مطمئن ہو کر ہوٹل سے باہر نکل گئے۔

آفتاب نے اہل زمین کے رویوں سے مایوس ہو کر ایک بار پھر منہ موڑ لیا تھا بے نور ستارے آسمان کے وسط پر نمودار ہونے لگے۔

☆......☆

چل میری دھی رانی اب اٹھ جا، بڑا ویلا گزر گیا تیری ماں پریشان ہوگی اور تیرا سوتیلا باپ اس کو طعنے دے دے کر اس کا جینا حرام کر دے گا۔ ساتھ میں تجھے بھی مارے گا۔ آ جا میرا سوہنا پتر۔

وہ شخص اپنی اٹھارہ سالہ بیٹی کو سمجھانے لگا۔

ابا تو پریشان نہ ہو میں اماں سے دوبارہ بات کروں گی کہ وہ مجھے تیرے ساتھ رہنے دے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تسلی دے رہی تھی

ابھی سے اڑنے لگے ہیں شاخوں سے سب پرندے
ابھی تو آنگن کے پیڑ سارے گرے نہیں ہیں

سخن زار

نظم

یہ چھم چھم ابر جو برسے ہیں
میرے دل کے قاتل ٹھہرے ہیں
یہ ٹپ ٹپ چشم سے بہتے ہیں
لگے اپنے سارے بہرے ہیں
لہو ہم سم آگے بڑھتا ہے
لگے روح پہ کوڑے گہرے ہیں
یہ کڑیاں من کی کڑیاں ہیں
جیسے نفس پہ ٹھہرے پہرے ہیں
جو راہیں بدلا کرتے ہیں
کچھ اپنے اپنے چہرے ہیں
جو مر کے جینا سیکھ چکے
وہ اپنے مجرم ٹھہرے ہیں
یہ قیدیں یار کی قیدیں ہیں
کچھ بیٹھے راہ میں پہرے ہیں
کچھ چلنا بھی دشوار بہت ہے
کچھ راہ میں بکھرے پہرے ہیں
نگین افضل وڑائچ

آزاد ہائیکو

کیا پیش کروں میں نذرانہ
اے مدینے کے تاجدار
دامن میں میرے فقط چند آنسو ہیں

☆☆☆

بڑی محبت ہے چاند سے مجھے
کیونکہ کسی وقت یہ میرے آقا کا
کھلونا رہا ہے

☆☆☆

پیوند لگی چادر اوڑھے
دو جہاں کے بادشاہ کی بیٹی
سادگی سکھائی گئی مجھے

☆☆☆

کہا مجھ سے کسی نے قربانی پہ لکھو کتاب
میں نے فقط
حسین کا نام لکھ دیا

☆☆☆

میری پلکوں کا باغ
ہمیشہ تر و تازہ اس لیے رہتا ہے
کہ میں اکثر اسے ندامت کا پانی دیتی ہوں

اینلا طالب

غزل

ہم بھی کتنے پاگل تھے جو تجھ سے محبت کر بیٹھے
تیری دید کے پیاسے تھے جو تیری تمنا کر بیٹھے
تجھ کو پانا مشکل تھا تیرا ملنا ناممکن
تیری ایک جھلک کی خاطر جانے کیا کیا کر بیٹھے
تارے گن گن کر رات کئی دن بھی بہت بے چین رہے
خاموش محبت سہہ سہہ کر ہم اپنے لبوں کو سی بیٹھے
تو ہی بتا دے جان جاں تجھ کو کیوں کر اپنائیں
جان کی بازی لگا دی ہم نے سارے جتن ہم کر بیٹھے
فریدہ فری، یوسف زئی

تقدیر بنالوں اسے

وہ شخص جو دل سے نکلتا ہی نہیں
ظالم ایسا پتھر ہے جو پگھلتا ہی نہیں
کیے ہزار جتن بہت منایا اسے
دعاؤں میں نمازوں میں مانگا اسے
یہ دل ناداں ہے جو سنبھلتا ہی نہیں
کتنا معصوم کتنا نادان ہے پگلا
لاکھ بہلاؤ مگر بہلتا ہی نہیں
سنہرے خوابوں کی نگری میں رہتا ہے وہ
کاش اک بار مل جائے وہ پردہ نشیں
آنکھوں میں چھپالوں
دل میں بسالوں
تقدیر بنالوں اسے

شاعرہ: مسز نگہت غفار، کراچی

بنام پاکستان

چلو ہم مان لیتے ہیں تجھے ہم مان دیتے ہیں
چلو ہم ٹھان لیتے ہیں تجھے ہم جان دیتے ہیں
محبت کا تقاضہ ہے تو ہمیں سائباں دے
بدلے میں تجھے ہم لاشوں سے بھرے میدان دیتے ہیں
اے شاہین تیرے پرندوں میں ہے اس مٹی کی ملاوٹ
افسوس اڑنے کے لیے کوئی اور تجھے آسمان دیتے ہیں
میں محب وطن ہوں پر قلم زخمی ہے بہت
آہ! ادھوری محبت اور الفاظ سنسان دیتے ہیں
صد افسوس تیری وادیوں کی مٹی سے نگین
بنا کر تجھے ہم خود ذہن بدگمان دیتے ہیں
نگین افضل وڑائچ، گجرات

غزل

درد سینے میں ضم کرو
ابھی جگہ ہے تم اور ستم کرو

کہا ہے کس نے یہ تم سے
میری بربادی کا ماتم کرو

بڑھائے تھے تمہی نے فاصلے
تمہی یہ فاصلے کم کرو

جلے ہیں اشکوں کے دیے
لو چراغوں کی مدہم کرو

مجھے پکارنے سے پہلے تم ذرا
بیتے دنوں کا ماتم کرو

شب غم مختصر ہے آؤ
دل توڑنے کی رسم کرو

کیا تھا جو ساتھ نبھائے گا وعدہ
اک بار پھر میرے صنم کرو
فصیحہ آصف خان۔ ملتان

غزل

اپنی ذات کو رونا ضروری ہوگیا تھا
سچ کہوں میرا مرنا ضروری ہوگیا تھا

بولو کون سمیٹتا ہے اداسیاں دامن میں
میرا تو خاموش رہنا ضروری ہوگیا تھا

قیامت تو برپا ہو ہی سکتی تھی مگر
افسوس آنسو چھپانا ضروری ہوگیا تھا

دل کی بات چھوڑو یہاں تو اپنے
ذہن کو بھی سمجھانا ضروری ہوگیا تھا

بھوک میں محبت کون لیتا ہے مگر
اپنوں کو بھی آزمانا ضروری ہوگیا تھا
عائشہ نور عاشا، گجرات

دوشیزہ گلستان

ترتیب: ارم حمید

مہلت

ہم اپنی زندگی کی ہر نئی صبح دیکھنے کے لیے بھی اپنے رب کی مرضی کے محتاج ہیں بے شک وہ جسے چاہتا ہے مہلت دیتا ہے جینے کی اور توبہ کرنے کی۔

حدیث نبویؐ

رسول اکرمؐ نے فرمایا" کھانے کی موجودگی میں نماز نہیں ہوتی اور اس وقت جب قضائے حاجت ہو"(صحیح مسلم 560)

عیب جوئی

شیخ سعدیؒ اور ان کا بیٹا تہجد پڑھ رہے تھے۔
دعا کے بعد بیٹا بولا" بابا جان سب سو رہے ہیں اور ہم عبادت کر رہے ہیں۔"
شیخ سعدیؒ نے فرمایا
"اگر دوسروں کے عیبوں پر نظر رکھنی تھی تو بہتر تھا کہ تو بھی سویا رہتا۔"

غزالہ۔ بحرین

جمعۃ المبارک

اللہ نے مٹی پیدا کی ہفتہ کے دن
پہاڑ پیدا کیے اتوار کے دن
درخت پیدا کیے پیر کے دن
ناپسندیدہ چیزوں کو منگل کے دن
نور کو بدھ کے دن
جانوروں کو جمعرات کے دن
اور آدمؑ کو جمعہ کے دن عصر کے بعد

زہریلا پانی

آدھی رات کو گلی میں شور سن کر شوہر کی آنکھ کھلی۔ باہر نکل کر محلے والوں سے پوچھا کہ اتنا شور کیوں ہے؟
انہوں نے کہا .... خبردار رہنا محلے کے پانی میں زہر ہے۔
یہ سن کر شوہر واپس آیا تو بیوی نے پوچھا۔
سنیں باہر کیا ہوا ہے؟
شوہر: کچھ نہیں ہوا تم پانی پیو اور سو جاؤ۔

سلمٰی۔ بحرین

مزہ

کسی نے ہم سے پوچھ لیا کیسے ہو؟
ہم نے ہنس کے کہا
زندگی میں غم ہے
غم میں درد ہے
درد میں مزہ ہے
اور مزے میں ہم ہیں

محبت

ایک لڑکی مولوی صاحب کے پاس گئی اور پوچھا
لڑکی: اگر میں کسی لڑکے سے محبت کروں تو کیا گناہ ہوگا؟
مولوی: ارے توبہ کرو ورنہ سیدھی جہنم میں جاؤ گی۔
لڑکی: اور اگر مولوی صاحب آپ سے محبت کروں؟
مولوی: بہت شریر ہو جنت میں جانے کا ارادہ ہے۔

زینب جہاں۔ شیخوپورہ

شعر

فارغ نہ جانیے مجھے' مصروف جنگ ہوں
اس چپ سے جو کلام سے آگے نکل گئی

تماشہ

میں تماشہ ہوں مجھے دیکھ رہی ہے دنیا
آپ تو خالق ہیں مالک ہیں
مجھے ڈھانپ کیوں نہیں دیتے

مکافات

مجھے قدرت کے ایک عمل سے بہت پیار ہے
مکافات عمل!
سکون سا آ جاتا ہے۔ یہ لفظ سن کر کہ جو جیسا کرے گا.....
ویسا ہی پائے گا!

صادق شیخ۔ کشمور

غرور

اگر کبھی غرور کرنے لگو تو ایک چکر قبرستان کا لگا لیا کرو وہاں تم سے اچھے اچھے لوگ دفن ہیں۔

خاموشی

خاموشی عظیم نعمت ہے۔ بالخصوص اس مقام پر جہاں اختلاف زیادہ' آوازیں بلند' علم کی کمی اور دلیل کی کوئی اوقات نہ ہو۔
انسان کے لالچ کا پیالہ کبھی نہیں بھرتا کیونکہ اس میں ناشکری کے چھید ہوتے ہیں جو اس کو بھرنے نہیں دیتے۔

ناصرہ۔ ملتان

بھوکا کتّا

نفس وہ بھوکا کتا ہے جو انسان سے غلط کام کروانے کے لیے اس وقت تک بھونکتا رہتا ہے جب تک وہ غلط کام نہ کر لے اور جب انسان وہ غلط کام کر لیتا ہے تو یہ کتا سو جاتا ہے لیکن سونے سے پہلے ضمیر کو جگا دیتا ہے۔

ضیا شاہ۔ جہانیاں

ایمرجنسی

پیٹرول پمپ سے 21 کلومیٹر دور آرمی کے ٹرک کا پیٹرول ختم ہو گیا۔
فوجی ڈرائیور نے میجر کو بتایا سر پیٹرول پمپ تک دھکا لگانا پڑے گا سب نیچے اترے اور پمپ تک دھکا لگانا شروع کر دیا کافی دیر کی جدوجہد کے بعد پمپ پہنچ گئے کچھ جوان تھک کر بے ہوش ہو گئے۔
فوجی ڈرائیور نے پیٹرول بھروانا شروع کیا تو میجر نے کہا پیچھے ڈرم بھی فل کروا لو۔
ڈرائیور: سر وہ تو فل ہے ایمرجنسی کے لیے رکھا ہے۔" میجر بھی بے ہوش۔

کردار

اپنی باتوں کو پانی کے قطروں کی طرح شفاف رکھو کیونکہ جس طرح قطروں سے دریا بنتا ہے اسی طرح باتوں سے کردار بنتا ہے۔

خولہ عرفان کی ڈائری سے

بہت ویران ہوتا جا رہا ہوں
بہت سنسان ہوتا جا رہا ہوں
بلوچستان ہوتا جا رہا ہوں
تیری یادوں کی بمباری ہے ایسی
وزیرستان ہوتا جا رہا ہوں
برستی جا رہی ہے یوں نحوست
میں ہندوستان ہوتا جا رہا ہوں
مجھے ڈر ہے اپنوں کا غیروں سے زیادہ
میں پاکستان ہوتا جا رہا ہوں

سچائی

ایک شیخ نے اپنے مرید کو خرقہ خلافت عطا کیا اور اسے کسی بستی میں تبلیغ کے لیے بھیج دیا کچھ عرصے بعد شیخ کو اطلاع ملی کہ ان کا مرید بڑا کامیاب ہے سب لوگ اس سے خوش ہیں۔ شیخ نے اپنے مرید کو طلب کیا اور کہا کہ فوراً خرقہ خلافت واپس کردے۔ مرید نے شیخ سے ناراضگی کا سبب دریافت کیا۔ شیخ نے کہا سنا ہے کہ ”سب لوگ تجھ سے خوش ہیں۔“ مرید نے کہا رب کی مہربانی ہے“ شیخ نے غصے سے کہا کہ سب لوگوں کا تجھ سے خوش ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ تو نے سچ بولنا چھوڑ دیا ہے۔

سسرال

سنو لڑکیوں صرف روٹی گول کرنے سے کام نہیں بنتا سسرال میں رہنا ہے تو باتیں بھی گول گول کرنی آنی چاہئیں۔

2018 کا مطالعہ پاکستان کا پیپر

س1) فیض آباد دھرنے کے مقاصد بیان کریں۔

س2) خادم حسین رضوی کی مشہور گالیاں بتائیں۔

س3) پاکستان کے کس شہر میں گدھے کا گوشت شوق سے کھایا جاتا ہے۔

س4) گندے اور صاف میسج کی تعریف کریں۔ سب سے پہلا گندہ میسج کس نے کس کو کیا تھا......؟

س5) ”مجھے کیوں نکالا“ پاکستان کے کس سیاست دان کا تکیہ کلام ہے؟

س6) پاکستان کے گونگے صدر کا اعزاز کس کو حاصل ہے؟

ابا

ہمارے گھر کے پچھواڑے میں لگی پانی کی موٹر رات کو خراب ہوگئی تو ابا جی مجھے ساتھ لے کر ٹھیک کرنے گئے۔

مجھے ٹارچ پکڑائی اور لگے ایک بولٹ کو کھولنے بیسیوں بار ادھر ادھر ہاتھ مارنے سے بھی بولٹ نہ کھلا ان کا خفت اور غصے سے پارہ اونچا اور طبیعت مضمحل ہوتی جارہی تھی اچانک انہوں نے مجھ سے ٹارچ لیتے ہوئے پیچ کس پکڑاتے ہوئے کہا کہ تم کوشش کرو۔

میری ہلکی سی کوشش سے بولٹ کھل گیا۔ یہ بتانے والی بات نہیں، بتانے والی بات یہ ہے کہ ابا جی نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا“ بے غیرتا اب دیکھا ٹارچ کیسے پکڑتے ہیں۔“

بستر

سب نے ایک بات نوٹ کی ہے کہ سردیوں میں صبح 6 بجے سے 8.30 تک بستر کی کشش زمین کی کشش سے زیادہ ہوتی ہے۔

بے حسی

تاریخ کے حساس انسانوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ اداس رہ کر گزارا ہے۔ زندگی میں خوش رہنے کے لیے بہت زیادہ ہمت کی نہیں بلکہ بے حسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ حبیبہ عمر۔ لاہور

ثواب

5 ایسے طریقے ہیں جن سے مرنے کے بعد انسان ثواب حاصل کرسکتا ہے۔

☆......مسجد کی تعمیر میں حصہ

☆......مریض کو وہیل چیئر عطیہ کرنا

☆......درخت لگانا جس سے انسان جانور سب سایہ اور غذا حاصل کرسکیں۔

☆......پانی کا بندوبست کردینا یعنی کولر لگوا دینا۔

☆......اور قرآن مجید تحفے میں دینا...

سسرالیے

لڑکی پٹھان سے: تم میری امی کو بہت پسند آئے ہو۔

پٹھان (شرماتے ہوئے) پر ام شادی تمہی سے کرے گا خالہ کو بولو ہم کو بھول جائے۔

دو شعر

نگاہوں کے تصادم سے عجب تکرار کرتا ہے
یقین کامل نہیں لیکن گماں ہے پیار کرتا ہے

☆

مٹاؤ گے کہاں تک تم میری باتیں میری یادیں
میں ہر اک موڑ پر اپنی نشانی چھوڑ جاؤں گی

مہرین رشید۔ کراچی

جیسے کو تیسا

کل میرا دشمن بتا رہا تھا کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے......اور ہیرا ہیرے کو...... اتنے میں اس کو کسی کتے نے کاٹ لیا۔

محسن نقوی کہتے ہیں...

میں تیرے ملنے کو معجزہ کہہ رہا تھا لیکن
تیرے بچھڑنے کا سانحہ بھی کمال گذرا

☆

مجھے غم تھا کہ میں بکھر گیا محسن
وہ ریزہ ریزہ تھا مگر اپنے اختیار میں تھا

بابا جی کہتے ہیں...

جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو چھوٹے آدمیوں کے سائے بھی بڑے ہوجاتے ہیں۔

حنا شیرازی۔ لاہور

کامیابی

کامیابی عمل سے جڑی ہے
کامیاب لوگ حرکت میں رہتے ہیں
وہ غلطیاں کرتے ہیں لیکن میدان نہیں چھوڑتے۔

اور بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہوتی ہے۔

حلال رزق

امام زین العابدین فرماتے ہیں:
آخری زمانے میں جو چیز سب سے کم ملے گی وہ بھروسہ مند دوست اور حلال رزق ہوگا۔

سنہری باتیں

اگر اللہ نے وہ لے لیا جسے کھونے کا تم تصور نہیں کرسکتے تو وہ یقیناً کچھ ایسا دے گا جسے پانے کا تم نے کبھی سوچا نہ ہوگا۔ ایشال۔ لندن

نصیحت

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں:
جس پر نصیحت اثر نہ کرے وہ جان لے کہ اس کا دل ایمان سے خالی ہے۔

اے وطن

اے عالم وقت کوئی ایسا بھی فتویٰ دے دے
جو وطن سے وفا نہ کرے کافر ٹھہرے

شکی شوہر

رات کے آخری پہر بیوی کے موبائل پر بیپ ہوئی۔ شوہر نے نیند سے جاگ کر فون چیک کیا تو لکھا تھا "Beautiful" طیش میں آکر بیوی سے یہ کون ہے جو تمہیں بیوٹی فل کہہ رہا ہے؟
بیوی اس سے بھی زیادہ طیش میں آکر۔ سنو یہ "Beautiful" نہیں "Battery full" لکھا ہے۔

کامنی دیو۔ سکھر

لہجہ اور مسکراہٹ

”نرم لہجے“ سے ہمیشہ مضبوط اور دیرپا رشتے تخلیق پاتے ہیں جبکہ ”مسکراہٹ“ دل کی شگفتگی اور چہرے کی رونق ہے۔

فرحانہ۔ پنڈی

"املتاس"

'سچی کہانیاں' میں ایک نہایت ہی مقبول کامیاب ترین سلسلے وار ناول 'تاشون' کے بعد معروف اور مقبول کہانی کار شازیہ سعید مغل ایک نیا تہلکہ خیز سلسلے وار ناول لے کر آئی ہیں۔

'املتاس' سحر و اسرار کا ایک ایسا انوکھا سلسلہ' جو آپ نے آج تک نہیں پڑھا ہوگا' یہ ہمارا صرف دعویٰ ہی نہیں یقین بھی ہے......!

"املتاس"

اپنے پسندیدہ ماہنامے 'سچی کہانیاں' میں ملاحظہ فرمایئے۔

ڈی خان

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

کروڑوں دلوں کی دھڑکن خوبرو پاکستانی ہیرو فواد خان جلد بالی وڈ فلم خوبصورت پارٹ 2 میں اپنے مداحوں کو نظر آئیں گے اس کے علاوہ

بھارتی مصنف چیتن بھگت نے اپنے ناول 'نوکری' جس پر جلد فلم بننے والی ہے فواد کو لینے کے متمنی ہیں فواد کے مقابل عالیہ بھٹ ہوں گی۔ ویسے یہ بھارتی بھی بڑے سمجھدار اور جوہر شناس ہیں فواد خان' ماہرہ خان صبا قمر کی الگ جگہ اور وینا ملک اور میرا جی کی الگ جگہ رکھتے ہیں۔ یہ تو ہم لوگ ہیں جو سب کو سر پر بٹھا لیتے ہیں اور بعد میں سر دیواروں سے مارتے نظر آتے ہیں۔

جوتا دے ہی دیتے ہیں

بھارت بہت واویلا مچا رہا ہے کہ کلبھوشن جاسوس سے ملنے جب اس کی والدہ اور بیگم آئیں تو پاکستان نے اس کی بیگم کے جوتے اتروا لیے اور چپل پہنا دی اس بات کو لے کر بھارتی میڈیا اور ان کے سیاست دان خوب شور مچا رہے ہیں شاید وہ یہ بھول گئے ہیں کہ یہ کلبھوشن جاسوس ہے اُن کی بالی وڈ فلم بابی جاسوس نہیں کہ فلم ختم پیسہ ہضم' شکر کریں جوتے اتار کر چپل دی ورنہ تو جوتے ہی دینے چاہیے تھے لیکن ہم پاکستانی ہیں عورتوں کا لحاظ کرتے ہیں۔ لیکن اگر بھارت چاہتا ہے تو جوتا دے ہی دیتے ہیں' ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

شادی مبارک

دسمبر تو ہمیشہ سے شادیوں اور منگنیوں کا مہینہ رہا ہے اس دسمبر بھی کئی شوبز ستارے اپنے ٹھکانے

پر جا لگے۔ اداکارہ زرما اور علیز ے دونوں کی منگنی پچھلے دنوں خوب دھوم دھڑ کے سے انجام پائی اور اداکارہ سدرا بتول بھی پیا کو پیاری ہوگئیں' نور جہاں مرحومہ کی نواسی نتاشا کی بھی شادی ہوگئی یہ شادی دبئی میں انجام پائی۔ نتاشا خالد بزنس وومن ہیں شادی کے فنکشنز اور تمام دنوں کے لباس آنکھوں کو خیرہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ نتاشا خود بھی بہت حسین اور اسٹائلش خاتون ہیں مغربی اور مشرقی حسن کا منفرد امتزاج لگ رہی تھیں دلہن بن کر' تمام نئے جوڑوں کے لیے ہماری نیک تمنائیں......

شاباش ماریہ

مشہور پاکستانی اینکر ماریہ میمن نے بھی شادی کالڈو کھا ہی لیا اب یہ بات اور ہے کہ یہ لڈو ہے

بڑا بھاری بھرکم جی ہاں ماریہ نے CSS ٹاپر سے شادی کرکے اپنا حال اور مستقبل دونوں محفوظ اور شاندار بنالیے کرنٹ افیئرز کے پروگرام کرتے کرتے وہ سمجھ گئیں کہ سنہرا مستقبل CSS پاس شوہر ہی دے سکتا ہے پیسہ بھی اور اختیارات بھی کاش اتنی سمجھ ہر پاکستانی لڑکی میں ہو۔ شاباش ماریہ......

کیا خوب کہتے ہیں

بلاول بھٹو زرداری کہتے ہیں کہ کرپشن نے معیشت تباہ کردی' ادارے تباہ کردیۓ بالکل ٹھیک کہتے ہیں ابھی تو شروعات ہے جب آپ عملی سیاست میں واقعی میں قدم رکھیں گے تب آپ یہ بھی جان جائیں گے کہ کرپشن کا بادشاہ

کسے کہتے ہیں اور اس تباہی اور بربادی میں کس کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے کم ازکم اگر صوبہ سندھ اور کراچی کی بات کریں تو...... باتیں تو آپ اچھی کرتے ہیں مگر اتنے بھولے تو نہیں جتنے لگتے ہیں۔ ویسے بلاول آپ کو مشورہ ہے کہ ایک اردو کا اچھا اتالیق مقرر کیجیے تاکہ وہ آپ کی تقریروں کے ساتھ ساتھ آپ کے لب ولہجے اور آواز کے اُتار چڑھاؤ پر محنت کرے یقین کریں یہ اتنا ہی مشکل ہے جتنا کرپشن فری پاکستان بنانا۔

☆☆......☆☆

کچن کارنر

افشاں چوہدری

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

پوری

اجزاء:۔

میدہ	ایک کپ
آٹا	ایک کپ
تیل	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ضرورت

ترکیب:

سب کو گرم پانی سے گوندھ لیں' تیل لگا کر پیڑے بنالیں پھر بیل لیں اور فرائی کریں۔

چھولے

پوری رات بھگو کر صبح چھان لیں اور ابال لیں۔

اجزاء:۔

پیاز	2 عدد
پسا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
پانی	حسب ضرورت
نمک	حسب ضرورت
سفید زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مصالحہ	حسب ضرورت
املی کا رس	آدھا کپ
ٹماٹر	

ترکیب:

پیاز براؤن کرلیں پھر سارے مصالحے ڈال کر بھون لیں جب ٹماٹر گل جائیں تو چھولے ڈال کر املی کا رس شامل کرلیں اور پانی ڈال دیں۔ گرم گرم پوریوں کے ساتھ کھائیں۔

سوجی کا حلوہ

اجزاء:۔

سوجی	ایک پیالی
چینی	ایک کھانے کا چمچہ
دودھ	دو پیالی
لونگیں	چار عدد
الائچی	چار عدد
زردے کا رنگ	آدھا چمچہ
پانی	آدھی پیالی
تیل	دو کھانے کے چمچے
بادام	حسب ضرورت

ترکیب:

سوجی کو بھون لیں۔ انا [illegible] لیں تیل گرم کریں الائچی اور لونگ [illegible] ی' پانی اور

زردے کا رنگ شامل کر کے چند منٹ پکائیں ابال آنے پر دودھ اور سوجی ملائیں اور چمچہ چلاتے رہیں۔

لاہوری فش

اجزاء۔

مچھلی	ایک کلو
چاول کا پانی	ایک کھانے کا چمچہ
چاول کا آٹا	دو کھانے کے چمچے
بیسن	ایک کپ
بھنا ہوا سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
پسا ہوا گرم مصالحہ	ایک کھانے کا چمچہ
اجوائن	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
لیموں	چھ عدد
نمک	حسب ضرورت
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

دیگچی میں چاول کا پانی ہلدی اور دو لیموں کا رس ابال لیں اس میں مچھلی کے ٹکڑے ڈال کر دو منٹ بعد نکال لیں۔ پیالے میں بیسن اور تمام اجزاء مکس کرلیں اور مچھلی پر لگا کر ایک گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں پھر توے پر ہلکا سا تیل لگا کر مچھلی کو سینک لیں اور دس منٹ بعد ڈیپ فرائی کرلیں۔

انڈے کا حلوہ

اجزاء۔

انڈے	6عدد
کیوڑہ	ذرا سا
گھی	حسب ضرورت
الائچی	4عدد
چینی	تین کھانے کے چمچے

ترکیب:

انڈوں اور تیل کو مکس کرلیں اور چولہے پر چڑھا دیں 20 منٹ بعد چینی اور کیوڑہ ملا دیں اور چمچہ ہلاتے رہیں۔ حلوہ تیار ہونے پر پستے بادام اور چاندی کے ورق سے سجا کر پیش کریں۔ سردیوں کی خاص سوغات ہے۔

ویجی ٹیبل لیمن سوپ

اجزاء

گاجر	ایک کپ
شملہ مرچ	ایک کپ
ہری پیاز	ایک کپ
زیتون	آدھا کپ
لیموں کا رس	دو کھانے کا چمچ
کالی مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
جو کا آٹا	2 کھانے کا چمچ
زیتون کا تیل	ایک کھانے کا چمچ
یخنی	2 گلاس
کڑی پتہ	4عدد
نمک	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:

کسی دیگچی میں تیل ڈال کر گرم کریں، اس میں جو کا آٹا ڈال کر ایک منٹ تک بھونیں، پھر اس میں گاجر، شملہ مرچ ڈال کر ایک منٹ تک پکائیں اس میں چکن کی یخنی شامل کریں، ساتھ ہی لیموں کا رس، کالی مرچ اور نمک ڈالیں۔ پھر اس میں زیتون اور ہری پیاز شامل کردیں۔ سب چیزوں کو مکس کرکے پیالے میں نکال لیں۔ ڈائٹ ویجی ٹیبل لیمن سوپ تیار ہے۔ اس سوپ کو ڈائٹنگ کرنے والی خواتین استعمال کریں۔ شیف فرح کے مطابق اس سوپ کو ایک ہفتے لگاتار پینے سے دو کلو تک وزن کم کیا جاسکتا ہے، تاہم ساتھ میں ورزش بھی ضروری ہے۔

☆☆.....☆☆